ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

ندوۃ المصنفین کی دینی اور اجتماعی کتابیں

اسلام کا اقتصادی نظام

وقت کی ایک انقلاب انگیز کتاب، جس میں اسلام کے معاشی نظام کا جامع نقشہ پیش کیا گیا ہے، چوتھا ایڈیشن جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں۔

قیمت صہ، مجلد ہیجر

اسلام کا نظامِ مساجد

نظامِ مساجد کے تمام گوشوں پر دل پذیر بحث اور اس کی منفعتوں اور برکتوں کی تفصیل۔

قیمت ہیجر مجلد للعہ

اسلام کا نظامِ عفّت وعصمت

عفّت وعصمت اور اُن کے لوازم پر بصیرت افروز بحث اور نظامِ عفّت کی اسلامی خصوصیتوں کی دل پذیر تشریح، لائق مطالعہ کتاب، قیمت للعہ مجلد صہ۔

اسلام کا زرعی نظام

اسلام کے نظامِ زراعت پر ایک جامع کتاب، زمین کی تقسیم کے اصول اور خلافت راشدہ کے زمانے میں کاشتکاروں کے لئے جو سہولتیں فراہم کی گئی ہیں ان کی تفصیل

قیمت للعہ مجلد صہ

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی کی تحقیق پر معرکتہ الآرا کتاب جس میں انفرادی اور اجتماعی غلامی کے ایک ایک پہلو پر اسلام کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔

(قیمت تے مجلد للعہ)

قرآن اور تعمیرِ سیرت

ایک عظیم الشان اصلاحی کتاب

قرآن مجید کی تعلیم و تربیت کا انسانی سیرت کی تعمیر میں کیا دخل ہے اور اس کے ذریعہ سے اس سیرت و کردار کا کس طرح ظہور ہوتا ہے؟ یہ متبرک کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔

قیمت صہ مجلد تے

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق

علم الاخلاق پر مبسوط اور محققانہ کتاب، جس میں اصول اخلاق، فلسفہ اخلاق اور انواع اخلاق کی دل پذیر تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ جس سے اسلام کے مجموعہ اخلاق کی برتری دوسری ملتوں پر ثابت ہوتا ہے۔ نظر ثانی کیا ہوا تازہ ایڈیشن۔

قیمت ہیجر مجلد ہیعہ

ارشاداتِ نبوی کا لاثانی ذخیرہ

اردو زبان میں

ترجمان السنہ:۔ ہماری زبان میں ایسی جامع اور مستند کتاب آج تک وجود میں نہیں آئی تھی، اس میں حدیثوں کا عربی متن مع اعراب بھی ہے اور صاف وسلیس ترجمہ بھی، ساتھ ہی تشریحی اور تحقیقی نوٹ بھی ہیں۔ ترتیب میں کتاب التوحید کو پہلے رکھا گیا ہے اور پھر اسی مناسبت سے پوری کتاب کی ترتیب قائم کی گئی ہے، پہلی جلد کے شروع میں کئی سو صفحات کا ایک بصیرت افروز مقدمہ ہے۔

جلد اوّل قیمت عـہ مجلد عـہ، جلد دوم قیمت لعہ مجلد لعـہ

فہم قرآن قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں، کلام ربّانی کا قطعی منشا معلوم کرنے کے لئے آنحضرت کے ارشادات واقوال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟ یہ اس موضوع پر ایک بہترین تبلیغی اور اصلاحی کتاب ہے۔

قیمت ہیعہ مجلد ہیعہ

وحی الٰہی مسئلہ وحی کے تمام گوشوں کی دل پذیر تشریح، وحی کی حقیقت اور اس کی صداقت سمجھنے کے لئے لاجواب کتاب، نہایت نفیس۔ جدید ایڈیشن۔

قیمت تے مجلد للعہ

مینجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

بُرہان

جلد ۳۶   شمارہ ۱

جنوری ۱۹۵۶ء مطابق جمادی الاوّل ۱۳۷۵ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

ماہ دسمبر تقریباً ہر جگہ زیادہ سرگرمی و سرجوشی کا مہینہ ہوتا ہے اکثر کانفرنسیں۔ اہم جلسے کانووکیشن اسی مہینہ میں ہوتے ہیں۔ لیکن سال گذشتہ کا یہ مہینہ پورے ملک میں ایک خاص چہل پہل اور جوش و خروش کا تھا روس کے وزیر اعظم اور دوسرے روسی لیڈروں کے دورہ کے موقع پر شاہ سعود کا ورود ہند اگرچہ محض ایک اتفاق تھا لیکن اس اتفاق میں طرفگی اور حسن اس لئے پیدا ہو گیا کہ یہ دونوں شخصیتیں صرف کسی ملک کے فرمانروا کی نہیں بلکہ زندگی، فکر و عمل اور طریق بود و ماند کے دو مختلف نظاموں کے نمائندوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ایک نظام وہ ہے جس کے فکر و عمل کے تار و پود میں خدا اور مذہب کے تصور کی کہیں کوئی گنجایش نہیں ہے اس کے برعکس دوسرا نظام ہے جس کی اساس ہی خدا اور مذہب کی ضرورت کے اعتقاد پر ہے۔ ایک نظام میں اہمیت صرف مادی قدروں کی ہے۔ اس کی لغت میں روحانیت ایک لفظ بے معنی سے زیادہ نہیں۔ دوسرے کے نزدیک اہمیت جو کچھ ہے روحانی اور اخلاقی اقدار کی ہے، مادی قدروں کی اگر تھوڑی بہت کچھ وقعت ہے تو صرف اتنی کہ خوردن برائے زیستن ست نہ کہ زیستن برائے خوردن

ہندوستان کی حکومت چونکہ سیکولر ہے اور خارجہ پالیسی میں ناطرفدار ہے اس بنا پر وہ ہر ملک سے خواہ اس کا دستور و آئین اور مذہب و سیاست کچھ ہی ہو دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتی ہے کیونکہ ناطرفداری کے ساتھ دوستی اور غیر جانبداری کے ساتھ باہمی رواداری اور حقیقی ہمدردی و غمگساری صرف یہی دو چیزیں ہیں جو دنیا میں امن و امان کے قیام کی کفیل بن سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جس حکومت کا بھی فرمانروا آتے۔ وہ خواہ پاکستان کا گورنر جنرل ہو یا مصر کا وزیر اعظم نیشنلسٹ چائنا کا وزیر اعظم ہو یا مارشل ٹیٹو۔ ہر ایک کا خاطر خواہ احترام و استقبال کیا جاتا ہے اور مہماننداری کے لوازم و شرائط پوری فراخ دلی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ روس

کے لیڈروں اور شاہ سعود کی آمد پر بھی ایسا ہی ہوا۔

یوں تو عرب و ہند کے تجارتی۔ لسانی اور کلچرل تعلقات اسلام سے بھی بہت پہلے سے ہیں اور ان تعلقات کو مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں اور فروغ ہوا اور مزید استواری نصیب ہوئی لیکن دونوں ملکوں کے تعلقات کے علاوہ جہاں تک کہ خاص مسلمانوں کا تعلق ہے عرب ممالک میں خاص حجاز مقدس ان کی روحانی اور دینی ارادت کا مرکز ہے اس بنا پر مسلمانوں کے لئے شاہ سعود کی حیثیت صرف ایک والی اور آمر کی نہیں بلکہ پاسبانِ حرم اور خادمِ ارضِ قدس کی بھی ہے اور اس لئے مسلمانانِ ہند کے واسطے اس سے بڑھ کر خوشی کا اور کیا موقع ہو سکتا تھا کہ پاسبان و نگران حرمین شریفین کی ضیافت و مہمانداری کی جو سعادت ان کو خود مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں حاصل نہیں ہوئی وہ آج ملک کی خود اپنی سیکولر اور جمہوری حکومت کے عہد کے ابتدائی دور میں ہی ان کو حاصل ہو گئی اور وہ بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں۔

ہونے کو تو ہوتی ہے ہر اک شام سہانی   وہ آئے تو کچھ اور سلونی سی ہوئی شام

پھر بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ شاہ یہاں آئے اور کچھ دن رہے تو بالکل اس طرح جیسے کہ ایک مسلمان اور وہ بھی عرب۔ اور پھر وہ بھی حجاز مقدس کے والی کو ہونا چاہیے۔ فیاضی اور سیرچشمی۔ کشادہ دستی اور بلند نگاہی۔ اولو العزمی اور مردانگی یہ وہ اوصاف ہیں جو عربوں کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔ خوش خلقی اور خوش خوئی۔ انسانیت نوازی۔ محرمات سے اجتناب۔ اخلاقی بلندی۔ اوامر و نواہیِ شریعت کی پاسداری اور ان کا لحاظ یہ وہ امور ہیں جن کی رعایت ہر مسلمان کے لئے ضروری اور لازمی ہے۔ شاہ نے ہند کے دوران قیام و سیاحت میں بحیثیت عرب و مسلمان ان دو گونہ اوصاف و کمالات کا مظاہرہ پورے آب و تاب کے ساتھ کیا۔ داد و دہش کا یہ عالم کہ بلا امتیاز مذہب و ملت جدھر کو نکل گئے نقرہائے زر و سیم بکھیرتے چلے گئے۔ اوامر و نواہیِ شریعت کا یہ احترام کہ نہ کوکٹیل پارٹیز ہیں۔ نہ ڈانس نہ میوزک۔ نہ باجا اور نہ گانا نہ سرِ شب کا سیاحت عادیات کے جلوسے نہ تہذیب جدید کی ایمان سوز حرکات کا مظاہرہ۔ پھر حکومت ہند کی یہ ادا شناسی بھی بڑی

قابلِ داد اور لائق تحسین ہے کہ اس نے معزز مہمان کے ساتھ مذہبی و شرعی حدود و قیود کی پوری رعایت رکھی اور عظیم الشان استقبال و ضیافت کے پروگراموں میں کوئی ایسی چیز نہیں ہونے دی جو مہمانِ گرامی قدر کے لئے وجہ گرانی ہوتی۔ یہاں سے رخصت ہوتے وقت عالی جاہ میزبان و مہمان میں جو سلام و پیام کا تبادلہ ہوا ہے اس نے عرب و ہند کی محبت و دوستی پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے جو دونوں ملکوں کے مستقبل کے لئے بڑی ہی نیک اور اچھی فال ہے۔ زندہ باد عرب و ہند کی دوستی!

افسوس ہے مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری بھی جو علم و ادب کی صبح بہار کا ایک آخری جلوہ رہ گئے تھے۔ ہم سے بچھڑ گئے اور اس خاکدانِ آب و گل کو خیرآباد کہہ کر رہ گزائے عالمِ آخرت ہو گئے۔ مرحوم ہماری بزمِ علم و ثقافت کے دورِ پیشین کی یادگار تھے۔ ایک زمانہ میں اُن کے مضامین و مقالات کا بڑا چرچا تھا۔ باقاعدہ اور وسیع المطالعہ عالم تھے۔ ان کی تالیفات میں تاریخ الامت جو چھوٹی چھوٹی کئی جلدوں میں ہے اس کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ چند ادبی اور تنقیدی مضامین اور سوانحی تالیفات بھی ان کی یادگار ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اولین معاونوں اور بانیوں میں سے تھے اور آخر اسی کی خدمت کرتے کرتے جان جان آفریں کو سپرد کر دی۔ قرآن مجید کے ساتھ بڑا عشق اور شغف تھا اس کے وہ حافظ بھی تھے اور بڑی پابندی سے روز اس کی تلاوت کرتے تھے۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ راقم الحروف کو جب کبھی ان کے ہاں چائے پینے کا اتفاق ہوا ہے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ چائے کی تمام پیالیاں صحیح و سالم پائی ہوں۔ بڑے قناعت پسند۔ گوشہ نشین۔ شہرت سے نفور اور حد درجہ متواضع اور منکسر المزاج بزرگ تھے۔ جس سے جو وضع تھی بہر حال نباہتے تھے۔ حدیث کے بارہ میں ان کا جو مسلک تھا اس کے باوجود ہم ارباب ندوۃ المصنفین کے ساتھ ان کے تعلقات بڑے شگفتہ تھے اور وہ کبھی نجی ملاقاتوں میں اس طرح کی بحث نہیں اٹھاتے تھے۔ یہ وضع داری اور شرافت۔ یہ مروت اور خوش خلقی اب عنقا ہوتی جاتی ہے۔ اب آئندہ ایسے لوگ کہاں ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت فرمائے اور ان کو مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے سرفراز کرے۔ آمین۔

ہند کے محبوب وزیر اعظم نے گذشتہ مہینہ حیدرآباد میں اردو ہال کا افتتاح کرتے ہوئے اور پھر پارلیمنٹ میں حد بندی کمیشن کی رپورٹ پر تقریر کرتے ہوئے اردو کی نسبت جن زریں خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے اس پر اردو زبان کے ہر قدردان کو خوش ہونا اور موصوف کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ ایک وزیر اعظم کی آواز خود حکومت کی آواز ہے اور اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کے بارہ میں حکومت کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ رہی اس نقطۂ نظر کی عملی تشکیل تو اس میں شبہ نہیں کہ فضا جتنی سازگار آج ہے پہلے نہیں تھی اور جو بادل اب تک چھائے ہوئے تھے وہ رفتہ رفتہ چھٹ رہے ہیں۔ لیکن فضا میں جتنی سازگاری پیدا ہوتی جاتی ہے اردو والوں کے فرائض و واجبات اسی قدر زیادہ ہوتے جاتے ہیں اُردو کے مسئلہ کے حل کا اصل انحصار خود اہلِ اردو کی کوششوں اور ان کے عزم و ہمت پر ہے۔
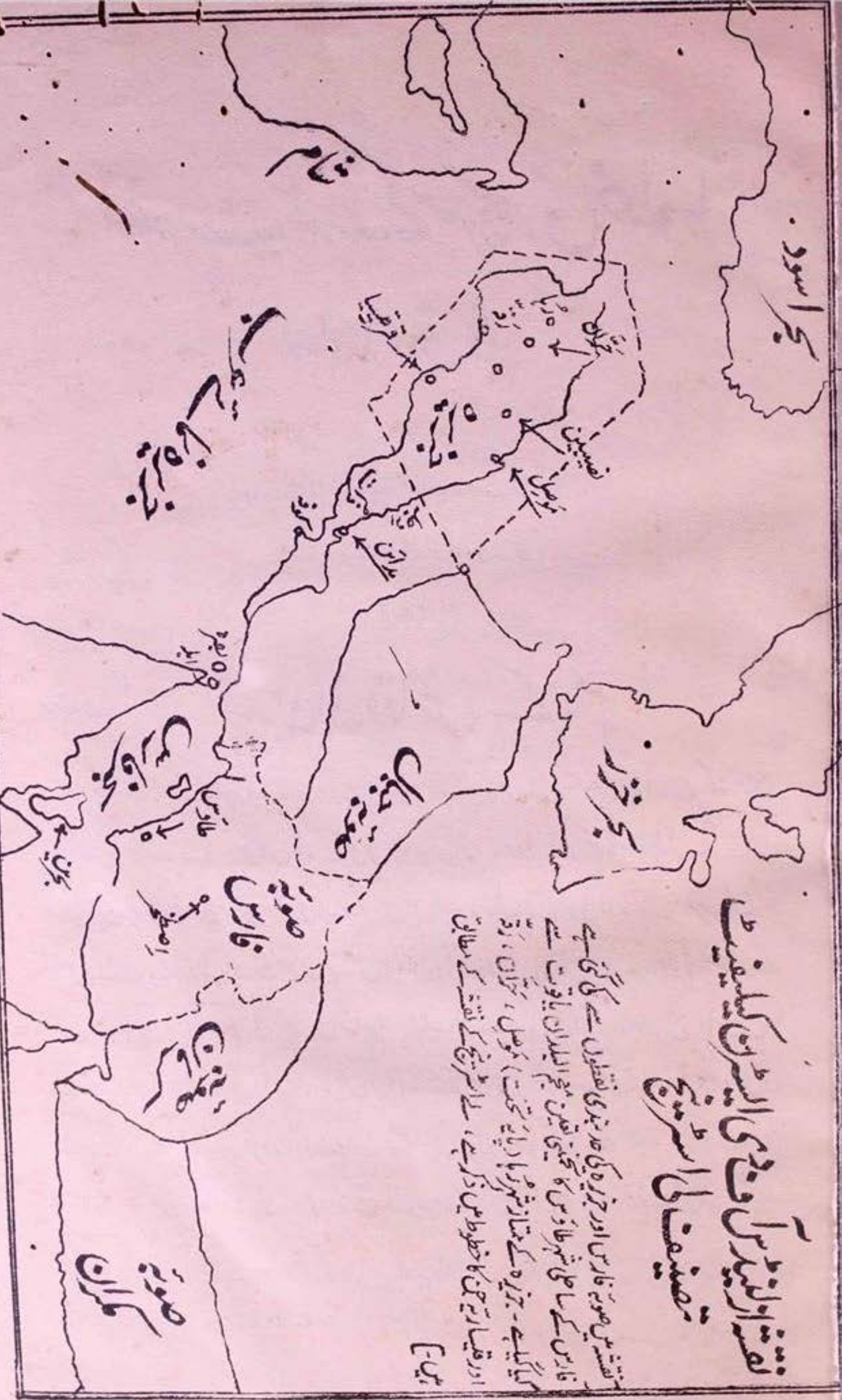
نقشہ از لینڈس آف دی ایسٹرن کیلیفیٹ
تصنیف لی اسٹرینج

نقشہ میں صوبۂ فارس اور جزیرہ کی حد بندی نقطوں سے کی گئی ہے فارس کے ساحلی شہر طاؤس کا تخمینی تعین معجم البلدان یاقوت سے کیا گیا ہے۔ جزیرہ کے ممتاز شہر رُہا (پایۂ تخت) موصل، حرّان، رقّہ اور قیسار یہ جن کا خطوط میں ذکر ہے، لے اسٹرینج کے نقشہ کے مطابق ہیں۔]

بحر اسود
بحر خزر
شام
جزیرہ نمائے عرب
صوبہ جبال
صوبہ فارس
صوبہ کرمان
صوبہ مکران
خلیج فارس
جزیرہ
نصیبین
موصل
حرّان
رہا
رقہ
قرقیسیا
مدائن
تکریت
کوفہ
بصرہ
ابلہ
طاؤس
اصطخر
بحرین

حضرت عمر کے سرکاری خطوط

۲- محاذ عراق وعجم

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق)

(استاذ ادبیات عربی - دہلی یونی ورسٹی)

(۷)

۶۲- سعد بن ابی وقاص کے نام

[سعد کو اپنے ہیڈ کوارٹر مدائن میں کوئی آٹھ ماہ قیام کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے شمال اور شمال مغرب سے دو فوجیں بڑے جوش و ولولہ کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے اٹھی ہیں، شمال میں ایرانی فوج مہران[1] رازی کی سرکردگی میں جلولاء میں جمع ہوئی اور شمال مغرب میں علاقہ موصل کے عرب قبائل اور رومیوں پر مشتمل انطاق کی کمان میں بمقام تکریت۔ جلولاء سواد کے شمال میں عراق و خراسان کی تجارتی شاہراہ پر ایک بڑے دریا کے کنارے واقع تھا، ایرانیوں کے عقب میں دریا تھا اور داہنے، بائیں اور سامنے انھوں نے ایک چوڑی خندق کھودی تھی، اس کے علاوہ خندق کی طرف آنے والے راستوں میں لوہے کے کانٹے بچھا دیے تھے، یزدجرد جلولاء میں فوجی انتظام مکمل کر کے خود عراق کے سرحدی شہر حلوان کو مع دفاتر کے منتقل ہو گیا۔

---

[1] مہران کے بارے میں اعثم نے اپنی فتوح (صـ٣) میں لکھا ہے کہ یہ آذربائی جان کا حاکم تھا اور یزدجرد نے اس کو اپنی لڑکی دے کر اس سے عربوں کے خلاف مدد حاصل کی تھی۔

جنگ ذوالقعدہ سنہ ١٦ھ میں مدائن پر قبضہ کے نو ماہ بعد ہوئی، ایرانی فوجیں اسی ہزار سے زیادہ تھیں اور عربوں کی تیس ہزار سے کم۔ بڑا سخت رن پڑا، مسلمانوں نے اسی بار ایرانیوں پر یورش کی، اور کئی مقابلوں میں بہت نقصان اٹھایا، بالآخر وہ کامیاب ہوئے اور ایرانی فوجیں حلوان کی طرف بھاگ گئیں، سعد نے مذکورہ بالا فوجی سرگرمیوں کی خبر مرکز کو دی تو یہ فرمان آیا۔]

"ہاشم بن عتبہ کی سرکردگی میں بارہ ہزار فوج جلولار کے محاذ پر بھیجو، اس فوج کے مقدمۃ الجیش کے لیڈر قعقاع بن عمرو ہوں، میمنہ، میسرہ اور قلب کی کمان سعر بن مالک، عمرو بن مالک، اور عمرو بن مرّہ جہنی کے ہاتھ میں ہو۔ انطاق کے مقابلہ کے لئے عبداللہ بن معتم کی قیادت میں ایک فوج بھیجو، اس کے مقدمۃ الجیش کے لیڈر ربعی بن افکل عنزی ہوں، میمنہ، میسرہ، ساق اور رسالوں کے سالار علی الترتیب حارث بن حسان ذہلی، فرات بن حیان عجلی، ہانی بن قیس، اور عرفجہ بن ہرثمہ ہوں[1]۔"

٦٣۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

[مذکورہ بالا فرمان کے بعد سعد کو حضرت عمر کا یہ خط ملا]

"اگر خدا کی مدد سے مہران اور انطاق کے لشکر شکست کھائیں تو مقدمۃ الجیش کے لیڈر قعقاع بن عمرو کو حکم دو کہ فارسیوں کا سرحد سواد تک تعاقب کریں، مگر اس سے آگے جبال کے علاقہ میں داخل نہ ہوں[2]۔"

اس حکم کے بموجب قعقاع نے عراق کے سرحدی شہر حلوان تک فارسیوں کا تعاقب کیا، یزدجرد، شکست کی خبر سن کر اپنے دفاتر کے ساتھ

---

[1] طبری ۴/ ۱۷۹ و ۱۸۶ [2] طبری ۴/ ۱۷۹ و ۱۸۲

حلوان میں کچھ فوج چھوڑ کر جبال (پہاڑی صوبہ) کے صدر مقام رے چلا گیا، قعقاع نے حلوان کے باہر وہاں کی فوج کو شکست دی اور شہر پر قابض ہو گئے۔

۶۴۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

[مذکورہ بالا خط تعاقب کے حق میں سیف بن عمر کی روایت پر مبنی ہے اس کے مقابلہ میں طبری نے ایک خط تعاقب کی مخالفت میں نقل کیا ہے جو محمد بن اسحاق کی روایت پر مبنی ہے، اس روایت کی رو سے جب حضرت عمر کو جلولاء کی فتح اور ایرانیوں کے فرار کی خبر موصول ہوئی تو انھوں نے سعد کو ذیل کا خط لکھا۔]

"فوجی پیش قدمی بند کر دو اور ایرانیوں کا تعاقب نہ کرو۔ مسلمانوں کے لئے ایک ہجرت گاہ اور بڑی چھاؤنی بناؤ مگر ایسا کرتے وقت اس بات کا لحاظ رہے کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی دریا حائل نہ ہو۔"[1]

۶۵۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

[جلولاء کی فتح کے بعد مسلمان فوج کے سپہ سالار ہاشم بن عتبہ، قعقاع کو فارسیوں کے تعاقب میں بھیج کر اور جلولاء میں کچھ حفاظتی فوج چھوڑ کر مدائن لوٹ آئے، اس اثناء میں ایک ایرانی فوج ہرمزان کے لڑکے کی قیادت میں صوبہ جبال سے سواد کے میدان میں بنرد آزمائی کے لئے اتری، اس کی خبر سعد نے مرکز کو دی تو یہ خط آیا۔]

"فارسیوں کے مقابلہ کے لئے ضرار بن خطاب کی کمان میں ایک فوج بھیجو، فوج کے مقدمہ کے لیڈر ابن ہذیل اسدی ہوں، میمنہ اور میسرہ کے سالار عبداللہ بن وہب راسبی، اور مضارب بن فلاں عجلی ہوں۔"[2]

---

[1] طبری ۴/ ۱۸۱ [2] طبری ۴/ ۱۸۷

۶۶- سعد بن ابی وقاص کے نام

[جلولاء کی فتح اور ہاشم کی مدائن واپسی کے بعد سعد کو خبر ملی کہ اہل جزیرہ نے ایک فوج تیار کی ہے جس کا ایک حصہ ہرقل کی مدد کے لئے حمص بھیجا ہے اور دوسرا مسلمانوں سے لڑنے کے لئے جانب ہیت۔ کمانڈران چیف نے مرکز کو اس کی اطلاع دی تو یہ فرمان آیا۔]

"اہل جزیرہ کی فوجوں کے مقابلہ کے لئے عمرو بن مالک عتبہ کی قیادت میں ہیت کی طرف ایک فوج بھیجو، اس فوج کے مقدمۃ الجیش کے لیڈر حارث بن زید عامری ہوں، میمنہ اور میسرہ کی کمان علی الترتیب ربعی بن عامر اور مالک بن حبیب کے ہاتھ میں ہو"[1]

۶۷- سواد کے فاتحین کے نام

[مسلمانوں کی ایک چیدہ جماعت نے حضرت عمر سے صوافی کی تقسیم کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے ذیل کا خط بھیجا۔ صوافی اس اراضی کو کہتے تھے جو

(۱) کسریٰ یا شاہی خاندان کی ملک تھی۔

(۲) جس کی آمدنی شاہراہوں، ڈاک کے راستوں، پلوں کی مرمت اور آتش کدوں کے لئے وقف تھی۔

(۳) جس کے مالک بھاگ گئے تھے یا جنگ میں مارے گئے تھے۔

(۴) جس میں جنگلات تھے۔

(۵) جس میں تالاب اور چشمے تھے۔ صوافی سے چالیس لاکھ اور بقول بعض ستر لاکھ درہم سالانہ آمدنی ہوتی تھی[2]]

---

[1] طبری ۴/۱۸۷ [2] کتاب الخراج ص۳۵ و فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۲۸۰ - ۲۸۲

"صوافی کو پانچ حصوں میں تقسیم کرو۔ چار حصے لشکر کو جس نے سواد فتح کیا ہے دے دیئے جائیں اور پانچواں حصہ یعنی خُمس کی آمدنی اس کی مقررہ مدوں میں صرف کرنے کے لئے میرے پاس بھیج دی جائے۔ اگر فاتحین خود صوافی میں آباد ہو کر اپنے اپنے حصہ کی کاشت اور نگرانی کرنا چاہیں تو ان کو اس کا بھی حق ہے[1]۔"

۶۸۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

[فتح جلولار کے بعد کمانڈر ان چیف نے مدائن سے جلولار تک مفتوحہ علاقہ کی آبادی کا شمار کرایا تو ایک لاکھ اور کچھ اوپر تیس ہزار تعداد آئی، جو تیس ہزار سے کچھ اوپر خاندانوں پر مشتمل تھی، سعد نے حضرت عمر سے دریافت کیا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے تو یہ فرمان آیا۔]

"کاشتکاروں کو ان کے سابقہ حال میں رہنے دو، ان میں جو لوگ تم سے لڑے ہوں یا بھاگ کر دشمن سے مل گئے ہوں، اور ان کو تم نے پکڑ لیا ہو تو ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو سواد کے دوسرے کاشتکاروں کے ساتھ تم کر آئے ہو۔ واذا کتبت الیک فی قوم فاجروا امثالھم مجراھم[2] (؟)

۶۹۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

[مذکورہ بالا خط پاکر سعد نے مرکز سے ان لوگوں کے بارے میں ہدایت طلب کی جو زراعت پیشہ نہ تھے تو یہ فرمان آیا۔]

"غیر زراعت پیشہ لوگوں کو اگر تم نے آپس میں تقسیم نہ کیا ہو تو ان

---

[1] طبری ۴/۱۸۴ [2] طبری ۴/۱۸۳

کے ساتھ معاملہ کی دو صورتیں ہیں :-

(۱) جو لوگ تمہارے ساتھ لڑے ہوں اور اپنی اراضی چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں، ان کی اراضی کے مالک مسلمان ہیں۔ اگر تم نے ان کو واپس آنے کی دعوت دی ہو اور جزیہ قبول کرلیا ہو اور ان کی اراضی تقسیم کرنے سے پہلے لوٹا دی ہو تو وہ ذمی ہو کر رہیں گے۔

(۲) اور اگر تم نے واپس آنے کی دعوت نہ دی ہو تو ان کی اراضی کے مالک فاتحین ہوں گے"[۱]

۷۰۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

[جلولاء، حلوان، تکریت کی فتح کے بعد مدائن سے ایک وفد مرکز آیا، حضرت عمرؓ نے ان کے چہرے بے رونق اور جسم دُبلے دیکھ کر سبب دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ عراق کی آب و ہوا ہمیں راس نہیں آئی، حضرت عمرؓ نے مزید تحقیق کے لئے اس باب میں سعد کو خط لکھا تو انھوں نے بھی وفد کے قول کی تائید کی، تب حضرت عمرؓ نے یہ فرمان بھیجا۔]

"عربوں کو وہی جگہ راس آتی ہے جو ان کے اونٹوں کو موافق آتی ہے سلمانؓ اور حذیفہؓ کو ایک صحت بخش جگہ تلاش کرنے پر مامور کرو، وہ ایسا مقام منتخب کریں جو دریا سے قریب ہو مگر کوئی دریا یا پل میرے اور تمہارے درمیان حائل نہ ہو"[۲]

۷۱۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

[مذکورہ بالا فرمان کے تحت ۱۷ھ میں کوفہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ کوفہ کی جائے وقوع ایک

[۱] طبری ۴/۱۸۳ [۲] طبری ۴/۱۸۹ و فتوح البلدان، مصر، ص۲۸۴

بڑا وسیع میدان تھا جس کی ایک سمت دریائے فُرات سے سیراب ہونے والے مزروعہ علاقہ میں داخل ہوتی تھی اور دوسری حجاز کے غیر مزروعہ علاقہ سے متصل تھی، اس میدان کے وسط میں سب سے پہلے مسجد کی داغ بیل ڈالی گئی، مسجد کے صحن کے سامنے گورنر کی رہائش گاہ، دفاتر اور بیت المال بنائے گئے۔ کچھ عرصہ بعد بیت المال میں نقب لگا اور بہت سا روپیہ نکل گیا، اس کی خبر مرکز کو ہوئی تو یہ خط آیا۔]

"مسجد ہٹا کر دارالامارہ (گورنر کی رہائش گاہ) کے پاس بناؤ، اور دارالامارہ کو مسجد کے قبلہ کی طرف رکھو۔ مسجد دن رات آباد رہتی ہے اور نمازیوں سے بیت المال کی حفاظت رہے گی۔"[1]

۷۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

[مرکز کے زیر ہدایت سعد نے مسجد، دارالامارہ کے برابر منتقل کرادی، دارالامارہ کی عمارت سادہ اور کچی تھی، ایک فارسی رئیس نے اپنی زیر نگرانی اس کو چونے سے بنوایا، پتھر کے ستون لگائے، اور اس میں محل کی سی شان پیدا کردی، عمارت کے باہر ایک پھاٹک بھی لگایا گیا۔

دارالامارہ اور مسجد کے اردگرد بازار تھا اور وہاں اس قدر شور ہوتا کہ سعد اور سرکاری عملہ کے لئے کام کرنا مشکل ہو جاتا، لوگوں نے یہ بات مشہور کردی کہ سعد نے ٹھیکہ دار سے کہا تھا کہ ایسی عمارت بناؤ کہ شور و غوغا کی آواز مجھ تک نہ پہنچے۔ حضرت عمر کو خبر پہنچی کہ سعد نے اپنے لئے محل بنوایا ہے اور عوام کی روک کے لئے اس میں ایک پھاٹک لگوایا ہے۔ یہ بات ان کو سخت ناگوار ہوئی، انھوں نے اپنے معتمد محمد بن مسلمہ کو مذکورہ ذیل خط دیا اور کہا کہ کوفہ پہنچتے ہی سعد کے محل کا پھاٹک جلا دینا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔]

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ایک محل بنوایا ہے جس میں عوام الناس

---

[1] طبری ۴/۱۹۲

سے الگ تھلگ ہو کر رہنے لگے ہو اور اس کا نام قصر سعد ہے اور تم نے اپنے اور پبلک کے درمیان ایک پھاٹک بھی لگوایا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ تمہارا محل نہیں بلکہ کور دماغی کا محل ہے۔ اس محل کے صرف ایک حصہ میں بود وباش رکھو، اور یہ حصہ بیت المال سے متصل ہو، باقی عمارت بند کر دو۔ محل میں کوئی پھاٹک نہ لگواؤ، جس سے لوگوں کو اندر آنے اور اپنے مسائل تمہارے سامنے پیش کرنے میں رکاوٹ ہو[1]"

۲۔ عثمان بن حنیف کے نام

[عثمان بن حنیف کو حضرت عمر نے فرات سے سیراب ہونے والے علاقہ کی پیمائش اور لگان بندی کا منتظم مقرر کیا تھا، عراق کی بہت سی اراضی اور جائداد ایرانی سرکار کی ملک تھی، یہ اراضی اور جائداد اسلامی حکومت نے براہ راست اپنے تصرف میں لے لی، اس اراضی سے بقول بعض حضرت عمر نے کچھ لوگوں کو جنہوں نے غالباً فتح عراق میں کارہائے نمایاں کئے تھے، کچھ جائدادیں عطا کیں، ان میں سے ایک جریر تھے جن کے قبیلہ بجیلہ نے فتح عراق میں غیر معمولی قربانیاں کی تھیں، اور جنہوں نے خود قادسیہ اور بعد کی جنگوں میں سالار کی حیثیت سے مافوق العادت بہادری کے جوہر دکھاتے تھے۔ جریر نے حضرت عمر سے درخواست کی کہ مجھے سواد میں جائداد عنایت کیجئے۔ حضرت عمر نے ان کو یہ خط دے کر عثمان کے پاس بھیجا:-

"جریر (بن عبداللہ بجلی) کو سرکاری اراضی سے اتنی زمین دے دو جو ان کی گذر اوقات کے لئے کافی ہو۔ نہ اس سے کم نہ زیادہ۔"

اب تک چونکہ سرکاری زمین سے کسی کو جائداد نہیں دی گئی تھی اور اس کی حیثیت مسلمانوں کی اجتماعی ملک کی تھی، اس لئے عثمان کو جائداد دینے میں تامل ہوا اور وہ کھٹکے کہیں جریر جعلی خط نہ

---

[1] طبری ۴/۱۹۳

لے آتے ہوں، تحقیق حال کے لئے انھوں نے مرکز کو خط بھیجا جس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے لکھا:۔

"جائداد کے بارے میں جریرؓ کا قول ٹھیک ہے۔ میرے خط کے مطابق ان کو زمین دے دو۔ تم نے اچھا کیا کہ مجھ سے اس باب میں رجوع کرلیا"[1]

۴۳۔ حُذیفہ بن یمان کے نام

[حُذیفہ بن یمان دجلہ سے سیراب ہونے والے علاقہ کی پیمائش اور لگان بندی کے منتظم تھے، ان کا ہیڈ کوارٹر مدائن تھا۔ انھوں نے ایک یہودی عورت سے شادی کرلی، اس کی خبر حضرت عمرؓ کو ہوئی تو انھوں نے طلاق کا حکم لکھ بھیجا۔ حُذیفہ نے اس حکم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے عریضہ میں لکھا کہ میں نے ایک کتابی عورت سے شادی کی ہے اور میں اس وقت تک طلاق نہیں دوں گا جب تک آپ یہ نہ بتائیں گے کہ آپ نے کیوں منع کیا ہے اور کیا کتابی عورت سے نکاح جائز نہیں ہے؛ جواب میں حضرت عمرؓ نے لکھا:۔

"کتابی عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے لیکن میں مصلحۃً اس کا مخالف ہوں، وجہ یہ ہے کہ عجمی عورتیں دل فریب ہوتی ہیں، اگر تم نے ان سے شادی بیاہ کئے تو وہ عرب عورتوں پر چھا جائیں گی"[2]

ازالۃ الخفار (شاہ ولی اللہ، بریلی ۲/ ۱۰۲ و ۱۰۸) میں یہ خط اس طرح بیان ہوا ہے:۔

"میں سخت تاکید کرتا ہوں کہ میرا خط پاتے ہی اپنی یہودی بیوی کو طلاق دے دو۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہاری پیروی میں دوسرے مسلمان ذمی عورتوں کے حسن سے متاثر ہو کر ان سے شادی بیاہ کرنے لگیں گے اور یہ مسلمان عورتوں کے لئے بڑی آزمائش ہوگی"

---

[1] طبری ۴/ ۱۴۸ [2] طبری ۴/ ۱۴۷

۴۷۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

[ذیل کے خط کی شانِ نزول بقول سیف بن عمر (طبری ۴/۱۹۵) یہ ہے کہ شام کی فتح اور قیصرِ روم کے شام سے خروج کے بعد ابو عُبیدہ اپنے ہیڈ کوارٹر حمص میں مقیم تھے اور خالد بن ولید شمال میں شامی و رومی سرحد کے شہروں پر حملے کر رہے تھے کہ جزیرہ کے عیسائیوں کو اندیشہ ہوا کہ اب ہماری باری آنے والی ہے انھوں نے رومی قیصر سے خط و کتابت کی اور باہمی تعاون اور مسلمانوں پر حملہ کا معاہدہ کیا۔ پھر ایک بڑی فوج نے جو رومیوں اور اہلِ جزیرہ پر مشتمل تھی، حمص پر چڑھائی کی اس کے کئی ڈویژن دوسری اسلامی چھاؤنیوں (اَجناد) کی طرف بھیجے گئے تاکہ انھیں ابو عبیدہ کی مدد کو آنے سے روک لیں۔ ابو عبیدہ نے خالد کو شمال کی مہم سے کئی اور دوسرے فوجی سالاروں کو جو آسکے حمص بلا لیا، پھر بھی ان کی فوج اتنی ناکافی تھی کہ وہ دشمن کا وثوق سے مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ دشمن نے وہ سارے راستے روک لیے تھے جن سے مسلمان فوجیں اپنے اپنے اڈوں سے حمص آسکتی تھیں۔ ابو عبیدہ غنیم کے سامنے کھلے میدان میں نہ آسکے اور مجبوراً حمص کے قلعہ میں پناہ گیر ہوئے اور ارجنٹ خط کے ذریعہ مرکز کو صورتِ حال سے مطلع کیا اور کمک طلب کی۔ حضرت عمر نے سعد بن ابی وقاص کو جو کوفہ میں بس چکے تھے یہ خط لکھا :۔

”کوفہ کے مسلمانوں کو جنگ کے لئے فوراً تیار کرو اور جس دن یہ خط موصول ہو اسی دن ایک فوج قعقاع بن عمرو کی سرکردگی میں حمص بھیجو، وہاں ابو عبیدہ کا محاصرہ کر لیا گیا ہے۔ فوج کو تاکید کرو کہ جتنی جلد ممکن ہو حمص پہنچیں“

سیف بن عمر کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے سعد کو یہ ہدایات بھی بھیجیں :۔

”سہل بن عدی کی سرکردگی میں ایک فوج جزیرہ کے شہر رقّہ کی طرف بھیجو، جزیرہ کے لوگوں نے ہی رومیوں کو حمص پر حملہ کے لئے ابھارا ہے اور ان سے پہلے قرقیسیار کے لوگ یہی حرکت کر چکے ہیں۔ دوسری فوج عبداللہ بن عتبان کی معیت

میں جزیرہ کے شہر نصیبین کو روانہ کرو، جنہوں نے اہل قرقیسیا کی طرح رومیوں کو حملہ کے لئے اکسایا ہے۔ جب یہ دونوں سالار رقہ اور نصیبین سے فارغ ہو جائیں تو حران اور جزیرہ کے پایۂ تخت رُہا کا قصد کریں۔ ایک تیسری فوج ولید بن عقبہ کی کمان میں جزیرہ کے عرب قبیلوں، ربیعۃ اور تنوخ کی جانب روانہ کرو اور چوتھی فوج عیاض بن غنم کو دو، جو جزیرہ کا رُخ کریں، اگر جنگ ہو تو دوسرے تمام افسر اُن کے ماتحت ہوں گے اور اُن کی رائے سے کام کریں گے۔"[1]

---

[1] طبری ۴/ ۱۹۵

سوانح قاسمی

جلد دوم

حضرت قاسم العلوم والخیرات نور اللہ مرقدہٗ کی سوانح کی پہلی جلد اہل علم اور اہل ذوق حضرات کے حلقہ میں غیر معمولی طور پر مقبول ہوئی۔ یہ جلد اگرچہ کافی ضخیم تھی لیکن صرف چند مہینوں میں اس کا پہلا اڈیشن ختم ہو گیا۔

اہل شوق کو مژدہ ہو کہ رئیس التحریر حضرت مولانا گیلانی کے اس علمی اور عرفانی کارنامہ کی **دوسری جلد** بھی چھپ کر تیار ہو گئی ہے۔ جس میں حضرت نانوتویؒ کے علم و کمال، تبلیغی خدمات، باطنی فیوض، اُن کی تحریر و تقریر اور اُن کی حیاتِ مبارکہ کے زاہدانہ اور مجاہدانہ وظائف اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لئے اُن کے تجدیدی کارناموں کو مولانا گیلانی نے اپنے مخصوص انشائی کمالات، نکتہ سنجی، استخراج نتائج واقعات کی مفصل تنقیح و تحقیق کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ ساتھ ہی اس سوانح سے جو مجاہدانہ اور علمی و عملی زندگی سامنے آئی ہے اس میں موجودہ دور کے پیچیدہ مسائل کا حل بھی مضمر ہے۔ جس کی طرف حضرت مؤلف نے جگہ جگہ اشارے کئے ہیں۔ اس لئے سوانح کا یہ حصہ محض سوانح نہیں بلکہ امت کے لئے ایک درسِ حیات بھی ہے۔ اس دوسری جلد کی کتابت و طباعت، پہلی جلد سے بہتر ہے۔ آرٹ پیپر پر بلاک کے چھ عدد فوٹو شاملِ کتاب ہیں۔ جن سے وہ مناظر و مکانات آپ کے سامنے آجائیں گے جن سے حضرت نانوتویؒ کے کارناموں کا تعلق ہے۔ ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۵۲۰ علاوہ فوٹو و ٹائیٹل پیج **قیمت** چھ روپیہ۔ علاوہ محصول ڈاک جو تقریباً عہ ہوتا ہے۔

خریدار جلد سے جلد توجہ کریں ورنہ دوسرے اڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

پاکستانی خریدار:- قاری شریف احمد صاحب صدیقی، دھلی مسجد، آرام روڈ۔ پاکستان چوک کراچی ملا کو کتاب کی قیمت اور محصول ڈاک روانہ کرکے رسید دفتر دار العلوم میں بھیج دیں۔ ہندوستانی خریدار براہِ راست دفتر دار العلوم سے فرمائش کریں۔

محمد طیب غفرلہٗ مہتمم دار العلوم دیوبند

نوٹ:- مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے بھی سوانح قاسمی کے دونوں حصے مل سکتے ہیں۔

مقتلِ غوری

از

لیفٹننٹ کرنل جناب خواجہ عبدالرشید صاحب

(پی۔اے۔ایم۔سی، پی۔ایس۔سی)

سلطان معزالدین بہاء الدین محمد سام الملقب بشہاب الدین غوری کی شہادت سے متعلق ہماری معلومات کا دارومدار زیادہ تر طبقات ناصری اور تاریخ فرشتہ پر ہے۔ فرشتہ کا ماخذ بھی طبقات ہی ہے۔ ہمیں پہلی مرتبہ طبقات ہی سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان غوری کا مقامِ شہادت دمیک ہے۔ اگرچہ اس مقام کا تعین کسی بھی مورخ نے نہیں کیا۔ اس ضمن میں فرشتہ کی عبارت یہ ہے:۔

"چوں در خاطر ہمایوں ما غزائے کفار ترکستان مرکوز گشتہ است باید بہ مجرد وصول فرمان لشکراں حدود را جمع آوردہ، برکنار آب جیحوں نزول نماید و پل مہیا دارد، تا سپاہِ اسلام در وقت عبور آزار نکشند و چوں سلطان بتاریخ دوئم شعبان سال مذکور بکنار آب نیلاب رسید و در منزلیکہ برجھیک دیہ دھمیک ہوگا۔ کاتب نے غلطی سے ایسا لکھ دیا ہے) اشتہار داشت فرود آمد، قضارا دراں چندروز بیست نفر از کفار کھکراں کہ اکثر خویشان و اقربا و فرزندان ایشاں در جنگ سلطان شہاب الدین کشتہ شدہ بودند ہم عہد و ہم سوگند شدہ و کشتہ شدن رخود قرار دادن درباب کشتن سلطان شہاب الدین تدبیر ہا جستند"

یہ بیان کرنے کے بعد فرشتہ لکھتا ہے

"بتاریخ بیست و دوئم شہر شعبان مذکورہ سلطان شہاب الدین را بہ غزنین رسانیدہ خطیرہ کہ برائے دختر خود ساختہ بود دفن کردند"[1]

---

[1] تاریخ فرشتہ مطبوعہ نول کشور فارسی جلد اول ص ٦٠

صاحب طبقات ناصری کا بیان ہے۔

"دراں وقت جماعت متمرداں از کوکھران[1] و قبائل کوہ جود عصیان آوردہ بودند و سلطان دراں زمستان بہ ہندوستان آمد و آں طائفہ متمرداں را بدوزخ فرستاد۔۔۔ چوں مراجعت بہ غزنین کرد بدست فدائے ملاحدہ در منزل دمیک در شہور سنہ اثنین وستمائہ شہادت یافت و یکے از فضلائے آں وقت دریں معنی نظمی کردہ است تحریر افتاد تا در نظر بادشاہ مسلمان آید۔"

شہادت ملک بحر و بر معز الدین کز ابتدائی جہاں شرچو او نیامد یک

سوم ز غرہ شعبان بسال ششصد و دو فتاد در راہِ غزنین بمنزل دمیک[2]

اِن اقتباسات سے ہمیں چند معلومات بہم پہنچتی ہیں :۔

(۱) سلطان کی مراجعتِ غزنین کے وقت یہ حادثہ پیش آیا۔

(۲) سلطان کھوکھروں کو سر کرنے ہندوستان آیا ہوا تھا اور انھیں ٹھکانے لگا کر واپس جارہا تھا۔

(۳) کھوکھر زخم خوردہ تھے اور خون کے پیاسے۔

(۴) سلطان نے دریائے جیحوں پر پل بنانے کو کہا کہ سپاہ اسلام عبور کر سکے۔

(۵) سلطان دریائے نیلاب پر پہنچا تو بہ مقام دمیک اُسے شہید کر دیا گیا۔

(۶) سلطان کی شہادت کے بعد اس کی لاش کو غزنین لے جایا گیا۔

(۷) سلطان اپنی دختر کے تجویز کردہ خطیرہ میں مدفون ہوا۔

اور (۸) سلطان کی تاریخ شہادت شعبان مطابق ۶۰۲ ہجری ہے۔

ہمیں آج اِن امور کے متعلق کچھ مزید معلومات فراہم کرنا ہے جن کی تفصیل کتبِ تواریخ میں نہیں ملتی۔ سب سے پہلے ہم اس طرف رجوع کریں گے کہ سلطان شہید کا اصل قاتل کون تھا۔

---

[1] کھوکھران، کوکران، کوکھران، درحقیقت لفظ کھوکھر کی مختلف شکلیں ہیں۔

[2] طبقات ناصری بسعی ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ص ۳۹ / ۴۰

قاتل سلطان شہید طبقات ناصری کی تحریر سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قاتل کھوکھر تھا، مگر فرشتہ نے یہی لفظ کچھ اس انداز میں لکھ دیا ہے کہ بعد کے مورخین کو اس لفظ سے گکھڑ کا اشتباہ ہو گیا ہے، وہ صاف طور پر کھوکھر نہیں لکھتا۔ بلکہ کہکر لکھتا ہے اور یہ لفظ وہ متواتر محمود غزنوی کی مہموں سے ایسا ہی لکھتا چلا آتا ہے۔ چنانچہ لین پول وغیرہ نے بھی ایسا ہی تصور کر لیا ہے کہ سلطان شہید کا قاتل گکھڑ تھا[1]۔ ظاہر ہے کہ اس کا ماخذ فرشتہ ہی ہوگا۔ کہ طبقات ناصری سے یہ بات مترشح نہیں ہوتی۔ بد قسمتی سے ہماری کتب تواریخ میں مقاموں اور شخصیتوں کے ناموں میں بڑا ہی تفاوت پایا جاتا ہے۔ اور اس پر کاتبوں کی ستم ظریفی دیکھئے کہ الفاظ کو الٹا سیدھا لکھ کر کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ بہر حال سلطان شہید کا قاتل گکھڑ نہیں تھا بلکہ کھوکھر ہی تھا۔ اس امر کی وضاحت اب ہم دوسرے نقطۂ نظر سے پیش کرتے ہیں۔ تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ جب سلطان شہید کے بڑے بھائی غیاث الدین محمد نے وفات پائی تو اس نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی مصیبتوں کا سامنا کیا۔ سب سے پہلے وسط ایشیا کی بغاوت کا معاملہ تھا۔ جہاں اسے خوارزم شاہ علاؤالدین محمد کے ہاتھوں شکست کھانا پڑی۔ اس شکست سے اس کے وقار کو ہندوستان میں بڑا صدمہ پہنچا۔

چنانچہ ہندوستان میں جگہ جگہ بغاوتیں پھیلنا شروع ہو گئیں۔ خاص طور پر پنجاب میں کھوکھروں کی بغاوت قابلِ ذکر ہے۔ اور سلطان شہید انہی کھوکھروں کو سبق سکھانے کی غرض سے ہندوستان چلا آیا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب وہ انھیں سبق سکھا کر واپس جا رہا تھا تو کسی کھوکھر نے اس پر حملہ کر کے اس کو مقام دمیک کے قریب شہید کر دیا۔ یہ واقعہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ سلطان شہید کا قاتل کھوکھر تھا نہ کہ گکھڑ[2]۔

---

[1] ملاحظہ ہو لین پول سلاطین اسلام (بزبان انگریزی) ص ۲۹۴ [2] فرشتہ نے اسی لفظ "کہکر" سے ایک اور غلط فہمی بھی پیدا کر دی ہے اور وہ محمود غزنوی کی ایک مہم کے بارے میں ہے۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ "کہکر" سلطان محمود کے خلاف جے پال کی طرف سے لڑے۔ بعد کے مورخین نے اس لفظ کو گکھڑ پڑھ لیا ہے، علاوہ جو تعداد ان کی بتائی جاتی ہے اس وقت اس سے گکھڑوں کی موجودہ آبادی دس گنا کم ہے۔ حالانکہ اسے بہت زیادہ ہونا چاہیئے تھا۔ بہر حال اُس زمانے میں بھی سلطان محمود کے خلاف کھوکھر ہی لڑے نہ کہ گکھڑ۔

(بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

ایک بات اور جو اس ضمن میں ہماری نگاہ میں کھٹکتی ہے یہ ہے کہ طبقات اور فرشتہ دونوں قاتل کو ملاحدہ اور کافر بتلا رہے ہیں۔ یہ کھوکھر ہی ہو سکتے ہیں کیوں کہ گکھڑوں نے سلطان محمود کے عہد ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ لہذا قاتل کا گکھڑ ہونا قرین قیاس نہیں۔ کھوکھروں نے بہت بعد میں اسلام کا مذہب قبول کیا۔ اس بات کی تصدیق یوں بھی ہو جاتی ہے کہ طبقات ناصری کا مصنف ان قبائل کا علاقہ کوہ جود بتلاتا ہے۔ یہ کوہ جود آج بھی ضلع جہلم کے وسط میں موجود ہے اور یہ راجپوتوں کا خاص علاقہ ہے، کھوکھر، جنجوعہ اور اعوان اسی علاقہ سے منسوب ہیں۔ اعوان اگرچہ اپنے کو یونانی الاصل بتلاتے ہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ وہ بھی راجپوتوں ہی کی ایک شاخ ہیں۔ بہر حال گکھڑ اس علاقے سے منسوب نہیں ہیں۔ گکھڑوں کا علاقہ شمالی پہاڑی سلسلہ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے جو آج کل شاہراہ سوری کے دائیں جانب راولپنڈی کے ضلع تک پھیلا ہوا ہے۔ اور پھر ضلع جہلم میں گکھڑوں کی آبادی ہمیشہ کم رہی ہے ان کی اکثریت ضلع راولپنڈی ہی میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ملاحظہ ہو مصنف مضمون ہذا کا مقالہ بہ عنوان THECAMPAIGNOFHUND مطبوعہ ملٹری ڈائجسٹ بابت اپریل ۱۹۵۵ء

[۱] گیگو ہر نامہ فارسی۔ ملاحدہ کے لفظ کے ساتھ طبقات ناصری نے فدائی کا لفظ جڑ دیا ہے، جس سے بعض لوگوں کو یہ اشتباہ ہوا ہے کہ قاتل کرامتی تھا یا حسن بن صباح کا پیرو! ہم اس خیال سے متفق نہیں۔ کیونکہ کرامتی ملتان کے گرد و نواح میں مرکوز تھے، اور سلطان محمود غزنوی نے ان کرامتیوں کا قلع قمع کر دیا تھا۔ غوری کے وقت ان کی طاقت مٹ چکی تھی، اور ان کا اتنا اثر نہ تھا کہ بغاوت پھیلا سکتے۔ حسن بن صباح کے پیرو بہت قلیل تعداد میں تھے اور ان کا وجود پنجاب میں کبھی بھی ثابت نہیں ہوا۔ البتہ چترال اور کافرستان کی پہاڑیوں میں یہ ضرور جا گزیں ہوئے اور آج تک وہاں موجود ہیں۔ ان لوگوں کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ پہاڑی علاقوں ہی میں رہتے تھے، کبھی کھلے بندوں میدانوں میں نہیں اترتے تھے، ایران میں بھی ان کا مرکز یا تو کوہ الموت میں رہا ہے یا کردستان کی پہاڑیوں میں یہ اکے دکے رہے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں یہ کوہ ارارط کے گرد و نواح میں بھی جمع ہو گئے تھے، اس لئے فدائی ملاحدہ کو فدائین اور کرامتی سمجھنا درست نہیں۔ البتہ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی اور وہ کوہ جود کا وقوع ہے۔ اسلامی روایات کے مطابق کوہ جودی طوفان نوح کے قصے کے ساتھ منسوب ہے اور یہ کوہ ارارات کے سلسلے کی ایک پہاڑی ہے، اس کا ہم نام ضلع جہلم میں کیونکر آ گیا۔ یہ ایک معمہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو قاتل واقعی ارارات کے سلسلہ کوہستان سے آیا تھا اور کرامتی تھا، یا یہاں بھی ایک ایسا نام رکھ دیا گیا جیسا کہ اکثر ناموں میں تکرار پایا جاتا ہے۔

تھی اور اب بھی ہے۔ کھوکھر اس شاہراہ کے جنوب میں واقع ہیں جہاں کوہ جود بھی واقع ہے۔ لیکن کہیں کہیں یہ شاہراہ سوری کے جنوب میں بھی آگئے ہیں۔ اس طرف گکھڑوں کے فقط چند دیہات ہیں۔ ایک زمانہ میں گکھڑوں نے چناب کے علاقہ تک حکومت کی ہے، مگر ان کے دارالحکومت ضلع راولپنڈی کے قرب وجوار میں ہی رہے ہیں۔

قاتل کے تعین کے بعد اب دریاؤں کی تصدیق کا معاملہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس ضمن میں مورخین نے تین نام استعمال کئے ہیں، لیکن اس خاص واقعہ سے متعلق صرف دو نام آئے ہیں ایک دریائے جیحون اور دوسرا دریائے نیلاب۔ جو بات معمہ بن گئی ہے وہ یہ ہے کیا وجہ ہے کہ مورخین نے جہلم دریا کو اس نام سے یاد نہیں کیا؟ اور اسے جیحون اور نیلاب لکھ دیا ہے، ہماری دانست میں اصل واقعہ یوں ہے کہ جیحون، جہلم کا نام مسلمانوں نے سب سے پہلے رکھا۔ جب مسلمان اس طرف بڑھے تو دو دریا جو ان کو عبور کرنے پڑے وہ سندھ اور جہلم ہی تھے، ان دونوں کو انھوں نے مانوس ناموں سے پکارا یعنی جیحون اور جیحون۔ نیلاب بعض مورخین نے جہلم کے شفاف پانی کو دیکھ کر اس کا نام رکھ دیا۔ مختصر یہ کہ جیحون اور نیلاب، دریائے جہلم ہی کے دو اور نام ہیں۔ اور چونکہ فرشتہ پل کی تعمیر دریائے جیحون پر بتاتا ہی اس لئے یہ جہلم پر ہی بنا ہوگا۔

اب آخری بات جو ہمارے لئے لازمی معلوم ہوتی ہے وہ تعین مقام دمیک ہے تاکہ تحقیق میں تطبیق پیدا ہو جائے۔

ہمیں بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان مورخین نے جغرافیائی مقامات اور دیگر مقاموں کے ناموں میں بڑی بے احتیاطی برتی ہے۔ نہ صرف انھیں غلط لکھ دیا گیا ہے بلکہ ان کی جائے وقوع بھی بغیر تصدیق کے لکھ دی گئی ہے جس سے تاریخی واقعات اور حقایق میں بڑی پریشانی پیدا ہو گئی ہے۔ ایک محقق طالب علم کے لئے کسی طرح بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ حملہ آوروں

سے یہ پل پار کر کے سلطان شہید مقام دمیک پر پہنچا۔ لیکن یہاں پہنچنے کے لئے فرشتہ پھر لکھتا ہے کہ سلطان شہید کو آب نیلاب کے کنارے پہنچنا پڑا تاکہ اسے عبور کرے لہذا یہ امر بھی تصدیق ہو گیا کہ نیلاب اور جہلم ایک ہی دریا ہے اور اسے عبور کر کے سلطان شہید مقام دمیک پہنچتا ہے۔ چنانچہ مقام دمیک جہلم کے کنارے ہی ہونا چاہیئے۔ اب اس مقام کا محل وقوع اور ملاحظہ فرمایئے۔

کی نقل وحرکت کو بخوبی سمجھ سکے[1] - خیر یہ ایک علیحدہ موضوع ہے، اس وقت ہمیں صرف تعین مقام دمیک پر روشنی ڈالنا ہے اور ہم اسے بیان کرتے ہیں - ذیل کے نقشے کو اول بغور دیکھ لیا جائے تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو -
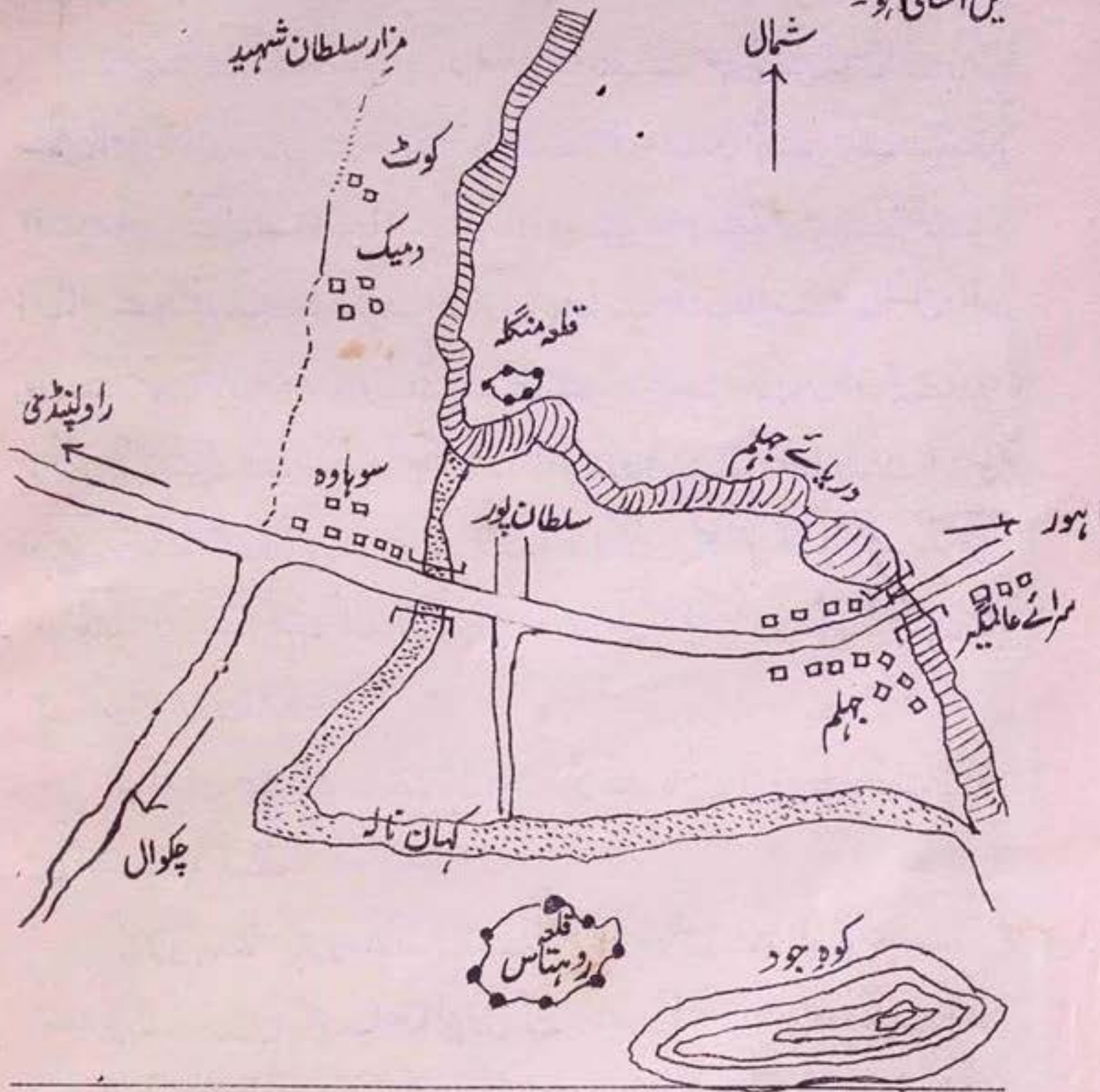
[1] اس موضوع پر ہمارا ایک تحقیقی مقالہ گذشتہ سال پاکستان تاریخی کانفرنس میں پڑھا گیا - جو کہ MILITARY DIGEST (ملٹری ڈائجسٹ) بابت اپریل ۱۹۵۶ء اور مد الاسلام " (انگریزی) کراچی نے اپنی وسط نومبر ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں نقل کیا ہے - اس مقالہ کا عنوان ہے THE CAMPAIGN OF HUND یہ محمود غزنوی کی ابتدائی مہموں سے متعلق ہے، اور اس میں چند ایک مقامات کا صحیح تعین کیا گیا ہے مثلاً لاہور، اور ہاطیبہ، اور مقامات کے غلط تعین یا ان کا غلط نام لکھے جانے سے جو مشکلات واقع ہو گئی ہیں اُن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے -

شہر جہلم سے راولپنڈی جاتے ہوئے تقریباً ۲۷ میل کے فاصلے پر چکوال کی طرف ایک نئی سڑک مقام سوہاوہ سے ایک میل آگے نکالی گئی ہے۔ یہ سڑک شاہراہ سوری سے جنوب کی طرف جاتی ہے اس مقام کے دوسری طرف یعنی شمال کی جانب ایک ٹوٹی ہوئی کچی سڑک ہے جسے اگر پگ ڈنڈی کہا جائے تو بہتر ہے۔ یہ راستہ نہایت دشوار گذار ہے اور صرف پیدل یا گھوڑوں پر چلنے کے قابل ہے۔ لیکن ایک اچھا جیپ گاڑی چلانے والا ادھر جیپ لے جا سکتا ہے۔ اس کچی سڑک پر کوئی چار میل کے فاصلے پر شاہراہ سوری سے دمیک کا مقام ہے۔ اس مقام سے دو فرلانگ کے فاصلے پر شمال مشرق کی طرف ایک اور چھوٹا سا گاؤں ہے جسے کوٹ کہتے ہیں۔

مقتل غوری کی وجہ تسمیہ: یہ موضع کوٹ کسی زمانے میں مقام دمیک ہی کا حصہ تھا۔ یہاں پر کھدائی کے وقت آج بھی پرانے آثار ملتے ہیں جن سے اینٹیں نکال کر گاؤں والے تازے مکان تعمیر کرتے رہتے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہاں پر ایک قلعہ ہوا کرتا تھا، مگر اب اس کا کوئی ظاہری نشان موجود نہیں۔ دمیک کے نام کی جو وجہ تسمیہ بتائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں ایک قوم زمانہ قدیم سے بستی ہے جس کا نام دھمیال ہے۔ اس قوم کے کچھ افراد اب بھی یہاں موجود ہیں۔ یہ راجپوت ہیں اور زراعت پیشہ ہیں۔ اس نسل میں ایک بادشاہ ہوا ہے جس کا نام راجہ دھمی بتایا جاتا ہے۔ یہ زمانہ تغلقوں کا بتایا جاتا ہے، موضع کوٹ بھی اس کی راجدھانی میں شامل تھا۔ اور ایک وقت میں یہ دونوں مقام ایک ہی نام سے منسوب تھے یعنی دھمی کوٹ، یہی لفظ بدلتے بدلتے دھمک مشہور ہوا، اور بعدہ دھمیک بن گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ راجہ دھمی محمود غزنوی کے زمانہ میں ہوا ہے۔ بہرحال ہم اس بات کی تصدیق نہیں کر سکتے کہ دھمی راجہ کون سے زمانہ میں تھا۔ یہ تمام مقامی روایات ہیں جو ہم نے بیان کر دی ہیں۔

اب اس مقام دھمیک (دمیک کو اب ہم آئندہ دھمیک ہی لکھیں گے) سے اگر کچھ اور شمال مشرق کی طرف بڑھا جائے تو تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ایک پُرخطر وادی سے ہوتے ہوئے ہم ایک میدان میں داخل ہوتے ہیں جس کے کنارے تین بیری کے درختوں کے تلے ایک

چبوترے پر ایک قبر کا نشان ہے۔ یہ راستہ صرف پیدل ہی عبور ہو سکتا ہے یا گھوڑے پر۔ یہ مقام جہاں یہ مزار واقع ہے یہاں سے دریائے جہلم دس میل کے فاصلے پر بہ سمت مشرق واقع ہے۔ اور تقریباً ڈھمیک سے بھی دریا کا اتنا ہی فاصلہ ہے۔ یہ مزار سلطان شہید کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔[1]

اگرچہ مورخین نے سلطان شہید کا مدفن غزنین قرار دیا ہے تاہم یہ مزار بھی توجہ کے قابل ہے ہمیں حال ہی میں یہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہاں پر ایک سفید ریش بزرگ جو اس قبر کی دیکھ بھال (فی سبیل اللہ کرتے ہیں) سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے ایک عجیب و غریب داستان سنائی۔ ان بزرگ کی عمر کوئی ساٹھ برس سے اوپر ہی ہو گی اور ایک مدت سے وہ اس مزار کی خبرگیری کر رہے ہیں۔ یہاں آمد و رفت بہت کم ہے، اس لئے کوئی مالی لالچ اس خدمت کا محرک نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے ہی یہ بتایا کہ یہ سلطان شہید کا مرقد ہے اور یہ انھوں نے اپنے دادا سے سن رکھا تھا۔ ایک روز کا واقعہ بیان کرتے لگے، کہ انھوں نے ایک خواب دیکھا۔ کہ جس طرح وہ قبر کے چبوترے کی مشرقی دیوار کے ساتھ کھڑے ہیں اور چبوترے کے اندر ایک دالان نمودار ہو گیا ہے جس میں متعدد دروازے ہیں، ایک دروازے سے ایک نوجوان سفید کپڑے پہنے ہوئے نکلتا ہے اور اس بزرگ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تم میری دیکھ بھال نہیں کرتے، تمہیں چاہئے کہ میری قبر کھود کر اسے درست کرو۔ اور جاتے جاتے ساتھ یہ بھی کہہ گیا کہ مجھے ایک مُرغ چاہیئے! چنانچہ اس سفید ریش بزرگ نے دوسرے ہی روز چبوترے کو کھودنا شروع کیا۔ قبر کا تعویذ معدوم ہو چکا تھا اور اصل نشان نہیں ملتا تھا، اور تمام چبوترہ قبر کی تلاش میں

---

[1] ہم اس مزار کو یہاں بیان نہ کرتے، مگر چند دلچسپ واقعات اس کی طرف منسوب ہیں جن کی تفصیل بتلانا یہاں مقصود ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت کا صرف تصدیق کے بعد ہی پتہ چل سکتا ہے مگر اس کا وقوع ڈھمیک کے قرب و جوار میں جہاں مقتل غوری ہے خالی از دلچسپی نہیں۔ ساتویں صدی ہجری میں دریا یقیناً یہاں سے بہت قریب ہو گا، ممکن ہے اس وقت فاصلہ دو چار ہی میل ہو۔

کھود ڈالنا پڑا۔ بڑی جستجو کے بعد قبر ملی اور قبر کے اندر سے ڈھانچے کی ہڈیاں نمودار ہوئیں، تمام بدن کی ہڈیاں موجود تھیں مگر سر غایب تھا! اس بزرگ نے ہڈیوں کو از سر نو شرعی تہذیب کے مطابق دفن کر دیا اور قبر پختہ کر کے اس پر لیپائی کر کے پرانی اینٹیں چن دیں۔ دوسرے روز ایک مرغ پکا کر ختم قرآن کر دا دیا۔ چبوترے کی بھی مرمت کی۔ اس وقت قبر پہ کوئی گنبد وغیرہ نہیں۔ صرف چبوترے پر تین بیری کے درخت ہیں۔ اور کچھ آثار موجود ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ مقبرہ ضرور ایک باغ کے ساتھ منسلک ہوگا۔ کہتے ہیں کہ سکھوں کے زمانے میں یہ منہدم ہوگیا۔ دلچسپ بات جو بیان کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ پیشتر کہ یہ بزرگ مجھ سے اپنا خواب بیان کرتے میں نے خود ان سے پوچھا کہ یہ قبر تو تازی بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ مٹی کا لیپ جو اس پر تھا وہ تازہ نظر آرہا ہے، انھوں نے فوراً کہا کہ یہ درست ہے اور میں نے ہی یہ قبر کھود کر از سر نو بنائی ہے! پھر اپنا خواب بیان کیا جو بالا میں درج کر دیا گیا ہے۔ یہ بزرگ یہاں کے نہ تو متولی ہیں اور نہ ہی مجاور ہیں۔ پاس ہی ایک گاؤں میں رہتے ہیں اور کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم نے چلتے وقت انھیں کچھ پیسے دینے چاہے یہ سمجھ کر کہ شاید یہ یہاں مجاوری کرتے ہیں مگر انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ہمارے لئے یہ ایک عجیب بات تھی جو غالباً زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھنے میں آئی۔

یہ واقعہ ہم نے اس لئے یہاں بیان کر دیا ہے کہ اول تو مورخین میں سے صرف ایک فرشتہ نے ہی یہ کہا کہ سلطان شہید کی لاش کو غزنین لے جا کر دفنایا گیا۔ دیگر مورخین اس بات پر روشنی نہیں ڈالتے کہ ان کا مدفن کہاں ہے، فرشتہ کا ماخذ طبقات ناصری ہے، مگر وہ اس بارے میں خاموش ہے۔ نہ معلوم یہ روایت فرشتہ کے ہاتھ کہاں سے لگ گئی۔ فرشتہ خود یقیناً ٹھیک نہیں آیا ورنہ اس کا کچھ نہ کچھ محلِ وقوع بیان کر دیا ہوتا، اور پھر ہمارے مورخین کی یہ ایک قدیم عادت چلی آتی ہے کہ دار الحکومت میں بیٹھ کر تواریخ لکھ جاتے ہیں بطور موقع پر جا کر تصدیق نہیں کرتے! دوسری وجہ اس واقعہ کے بیان کرنے کی یہ ہے کہ اس بزرگ کا خواب عجیب و غریب نوعیت کا ہے، اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ اس کا خواب خیال کا نتیجہ ہے، تو پھر بھی اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ

اس نے قبر کو کھود کر ہڈیوں کا ڈھانچہ نکالا اور دھڑ سے سر غائب دیکھا، جو اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ سلطان شہیدؒ کو قتل کیا گیا تو دشمن اس کا سر لے کر بھاگ گئے ہوں یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سر غزنین میں دفن کیا گیا ہو اور دھڑ یہاں۔ یہ تو رواج کے خلاف بات ہے۔ بہر حال دھڑ کا یہاں موجود ہونا اس طرف نگاہ کو منتقل کروا دیتا ہے کہ اغلب یہی ہے یہ سلطان شہید ہی کا دھڑ ہو اور انھیں کا مرقد ہو جو زمانے کے نامساعدت حالات کی وجہ سے منہدم ہو گیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اب اس مختصر سی داستان کے بعد آیئے ذرا دیکھیں کہ سلطان شہید نے پُل کون سی جگہ بنانے کا حکم دیا تھا۔ یہ امر واقعی ہے کہ پرانے زمانے کے حملہ آور جب کوہستان سرحد کو عبور کر کے پنجاب کے حدود میں داخل ہوتے تھے تو وہ پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چلے آتے تھے کہ قریب تر فاصلہ یہی تھا۔ شاہراہ سوری بہت بعد کی تعمیر ہے، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اوّل اوّل بابر بادشاہ نے قدیم راہ سے مختلف راستے اختیار کئے اول بار وہی شاہراہ سوری کے نشان کرتا آیا۔ بابر سے تمام حملہ آور اسی قدیم راہ سے آتے تھے جس پر سلطان شہید چلا تھا اصل راستہ کچھ یوں ہوا کرتا تھا۔ دریائے سندھ کو بمقام ہنڈ عبور کیا جاتا۔ اور اس کے کنارے کنارے چھچھ کے علاقہ میں دریائے سندھ کے جنوبی کنارے کے ساتھ ساتھ تربیلا پہنچتے اور وہاں سے قریب ہی ہری پور (ہزارہ) سے ہو کر ٹیکسلا پہنچتے۔ یہاں سے براہ گولڑہ اور نور پور سیدان (بری امام کا مقام) ہوتے ہوئے کوہ مری کے پہاڑوں کے دامن میں بجانب پھروالہ چلے آتے، یہاں گکھڑوں کا مشہور قلعہ تھا۔ یہاں سے کہوٹہ آتے اور منگیالہ سے ہو کر ضلع جہلم میں داخل ہوتے اور دھمیک پہنچ کر سلطان پور سے ہوتے ہوئے جہلم دریا کو عبور کرتے۔ اس کے بعد سرائے عالمگیر

ؒ ڈاکٹر محمد مسعد اللہ چغتائی صاحب نے مطلع فرمایا ہے کہ اس موضوع پر ان کا ایک مقالہ معارف اعظم گڑھ سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ہماری نگاہ سے یہ مقالہ نہیں گذرا البتہ یہ معلوم ہے کہ اس مضمون کے لکھے جانے تک ڈاکٹر صاحب موصوف نے مقام دھمیک نہیں دیکھا تھا۔

پہنچ کر لاہور کا رخ کرتے۔ ذیل کا نقشہ یہ راستہ سمجھنے میں مدد دے گا۔ یہ تھی قدیم شاہراہ جو شارع عام تھی شاہراہ سوری سے پیشتر۔

[٭ یہ علامت ہے پُرانے قلعوں کی جو شیر شاہ سوری سے پہلے کے بنے ہوئے ہیں۔ قدیم شاہراہ پر تمام قلعہ جات موجود تھے جن کے آثار آج کل بھی ملتے ہیں۔ جس قدر مغل اور پٹھان بادشاہوں کے قلعے اس راہ پر ہیں یعنی اس علاقے میں وہ تمام شاہراہ سوری کے جنوب میں ہیں یہ بہت بعد کے تعمیر شدہ ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ہمارا مقالہ THE DEVELOPMENT OF MILITARY ARCHECTURE IM PAKICTAN مطبوعہ پاکستان کوارٹرلی بابت دسمبر ۱۹۵۵ء]

چنانچہ پُل کی تعمیر کا جو کام تھا وہ کہیں جہلم کے قرب ہی میں تھا اور یہ اُس جگہ پر ہونا چاہیے جہاں آج کل سلطان پور واقع ہے یہی قدیم شاہراہ تھی جہاں دریائے جہلم عبور کیا جاتا تھا۔ دوسرا مقام جہاں پُل تیار کیا جا سکتا تھا وہ کچھ شمال کی طرف ہٹ کر ہوگی کیوں کہ سلطان پور پہنچنے کے بعد یہ قدیم شاہراہ دریا عبور کر کے منگلا کے پاس سے ہوتی ہوئی بھمبر (آزاد کشمیر) پہنچتی تھی اور وہاں سے

گجرات ہوتی ہوئی لاہور چلی جاتی تھی۔ بھمبر سے ایک قدیم راستہ کشمیر کو نکل جاتا تھا اور اکثر مغل بادشاہ یہی راہ کشمیر جانے کی اختیار کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا دھمیک اس قدیم شاہراہ پر واقع تھا۔ ورنہ ادھر سے گذرنا بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ دریائے جہلم پر موجودہ ریل کا پل بہت بعد کی تعمیر ہے۔

اب ہم کچھ دیر کے لئے پھر اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ فرشتہ کے علاوہ اور کسی معاصر مورخ نے یہ بات نہیں لکھی کہ سلطان شہید کو غزنیں لے جاکر دفن کیا گیا تھا۔ منتخب التواریخ اگرچہ طبقات سے بہت بعد کی تصنیف ہے لیکن مستند ہے، بدایونی نے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ سلطان غوری کی لاش کو غزنیں لے جایا گیا۔ البتہ منتخب التواریخ سے دو باتوں کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ایک تو یہ کہ لفظ "کہکر" کو اس نے صاف طور پر "کہوکہر" لکھ دیا ہے۔[۱] دوسرے مقام دھمیک کو انھوں نے ذرا وضاحت سے لکھنے کی کوشش کی ہے، جس سے اس کی مختلف شکلوں[۲] کا سوال مٹ جاتا ہے۔ بعض جگہ اسے دھمک کہا گیا ہے، اور فرشتہ اسے رتہک بھی لکھ گیا ہے۔ بدایونی نے اسے دمیک لکھا ہے۔ یہ موجودہ نام کے قریب تر ہے، اگرچہ بالکل صحیح نہیں۔ اصل نام وہی ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے، یعنی دھمیک

اب ایک آخری بات جو مقام دھمیک کے تعین کے لئے کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ دریائے جیحوں اور آبِ نیلاب اور دریائے جہلم ایک ہی دریا کے تین نام ہیں جیسا کہ اوپر وضاحت کر دی گئی ہے اور فرشتہ اور طبقات کے اقتباس سے ذیل کے ٹکڑوں سے بھی یہ بات پیدا ہوتی ہے۔

(۱) برکنار آب جیحوں نزول نماید و پل مہیا دارد۔

(۲) سلطان بتاریخ دوئم شعبان سال مذکور بکنار آب نیلاب رسید و در منزلے کہ برتہیک (دھمیک) اشتہار داشت فرود آمد۔

---

[۱] بحوالہ منتخب التواریخ قلمی نسخہ (مصور)، از کتب خانہ مرزا حیدر شکوہ۔ یہ نسخہ گیارہویں صدی ہجری میں لکھا گیا
[۲] مختلف ناموں کے لئے ملاحظہ فرمایئے ڈسٹرکٹ گزٹیر جہلم۔

اور چونکہ دھمیک نیلاب پر واقع تھا اس لئے حتماً یہ جہلم ہی ہوا۔ گویا یہاں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ دریائے نیلاب ہی دریائے جہلم بھی ہے۔

سلطان شہید کی تدفین کے بارے میں ہم قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے، ہمارے پاس دو روایات ہیں ایک تو فرشتہ کی اور دوسرے اس بزرگ اور مزار کی جو ہم نے خود دھمیک کے قریب دیکھے۔ اس کے متعلق تصدیق اسی طرح ہو سکتی ہے کہ یہ پتہ چل جائے کہ سلطان شہید کا مقبرہ غزنین میں موجود ہے۔ اگر وہاں کوئی آثار نہ ہوں تو پھر اس دھمیک والے مزار پر غور کرنا پڑتا ہے محققین کے لئے ایک اہم مسئلہ ہے اگر وہ اس کی تہہ کو پہنچ جائیں۔

تفسیر مظہری

عربی کی ایک لاجواب تفسیر

تفسیر مظہری اپنی غیر معمولی خصوصیات کے لحاظ سے بہترین تفسیر سمجھی گئی ہے۔ اس عظیم الشان تفسیر کے مطالعہ کے بعد تفسیر کی کسی کتاب کے مطالعہ کی ضرورت نہیں رہتی، اس میں وہ سب کچھ ہے جو دوسری تفسیروں میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے، مدلول کلام الٰہی کی تسہیل وتفہیم، تاریخی واقعات کی تحقیق وتدقیق، احادیث کے استقصار، احکام فقہی کی تفصیل وتشریح اور لطائف ونکات کی گل پاشی میں "تفسیر مظہری" کے درجہ کی کوئی کتاب عربی زبان میں موجود نہیں، امام وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کے کمالاتِ علمی کا یہ عجیب وغریب نمونہ ہے۔ الحمد للہ کہ اب اس بے مثال تفسیر کی تمام جلدیں طبع ہو گئی ہیں۔ قیمت تا بحدِ امکان کم سے کم رکھی گئی ہے۔ پوری کتاب کی دس عظیم جلدیں ہیں۔

ہدیہ غیر مجلد:۔ جلد اول سات روپے، جلد ثانی سات روپے، جلد ثالث آٹھ روپے، جلد رابع پانچ روپے، جلد خامس سات روپے، جلد سادس آٹھ روپے، جلد سابع سات روپے، جلد ثامن سات روپے، جلد تاسع پانچ روپے، جلد عاشر پانچ روپے، ہدیہ کامل چھیاسٹھ روپے۔ رعایتی ساٹھ روپے۔

تزک بابری

از

(جناب محمد رحیم صاحب دہلوی)

(۴)

انعام واکرام کی بارش | اندجان کی حکومت اور سلطنت کی وزارت پر حسن یعقوب کو مقرر کیا۔

اوش کا صوبہ دار قاسم قوچین کو بنایا۔

آخشی اور مرغینان پر اوزون حسن اور علی دوست طغائی متعین ہوئے۔

عمر شیخ مرزا کے اور امراء اور ملازمین کو ان کے لائق ملک، زمینیں، تنخواہیں، چراگاہیں اور مقامات عطا کئے۔

سلطان احمد مرزا کا انتقال | سلطان احمد مرزا یہاں سے اپنے ملک کی طرف واپس چلا تو دو تین منزل کے بعد بیمار پڑ گیا۔ شدید بخار نے آگھیرا جب وہ اوراتیبہ کے قریب آقسو[1] کے مقام پر پہنچا تو وسط شوال[2] ۸۹۹ھ ہجری میں اس کا انتقال ہو گیا[3]۔ اس وقت اس کی عمر چوالیس سال تھی۔

حسب نسب | وہ ۸۵۵ھ[4] میں پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں سلطان ابو سعید مرزا تخت نشین ہوئے تھے سلطان ابو سعید مرزا کے تینوں بیٹوں میں سب سے بڑا یہی تھا۔

اس کی ماں اوروہ بوغا ترخان کی بیٹی اور درویش محمد ترخان کی بڑی بہن تھی۔ اور مرزا کے ہاں بادشاہ بیگم وہی تھی۔

---

[1] آقسو۔ آستو۔ دریائے آقسو یعنی سفید دریا بہت بڑا دریا ہے وہ اسفرہ کے کوہستان سے نکل کر خجند کے مغرب میں دریائے سیحوں جا ملتا ہے۔ [2] وسط جولائی ۱۴۹۴ء

[3] بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ وہ آرمینیا میں مرا تھا۔ یہ مقام بھی دریا کے کنارے پر واقع ہے۔

[4] مطابق ۱۴۵۱ء

وضع قطع لمبا قد، سرخ رنگ، بھاری بدن اور داڑھی ایسی چگی کہ دونوں کلوں پر ایک بال بھی نہ تھا؛ بات چیت پُر لطف تھی۔ اس زمانے کی رسم کے مطابق چارپیچ وضع کی دستار باندھتا تھا۔ اور اس کا کنارہ بھوؤں پر رکھتا تھا۔

اخلاق و آداب حنفی مذہب اور خوش اعتقاد تھا۔ جلسۂ شراب میں بھی نماز ترک نہ ہوتی تھی[1]

وہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کا مرید تھا۔ حضرت خواجہ اس کے مربی اور پشت و پناہ تھے وہ بہت مودب تھا حضرت خواجہ کے سامنے خاص طور پر ادب کا لحاظ رکھتا تھا۔

کہتے ہیں کہ خواجہ کی مجلس میں وہ جتنی دیر بیٹھتا ایک زانو سے دوسرا زانو نہ بدلتا تھا ایک دفعہ خلاف عادت جس زانو پر بیٹھا تھا بدلا۔ مرزا کے جانے کے بعد حضرت خواجہ نے فرمایا۔ ذرا اس جگہ کو دیکھنا جہاں مرزا بیٹھا تھا۔ دیکھا تو وہاں ایک ہڈی تھی۔

قول و فعل مرزا لکھا پڑھا کچھ نہ تھا۔ اگرچہ شہر میں پرورش پائی مگر سادہ مزاج ترک تھا۔ شاعر بھی نہ تھا۔ قول اور عہد کا ایسا سچا اور پکا تھا۔ کہ جو کہتا اُسے پورا کرتا۔

وہ شجاع بھی تھا مگر ایسا کبھی نہ ہوا کہ کوئی نمایاں کام اس کے ہاتھوں ہوا ہو۔ لیکن کہتے ہیں کہ بعض معرکوں میں اس نے منہ نہیں پھیرا۔

سیر و شکار وہ اچھا تیر انداز تھا اور ایسا تیر مارتا تھا کہ اکثر سوار ہو کر میدان کے اس سرے سے اُس سرے تک پہنچنے میں اپنے تیر اور گرز سے نشانے گاہ کی مخصوص حد میں رکھے ہوئے برتن کو اڑا دیتا تھا[2]۔

اس کے بعد جب وہ بہت موٹا ہو گیا تو شکار کو شکاری جانوروں سے پکڑواتا تھا۔ اس کے جانوروں سے شکار کم بچتا تھا۔ چُرے اور باز وغیرہ کے شکار کا بہت شوق تھا۔ چرے اور باز سے بہت شکار کھیلتا تھا اور خوب کھیلتا تھا۔

سلطان الغ بیگ[3] مرزا کے بعد اس جیسا ماہر شکاری کوئی دوسرا بادشاہ نہیں ہوا۔

---

[1] ایک نسخہ میں ہے کہ "اس کی کوئی نماز ترک نہ ہوتی تھی"۔ [2] ترکوں کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اور تیر مارتے ہوئے مخصوص حد کو پار کر جاتے تھے۔ [3] سلطان الغ بیگ مرزا، سلطان شاہرخ مرزا کا بڑا بیٹا اور (بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

(بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

شرم و حیا | وہ انتہا درجہ کا شرمیلا بھی تھا کہتے ہیں کہ تنہائی میں بھی اپنے محرموں اور مصاحبوں تک کے سامنے پاؤں تک ڈھکے رکھتا تھا۔

شراب کباب | جب کبھی شراب پینے کی دھت لگتی تو مہینہ مہینہ بیس بیس دن تک پئے چلا جاتا۔ چھوڑتا تو مہینہ مہینہ بیس بیس دن تک آنکھ اٹھاکر نہ دیکھتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ رات دن ایک نشست میں بیٹھا شراب پیا کرتا۔ جب شراب چھوڑتا تو نشہ آور چیزوں کا استعمال کرتا۔ اس کی طبیعت سرد ہو جاتی تھی۔

کم سخن اور بہادر آدمی تھا۔ اپنے اُمراء کی مٹھی میں تھا۔

چار لڑائیاں | وہ چار لڑائیاں لڑا۔ ایک دفعہ رامن[۱] کے نواح میں آقار توز[۲] کے مقام پر نعمت ارغون کے چھوٹے بھائی شیخ جمال ارغون سے لڑا۔ اور غالب ہوا۔

دوسری دفعہ عمر شیخ مرزا سے خواص[۳] کے مقام پر معرکہ ہوا اور فتح پائی۔

تیسری دفعہ تاشقند[۴] کے قریب دریائے چرچق کے کنارے سلطان محمود خاں سے آمنا سامنا ہوا۔ آپس میں لڑائی نہ ہوئی۔ صرف چند مغل لٹیروں نے لشکر کے پیچھے سے آکر ہاتھ ہی ڈالا تھا کہ اتنا بڑا لشکر بے لڑے بھڑے اور مقابلہ کئے ایسا بھاگا کہ کسی نے کسی سے آنکھ نہ ملائی اور بہت سے سپاہی دریا میں ڈوب گئے۔

چوتھی دفعہ حیدر کوکلتاش پر یار ایلاق کے میدان میں فتح پائی۔

زیر تحت ممالک | سمرقند اور بخارا اس کے باپ نے دئے تھے۔ وہ اس کے پاس تھے۔

عبدالقدوس نے جب شیخ جمال کو قتل کیا تو تاشقند۔ شاہرخیہ اور سیرام لے لیا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تیمور کا پوتا تھا۔ وہ سمرقند کا بادشاہ تھا۔ نہایت عالم، فاضل، اور علم ہندسہ کا ماہر کامل تھا۔ اس کے زمانے میں زیچ تیار ہوئی تھی اسے الغ بیگی زیچ کہتے ہیں ۸۱۲ھ میں اس کے باپ نے اس کو ماوراء النہر کا حاکم بنا دیا تھا۔ ۸۵۰ھ میں باپ کے انتقال کے بعد مستقل بادشاہ ہوا۔ [۱] رامن یا زامن، اوراتیبہ کے ضلع میں واقع تھا۔ [۲] وہ میدان جس میں دریا بہتا ہے۔ [۳] خواص، اوراتیبہ اور تاشقند کے بیچ میں ہے۔ [۴] تاشقند، شاہرخیہ اور سیرام کے بیچ میں ہے۔

آخر میں تاشقند اور سیرام اپنے چھوٹے بھائی عمر شیخ مرزا کو دے دیئے تھے۔
کچھ دن خجند اور اور اتیبہ بھی مرزا کے قبضہ میں رہے ہیں۔

مرزا کی اولاد مرزا کے ہاں دو بیٹے ہوئے جو بچپن ہی میں مر گئے۔ پانچ بیٹیاں تھیں۔

رابعہ سلطان بیگم چار لڑکیاں قتق بیگم[1] سے ہوئیں۔ جن میں سب سے بڑی رابعہ بیگم تھی۔ جس کو قراکوز بیگم بھی کہتے تھے۔ اس کا بیاہ اپنی زندگی میں سلطان محمود خاں سے کر دیا تھا۔ خان سے اس کے ہاں ایک لڑکا ہوا۔ اس کا نام بابا خان تھا۔ وہ بچہ نہایت ہونہار اور خوبصورت تھا۔ ازبکوں نے جب خان کو خجند میں شہید کیا۔ تو اس بچے کو اور بچوں سمیت مار ڈالا۔
سلطان محمود خاں کے بعد جانی بیگ نے رابعہ سلطان بیگم سے نکاح کر لیا۔

صالحہ سلطان بیگم دوسری بیٹی صالحہ سلطان بیگم عرف آق بیگم[2] تھی۔ سلطان احمد مرزا کے بعد سلطان محمود مرزا نے اس لڑکی کی شادی اپنے بیٹے سلطان مسعود مرزا کے ساتھ بڑی دھوم سے کی۔
آخر میں وہ شاہ بیگم اور مہر نگار خانم کے ساتھ کاشغر میں گرفتار ہو گئی۔

عائشہ سلطان بیگم تیسری بیٹی عائشہ سلطان بیگم تھی۔ میں پانچ برس کی عمر میں سمرقند گیا تھا۔ وہاں اس سے مری منگنی ہو گئی۔ اس کے بعد جب لڑائی جھگڑوں کے زمانے میں وہ خجند آئی تو میں نے اس سے شادی کر لی۔

میں نے جب دوسری بار سمرقند فتح کیا تو اس کے ہاں لڑکی ہوئی۔ مگر چند دن بعد مر گئی۔
تاشقند کی ویرانی سے پہلے وہ اپنی بڑی بہن کے بہکانے سے مجھ سے الگ ہو گئی۔

سلطانیم بیگم مرزا کی چوتھی لڑکی سلطانیم بیگم تھی۔ اس کی شادی پہلے علی مرزا سے ہوئی۔ پھر علی مرزا کے بعد تیمور سلطان سے اس کا نکاح ہوا۔ تیمور سلطان کے بعد مہدی سلطان نے اس سے نکاح کر لیا۔

معصومہ سلطان بیگم مرزا کی سب سے چھوٹی اور پانچویں بیٹی معصومہ بیگم تھی۔
اس کی ماں حبیبہ سلطان بیگم قوم ارغون میں سے سلطان ارغون کی بھتیجی تھی۔

---

[1] قتق بیگم۔ قتلق بیگم [2] یعنی حسینہ بیگم

میں جس زمانے میں خراسان گیا۔ تو وہاں اس سے ملا۔ اور وہ پسند آئی۔ میں نے شادی کا پیغام دیا۔ اور پھر کابل لا کر اس سے نکاح کر لیا۔

اس کے ہاں ایک لڑکی ہوئی۔ زچگی میں اُس کا انتقال ہوا۔ اس لڑکی ہی سے اس کا نام چلا۔

مہرنگار خانم | مرزا کی بیویوں میں سے پہلی بیوی مہرنگار خانم، یونس خاں کی بیٹی تھیں۔ وہ مری والدہ کی سگی بہن تھیں۔

ترخانان بیگم | دوسری بیوی ترخانوں[1] میں سے تھی۔ اس کا نام ترخاناں بیگم تھا۔

قتلق بیگم | تیسری بیوی قتلق بیگم ان ہی ترخاناں بیگم کی دودھ شریک بہن تھی۔ سلطان احمد مرزا نے اس پر عاشق ہو کر گھر میں ڈال لیا۔ مرزا کو اس سے بڑی محبت تھی۔ اور وہ ان پر بہت حاوی تھی۔ شراب بھی پیتی تھی اس کی زندگی میں مرزا نے کسی دوسری عورت کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

آخر میں مرزا نے اس کو قتل کر ڈالا اور بدنامی سے چھٹکارا پایا۔

خان زادہ بیگم | چوتھی بیوی خان زادہ بیگم ترمذ کے خان زادوں میں سے تھی۔ میں جس زمانہ میں پانچ برس کا تھا۔ اور سلطان احمد مرزا کے پاس سمرقند گیا۔ اس زمانے میں مرزا نے اس سے شادی کی۔ ترکوں کے رواج کے مطابق اس کا گھونگھٹ نہ اُٹھا تھا۔ مرزا نے مجھ سے کہا تم گھونگھٹ اُٹھا دو[2]۔

لطیف بیگم | پانچویں بیوی لطیف بیگم تھی۔ وہ احمد حاجی[3] بیگ کی نواسی تھی۔

مرزا کے مرنے کے بعد اس نے حمزہ سلطان سے نکاح کر لیا۔ حمزہ سلطان کے ہاں اس سے

---

[1] قدیم زمانے میں مغلوں اور ترکوں کی سرکار میں "ترخان" ایک بہت اونچے درجہ کا عہدہ تھا۔ ترخان سے کوئی خدمت نہیں لی جاتی تھی۔ لوٹ مار میں اس کو اتنی چھوٹ تھی کہ اس کی لوٹ میں سے شاہی حصہ تک نہ لیا جاتا تھا۔ وہ بادشاہ کے حضور میں بغیر اطلاع کے جا سکتا تھا۔ اور جو چاہے بے جھجک عرض کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ نو خون اس کو معاف تھے۔ بلکہ اس سے بڑے بھی کوئی جرم ہوں تو نو دفعہ معاف ہو جاتے تھے۔ بابر کے زمانے میں "ترخان" ایک خاندان بن گیا تھا۔ [2] گھونگھٹ اُٹھانا، ترکوں میں پرانی رسم تھی۔ دلہن کے چہرے پر شادی کے بعد عرصہ تک گھونگھٹ پڑا رہتا تھا پھر کسی بچہ سے گھونگھٹ اٹھوایا جاتا تھا۔ اور بچے کے متعلق یقین کیا جاتا تھا کہ اس کی شادی جلدی ہو گی [3] احمد جان بیگ

تین بچے ہوئے

میں نے جب تیمور سلطان اور حمزہ سلطان کو ہرا کر حصار چھینا۔ تو وہ اور سلطان زادے گرفتار ہوئے۔ میں نے سب کو چھوڑ دیا۔

جبیبہ سلطان بیگم | چھٹی بیوی جبیبہ سلطان بیگم تھی۔

وہ سلطان ارغون کی بھتیجی تھی۔

امرا | ان کے امرا میں سے ایک :۔

جانی بیگ دولدائی | جانی بیگ دولدائی تھا۔ وہ سلطان ملک کاشغری کا چھوٹا بھائی تھا۔ سلطان ابو سعید مرزا نے سمرقند کی حکومت کے ساتھ ساتھ اس کو سلطان احمد مرزا کی سرکار کا مختار بھی بنایا۔

اس کے اخلاق اور اطوار عجیب تھے۔ لوگ اس کی عجیب عجیب نقلیں بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ :۔

جس زمانے میں وہ سمرقند کا حاکم تھا۔ ازبک کا ایک ایلچی آیا۔ وہ ازبکوں میں پہلوان مشہور تھا۔ ازبک طاقت ور اور پہلوان کو بوغا کہتے ہیں۔

جانی بیگ نے اس سے پوچھا کیا تجھے بوغا کہتے ہیں ؟ بوغا ہے تو آئیں تجھ سے ایک نبرد کروں۔ ایلچی نے ہر چند عذر کیا۔ مگر جانی بیگ لپٹ ہی گیا اور اس کو دے مارا۔

جانی بیگ بہادر آدمی تھا۔

احمد حاجی بیگ | احمد حاجی بیگ، ملک کاشغری کا بیٹا تھا۔ سلطان ابو سعید مرزا نے کئی دفعہ اسے ہری کا حاکم بنایا[1]۔ اور اس کے چچا جانی بیگ کے مرنے کے بعد اس کو جانی بیگ کی جگہ سمرقند کا حاکم مقرر کیا۔

---

[1] مسٹر جان لیڈن نے اپنے ترجمہ میں لکھا ہے کہ "سلطان ابو سعید مرزا نے اس کو سمرقند کی حکومت دی جہاں وہ کئی برس تک حاکم رہا۔

وہ خوش فکر اور بہادر آدمی تھا۔ وفائی اس کا تخلص تھا۔ اور وہ صاحب دیوان تھا شعر اچھے کہتا تھا۔ اس کا شعر ہے:۔

مستم اے محتسب امروز من دست بدار احتسابم بکن آں روز کہ یابی ہشیار

احمد حاجی بیگ جس زمانے میں ہری سے سمرقند آیا۔ تو میر علی شیر نوائی اس کے ساتھ تھا۔ پھر جب سلطان حسین مرزا ہری کا بادشاہ ہوا تو علی شیر ہری آگیا۔ اور وہاں اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک ہوا۔

احمد حاجی بیگ کے پاس گول بدن کے بہت چالاک[۱] گھوڑے تھے اور وہ اچھا سوار تھا اس کے اکثر گھوڑے اسی کے سدھائے ہوئے تھے۔

وہ اگرچہ بہادر آدمی تھا لیکن جتنا وہ بہادر تھا۔ اتنا اس کا عروج نہیں ہوا۔

وہ لاپرواہ آدمی تھا۔ اس کے سب کام نوکروں چاکروں کے ہاتھ میں تھے۔

جب بخارا میں، بائسنغر مرزا اور سلطان علی مرزا میں لڑائی ہوئی۔ اور بائسنغر مرزا کو شکست ہوئی۔ تو احمد حاجی بیگ پکڑا گیا اور درویش محمد ترخان کے قتل کی تہمت میں بے عزتی کے ساتھ قتل کیا گیا۔

درویش محمد ترخان | ایک امیر درویش محمد ترخان تھا۔ وہ اور دا ابو غا ترخان کا بیٹا اور سلطان احمد مرزا اور سلطان محمود مرزا کا سگا ماموں تھا۔ وہ سب امیروں میں ممتاز تھا اور مرزا کو اس پر بہت اعتماد تھا۔ فقیر صفت اور دیندار آدمی تھا ہمیشہ قرآن شریف لکھا کرتا تھا۔ شطرنج بہت کھیلتا اور اچھی کھیلتا تھا۔ شکاری جانور پالنے کی بڑی مہارت تھی۔ اور جانور کو شکار پر خوب پھینکتا تھا۔

سلطان علی مرزا اور بائسنغر مرزا کی لڑائی میں یہ صاحب اقتدار تھا۔ بدنامی کے ساتھ مارا گیا۔

عبد العلی ترخان | ایک امیر عبد العلی ترخان تھا۔

---

[۱] تپ چاق، گھوڑوں کی ایک قسم کا نام ہے۔ یہ بہت چالاک اور گول بدن کا گھوڑا ہوتا ہے۔ اور اس کو ایک طرح کا خاص قدم سکھایا جاتا ہے۔ احمد حاجی بیگ کے پاس اسی قسم کے گھوڑے تھے۔

وہ درویش محمد خاں ترخان کا قریبی رشتہ دار تھا۔ درویش محمد خاں کی چھوٹی بہن اس سے منسوب تھی۔ جو باقی ترخان کی ماں تھی۔

درویش محمد ترخان اگرچہ خاندانی رتبے کے ساتھ ساتھ رتبے اور امارت وغیرہ میں بھی اس سے بہت اونچا تھا۔ مگر یہ فرعون بے سامان اس کی کچھ اصل نہ سمجھتا تھا۔

وہ اکثر بخارا کا حاکم رہا ہے۔ اس کے ملازمین کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اپنے نوکروں کو زرق برق اور شان سے رکھتا تھا۔ اس کی واقفیت، تدبیر، عدالت، دربار، جلوس مجلس اور دعوتیں بالکل شاہانہ تھیں۔

وہ ظالم، فاسق اور مغرور آدمی تھا۔

شیبانی خاں اگرچہ اس کا نوکر نہ تھا۔ مگر مدتوں اس کی خدمت میں رہا۔ اکثر چھوٹے چھوٹے سلاطین اس کے ہاں ملازم تھے۔ سچ یہ ہے کہ عبدالعلی ترخان ہی کے سبب شیبانی خاں نے اتنی ترقی کی اور تمام خاندانوں کی بربادی کا باعث بنا۔

سید یوسف اوغلاقچی | ایک امیر سید یوسف اوغلاقچی تھا۔ اس کا دادا مغلستان سے آیا تھا۔ الغ بیگ مرزا نے اس کے باپ کے ساتھ بہت کچھ سلوک کئے۔ وہ بہت مدبر اور بہادر آدمی تھا۔ باجہ[1] خوب بجاتا تھا۔ جب میں پہلے پہل کابل آیا۔ تو وہ میرے ساتھ تھا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ بہت اچھے سلوک کئے وہ اسی لایق تھا۔

میں نے جب پہلے پہل ہندوستان پر فوج کشی کی۔ تو سید یوسف ہی کو کابل میں چھوڑا۔ وہیں اس کا انتقال ہوا۔

درویش بیگ | ایک امیر، درویش بیگ تھا۔ وہ ایکو تیمور کی نسل میں سے تھا۔ (ایکو تیمور بیگ امیر تیمور کے بنائے ہوئے امیروں میں سے تھا)

وہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کا مرید تھا۔ علم موسیقی سے واقف تھا۔ ساز بجاتا تھا۔ شاعر بھی

---

[1] قبوز۔ باجے کی ایک قسم۔ لیکن ایک نسخہ میں قبوز کی بجائے تیزورہ لکھا ہے۔

تھا۔ جب سلطان احمد مرزا نے دریائے چرچق کے کنارے شکست کھائی تو یہ وہیں دریا میں غرق ہوا۔

محمد مزید ترخان | ایک امیر محمد مزید ترخان تھا۔ وہ درویش محمد ترخان کا سگا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ کئی سال تک ترکستان کا حاکم رہا۔ شیبانی خاں نے ترکستان اسی سے چھینا۔ وہ مدبر اور با تدبیر تھا۔ مگر بے باک اور فاسق تھا۔

میں نے دوسری اور تیسری دفعہ سمرقند فتح کیا تو وہ میرے پاس آگیا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ بہت سلوک کیا۔ وہ ملک کول کی لڑائی میں مارا گیا۔

باقی ترخان | باقی ترخان، عبد العلی ترخان کا بیٹا اور سلطان احمد مرزا کا پھوپھی زاد بھائی تھا۔ اس کے باپ کے بعد اسی کو بخارا کا حاکم بنایا گیا۔ سلطان علی مرزا کے زمانے میں اُسے بہت عروج ہوا۔ پانچ چھ ہزار آدمی اس کے ملازم ہو گئے۔

وہ سلطان علی مرزا کا کچھ ایسا تابعدار نہ تھا۔ اس نے قلعہ دبوسی پر شیبانی خاں سے لڑکر شکست کھائی۔ اسی شکست کے سبب شیبانی خاں نے بخارا پر قبضہ کر لیا۔

باقی ترخان کو شکاری جانوروں کا بہت شوق تھا۔ کہتے ہیں کہ سات سو[1] شکاری جانور اس کے ہاں پلے ہوئے تھے اس کے اخلاق واطوار ایسے تھے جو بیان نہیں ہو سکتے۔ اس نے خاندانی وجاہت اور مال و دولت کے سبب ممتاز درجہ حاصل کیا۔ اس کے باپ نے شیبانی خاں کے ساتھ بہت اچھے سلوک کئے تھے۔ اس لئے وہ شیبانی خاں کے پاس چلا گیا۔ مگر اس ناحق شناس اور بے مروت نے ان نیکیوں کے بدلے ذرا بھی شفقت اور رعایت نہ کی۔ آخر اس کی بری حالت ہوئی اور وہ آخر آخر میں ذلت کے ساتھ مرا۔

سلطان حسین ارغون | ایک امیر، سلطان حسین ارغون تھا۔ مدت دراز تک قراکول کی حکومت اس کے سپرد رہی۔ اس لئے وہ سلطان حسین قراکولی مشہور ہو گیا۔

وہ بڑا صاحب الرائے اور عقل مند تھا۔ بہت دن تک میرے پاس بھی رہا۔

---

[1] آٹھ سو

قل محمد توچین | قل محمد توچین بھی ایک امیر تھا۔ وہ بہادر آدمی تھا۔

عبد الکریم | عبد الکریم اشرب ایغور[1] ایک امیر تھا۔ وہ سلطان احمد مرزا کے ہاں دیوان خانے کا داروغہ تھا۔ اور فیاض اور بہادر آدمی تھا۔

محمود مرزا کو بلاوا | سلطان احمد مرزا کے انتقال کے بعد امراء نے متفق ہو کر ایک پیغام پر پہاڑی راستے سے محمود مرزا کے پاس بھیجا۔ اور مرزا کو بلوایا۔

ملک محمد مرزا کا سمرقند پر دھاوا | ادھر ملک محمد مرزا (منوچہر مرزا کا بیٹا جو سلطان ابو سعید مرزا کا بڑا بھائی تھا) سلطنت کے خیال سے چند بد معاشوں کے ساتھ سمرقند آگیا۔ مگر کچھ نہ بنا سکا۔ بلکہ اپنے ساتھ چند اور بے گناہوں کے قتل کا باعث بنا۔

محمود مرزا سمرقند کے تخت پر | سلطان محمود مرزا یہ خبر سنتے ہی سمرقند چلا آیا۔ اور بے کھٹکے تخت پر بیٹھ گیا۔

لیکن سلطان محمود مرزا کی نالائقی اور بری حرکتوں کے سبب تمام فوج اور رعیت کو اس سے نفرت ہو گئی اور وہ کنارہ کرنے لگی۔

ملک محمد مرزا کا قتل | ایک حرکت تو یہ کی کہ ملک محمد مرزا کو چار اور مرزاؤں کے ساتھ گوگ سرائے بھیج دیا۔ حالانکہ ملک محمد مرزا اس کے چچا کا بیٹا تھا۔ اور اس کا داماد بھی تھا۔ ان میں سے دو کو زندہ رہنے دیا اور ملک محمد مرزا کو دوسرے ایک مرزا کے ساتھ قتل کروا دیا۔ ملک محمد مرزا اگرچہ کسی قدر مجرم تھا۔ اور مرزا بے گناہ تھے۔

بیوی چھین لی | دوسری حرکت یہ تھی کہ جیسا وہ خود ظالم اور فاسق تھا۔ ویسے ہی اس کے سب کے سب امراء اور نوکر ظالم اور فاسق تھے۔ حصار کے لوگ اور خاص طور پر خسرو شاہ کے متعلقین ہمیشہ شراب خوری اور بدکاری میں مبتلا رہتے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ خسرو شاہ کے ایک نوکر نے کسی شریف آدمی کی بیوی چھین لی۔ اس مظلوم نے خسرو شاہ سے فریاد کی تو خسرو شاہ بولا۔ اتنی مدت تیرے پاس رہی۔ اب کچھ

---

[1] ایغور۔ یوغور۔ اوغوز۔ تاتاریوں میں ایک مشہور فرقہ ہے۔ تاتاریوں کی سرکار میں ان ہی میں سے کارندے رکھے جاتے تھے ان کی تحریر اور خط کی شکل عجیب و غریب تھی۔ اس خط کو سلطان ایغور خاں نے ایجاد کیا تھا۔ اسی لئے اس کو خط ایغوری کہتے تھے۔

دن اس کے پاس رہنے دے۔

محمود خاں کی انتظامی قابلیت اس کا انتظام اور قاعدے قانون اچھے تھے۔ وہ مال کا کام بھی جانتا تھا۔ اور حساب وکتاب سے بھی واقف تھا لیکن اس کی طبیعت ظلم اور فسق وفجور کی طرف مائل تھی۔

سمرقند آتے ہی اس نے انتظام اور تحصیل کی اور ہی بنا ڈالی۔

فقرا اور مساکین پر ظلم وستم وہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے متعلقین کے ساتھ ظلم اور سختی کرنے لگا۔ اس سے پہلے بہت سے فقرا اور مساکین ان کی حمایت اور سفارش سے بچ جاتے تھے۔ اب خود ان پر تکلیفیں گزرنے لگیں اور زیادتیاں ہونے لگیں۔

انتہائی کمینگی عام رعایا، بازار کے دکاندار یہاں تک کہ ترک اور سپاہیوں کے بچوں کو پکڑ کر غلام اور معشوق بنانے کے لئے لے جاتے تھے۔ ڈر کے مارے لوگوں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔

محمود مرزا کی حکومت سمرقند کا خاتمہ سمرقند والے پچیس سال سے سلطان احمد مرزا کے لطف وکرم کے سبب آرام وآسائش کے ساتھ گذر بسر کر رہے تھے۔ اور ان کے اکثر معاملات حضرت خواجہ کے سبب شرع اور انصاف کے مطابق طے ہوتے تھے۔ اب وہ لوگ ان ظلموں اور بدکاریوں سے عاجز آگئے اور رنجیدہ ہوئے۔ شریف، کمین، فقیر اور مسکین برا بھلا کہنے لگے۔ اور بددعائیں دینے لگے ؎

حذر کن ز دو درونہائے ریش — کہ ریش درون عاقبت سر کند
بہم بر مکن تا توانی دلے — کہ آہے جہانے بہم بر کند

آخر اس ظلم اور بدکاری کی وجہ سے سمرقند میں سلطان محمود مرزا کی حکومت پانچ چھ مہینے سے زیادہ نہ رہی۔

(باقی آئندہ)

عروج وزوال کے الٰہی قوانین

از

جناب مولوی محمد تقی صاحب امینی

(۴)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ فرمائیے برہان بابتہ ماہ نومبر)

مذکورۃ الصدر سورت کو پھر ایک مرتبہ دہرا لیجئے۔

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۱۰۳/۲۰۱ اس میں عروج اور بقا کے چار بنیادی اصول مذکور ہیں ان کے نہ پائے جانے کی صورت میں خسران وہلاکت کی خبر دی گئی ہے۔ قرآن حکیم کی روشنی میں چاروں کی بالترتیب تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) ایمان

ایمان قوت وطاقت کا سرچشمہ اور تمام انقلابات وتحریکات کی کامیابی کی جان ہے

قرآن حکیم میں جس حقیقت کو ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے اس کا مفہوم بے جان تصدیق اور جامد عقیدہ نہیں ہے بلکہ علم وعقیدہ اور معرفت ومحبت کے حسین امتزاج سے جو قلبی اور ذہنی کیفیت پیدا ہوتی ہے دراصل اس کیفیت کا نام ایمان ہے۔

عملی زندگی میں ایمان کا اثران طریقوں سے ظاہر ہوتا ہے،

(۱) مومن کی رگ رگ میں سما کر اس کی پوری دنیا بدل دیتا ہے (۲) تمام خلاف عقاید وتصورات کو یک قلم دل سے مٹا دیتا ہے (۳) ایمانیات کو بروئے کار لانے کے لئے مومن سرتاپا عمل بن جاتا ہے (۴) ہر مقابل اور مخالف طاقت کو دبانے کے لئے تن۔من۔دھن کی بازی لگا دیتا ہے۔

قومی اور جماعتی زندگی کا غائر نظر کے ساتھ مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ تمام انقلابات اور تحریکات کی کامیابی کی جان صرف "ایمان" ہے یہی قومی زندگی کی تشکیل کرتا ہے اور اس میں جس قدر پختگی و مضبوطی ہوتی ہے اسی قدر وہ عملی دنیا میں متشکل ہو کر رہتا ہے۔ اس کے پیدا ہونے کے بعد وہ تمام عناصر خود بخود اکٹھا ہو جاتے ہیں جو ترقی کے لئے درکار ہیں[1]۔ یہ اس لئے کہ ایمان کا براہ راست تعلق "عالم النفس" سے ہے جو افکار و احساسات اور تصورات کا مبدأ ہے اور جہاں سب سے پہلے انقلاب کی تخم ریزی ہوتی ہے۔ جب کسی انقلاب کو خوش آمدید کہنے کے لئے "عالم النفس" کی ٹھیک اصلاح اور تربیت ہو گئی تو پھر "عالم آفاق" کے تمام مرحلے آسانی سے طے ہوتے رہتے ہیں۔

اس لحاظ سے اصل قوت و طاقت کا سرچشمہ صرف ایمان ہے اسی کے ذریعہ صلاحیتیں منظم ہو کر اخلاقیت اور مادیت کی فراہمی کی طرف لگتی ہیں۔ ایمان کے انھیں دور رس نتائج کی بنا ر

---

[1] اس بارے میں "اجتماعیات" کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں،

"قوت ایمانی ایک ایسی قوت ہے کہ جس شخص میں یہ پیدا ہو جاتی ہے اس کی قوت میں دس گنا اضافہ ہو جاتا ہے "انجیل" میں بہت صحیح آیا ہے کہ قوتِ ایمانی پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا سکتی ہے جو لوگ تاریخی انقلاب کے باعث ہوئے وہ چند مسکین اور ایمان دار لوگ تھے جن کی قوتِ ایمانی نہایت مضبوط اور مستحکم تھی یہ "فلاسفہ" کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے مذہب کی ایجاد کریں جو لوگوں کے قلوب پر غلبہ حاصل کرے یا ایسی بڑی بڑی حکومتوں کی بنیاد ڈالے جو دنیا کے اس کنارے سے اس کنارے تک پھیلی ہوئی ہو۔" (روح الاجتماع ص۱۲۸)

"جو شئی ایک سپاہ کو دوسری پر کامیاب رکھتی ہے وہ یہ خارجی مؤثرات نہیں (گو ایک حد تک یہ بھی معین ہوتے ہیں بلکہ ایک اندرونی قوت ہوتی ہے وہ اس امر کا باطنی احساس اور یہ پختہ عقیدہ ہوتا ہے کہ فتح اسی کی ہونا ہے صرف اعتقاد کی قوت جس نے عرب بادیہ نشین کو کسریٰ و قیصر کی ٹڈی دل قواعد داں فوج پر غالب کر دیا۔ وہ کیا چیز ہے جو افریقہ کے وحشیوں کو انگلستان و فرانس کی بہتر سے بہتر سپاہ پر وقتاً فوقتاً غلبہ دے دیتی ہے؟ محض عقیدہ کا استحکام۔"

خود آج (کتاب لکھنے کا زمانہ) تمہاری آنکھوں کے سامنے وہ کیا طلسم ہے جو جرمنی کو ایک دنیا سے مردانہ وار لڑا رہا ہے کیا کثرتِ افواج ہے؟ مگر تعداد کے لحاظ سے تو روس کی سپاہ اس سے بہت زیادہ بیان کی جاتی ہے کیا سائنس دانی ہے؟ کیا روپیہ کی فراوانی ہے؟ کیا ملک کی اقتصادی خوش حالی ہے؟ لیکن ان میں سے کسی حیثیت سے انگلستان و فرانس کی متحدہ طاقت اس سے کمتر نہیں ہے پھر آخر کیا شئی ہے؟ وہ صرف جرمن آبادی کا وہ تعصب ہے جو اس میں انگریزی فرنچ و روسی قوموں کے خلاف عرصہ سے جاں گزیں ہے اور جس کی بنا پر وہ یقین رکھتی ہے کہ وہ اپنے مخالفین کا زور ہمیشہ کے لئے توڑ دے گی۔ (فلسفۂ اجتماع ص۲۰۲)

پر قرآن حکیم نے اس کو بنیاد قرار دیا ہے اور اپنی پوری انقلابی تعلیمات کا محور اور مرکز بنایا ہے۔

ذیل میں چند آیتیں ذکر کی جاتی ہیں جن سے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق ہوتی ہے لیکن پہلے یہ بات سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن حکیم خداوند قدوس کی کتاب ہے اس میں ہر شے کے نیچے سے اونچے معیار کا تذکرہ کیا گیا ہے ایمان وغیرہ کے بارے میں جو کچھ تفصیلات آگے بیان ہوں گی وہ سب درجہ کمال کی طرف رہنمائی کرتی ہیں اور حقیقی و دائمی قیام و بقار کی ضمانت پیش کرتی ہیں۔

ایمان کا لازمی نتیجہ محبت اور محبوبیت ہے	وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ ۱۶۵/۲	"جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ان کے دلوں میں سب سے زیادہ اللہ کی محبت ہوتی ہے"

اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ تمام ماسوا کے "بت" دل سے نکل کر دل صرف اللہ کا جلوہ گاہ بنے اور اس سے محبت اور تعلق اس قسم کا ہو کہ اس کے مقابلہ میں نہ عزیز سے عزیز ترین تعلقات کی کوئی قیمت رہے اور نہ شان و شوکت والی طاقتوں کی کوئی حیثیت رہے۔[1]

اس مرحلہ پر پہنچنے کے بعد اللہ کا تصور زندگی کے تمام گوشوں میں چھا کر قوتِ نظری اور قوتِ عملی دونوں میں انقلابی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ نیابت الٰہی کے خدوخال

---

[1] ڈاکٹر سلیمان کہتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ انسان کی اصلی دینداری یہ نہیں ہے کہ وہ کسی معبود کی پرستش کرتا ہے بلکہ انسان میں اصلی دین داری کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے ارادہ اپنی مرضی اور اپنی ذات کو اس معبود کی مرضی اور اس کے ارادہ پر چھوڑ دیتا ہے اور اپنی مرضی کو اس کی مرضی کے لئے بالکل فنا کر دیتا ہے جب یہ اعتقادی کیفیت انسان میں پیدا ہو جاتی ہے تو اس وقت تمام دوسرے خیالات کے گرد و غبار سے اس کا شیشۂ دل پاک و صاف ہو جاتا ہے اور اس کے تمام اعمال و افعال کا محور اور مرجع صرف وہی ذات ہوتی ہے جس کی رضا جوئی پر اپنی مرضی اور شخصیت کو فنا کر دیا ہے۔

(روح الاجتماع ص۲۰)

"قومی اور جماعتی زندگی میں اسی قسم کی دین داری حرکت اور عمل پیدا کر کے زندگی کے تمام عناصر کو جمع کرتی ہے "اجتماعیات" کے باب میں ڈاکٹر موصوف کے ذکر کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ مذہبی آدمی ہیں اور اس بیان سے مذہب کی نشر و اشاعت مقصود ہے بلکہ وہ غیر مذہبی ہونے کے باوجود مذہب کو "اجتماعیات" کے باب میں استاد خیل مانتے ہیں۔ ۱۲

اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں جس کی بنا پر فکر و نظر میں وسعت، دل میں قوتِ جذب اور شعور میں بیداری پیدا ہو جاتی ہے اور اخلاق و کردار میں صفاتِ الٰہی کا پرتو دکھائی دیتا ہے اس طرح

"لا یسعنی الا قلب مومن" — میری سمائی بجز قلب مومن کے اور کہیں نہیں ہو سکتی ہے

اور "تخلقوا باخلاق اللہ" — تم اپنے اندر اللہ جیسے اخلاق پیدا کرو — کا عملی مظاہرہ ہونے لگتا ہے۔

قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ
وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ
وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ
تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ
تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ
وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ
فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ؕ

"اے پیغمبر ایمان والوں سے یہ بات کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے تمہارے بھائی تمہاری بیویاں تمہاری برادری تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا ڈر ہے اور تمہارے رہنے کے پسندیدہ مکانات (یہ ساری چیزیں) تمہیں اللہ سے اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں تو اللہ کے حکم کا انتظار کرو (جو اس تن آسانی اور دنیا طلبی پر آنے والا ہے)"

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اللہ کا حکم قومی زندگی کی موت اور ذلت و خواری کی شکل میں ظاہر ہوگا جیسی تبدیلی ہوگی اسی کی کمی اور بیشی کے لحاظ سے یہ حکم لاگو ہوتا رہے گا۔

لَّا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ
وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ
أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ
أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ

"یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والوں کو آپ اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت کرتا ہوا پائیں اگرچہ وہ دشمن ان کے آباء و اجداد۔ آل اولاد۔ بھائی بند اور کنبہ قبیلہ ہی کے کیوں نہ ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں

وَاَیَّدَھُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡهُ ۵۹/۲۲ ایمان قایم ہو چکا ہے

حقیقی ایمان انسان کے قلب و وجدان، عقل و فکر، ارادہ و تصرف، قول و فعل، دوستی و دشمنی غرض ساری زندگی پر چھایا ہوا ہوتا ہے۔

قومی زندگی میں حقیقی ایمان کے لئے تربیت ضروری ہے

مذکورہ آیتوں میں جس ایمانی کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے قومی زندگی میں اس کیفیت کا پیدا ہونا نہایت دشوار امر ہے اس میں اس وقت تک کامیابی ناممکن ہے جب تک تربیت کا باقاعدہ اور ٹھوس نظام نہ ہو قرآن حکیم نے اسی بنا پر تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کو داعیِ انقلاب کی بعثت کا اہم مقصد بتایا ہے (ویزکیھم) اور اسی بنا پر کہا گیا ہے

قد افلح من زکٰھا وقد خاب من دسٰھا ۹۱ "وہ شخص کامیاب رہا جس نے اپنے کو برائیوں سے صاف کیا اور وہ ناکام رہا جس کو برائیوں نے دبا لیا"

جن لوگوں کے سامنے انقلاب کی تاریخیں ہیں وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ دنیا کے ہر انقلاب کی لپٹت پناہی ذہنی تبدیلی اور اخلاقی تربیت کرتی رہی ہے، اسی سے قومی زندگی میں نظم و ضبط پیدا ہوتا ہے اور اسی سے شخصیت کی تنظیم ہوتی ہے عہ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انقلاب کی

عہ فرانسیسی مصنف و مفکر موسیو ڈامتن نے اپنی کتاب نظام حال ج ۲ میں تربیت کے مسئلہ پر نہایت قیمتی بحث کی ہے اور اس کو بقار اور ارتقار کے لئے مدار قرار دیا ہے "روح الاجتماع" میں بھی اس پر کافی بحث موجود ہے۔

یورپ کے انقلاب میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ ذہنی تبدیلی اور اخلاقی تربیت ہے ۱۳۱۴ء میں ہراگیو نامی مجدد ملت پیدا ہوا اور اس نے بہت کچھ اصلاح کی کوششیں کیں ۱۵۰۰ء میں ہالینڈ میں ہنری ہفتم کے زمانہ میں "اراسمیس" نامی مصلح دین پیدا ہوا پھر ۱۵۲۰ء میں لوتھر نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اسے مستقل تحریک کی شکل دے دی یہ واقعہ دنیا کے مسلمات میں سے ہے کہ یورپ کی تمام ذہنی اور علمی ترقیوں کا دور مذہبی اصلاح سے شروع ہوا ہے لوتھر اور کلیسا میں بنا، نزاع یہ تھی کہ حق کا معیار کیا ہے؟ کتاب اللہ یا پوپ کا اجتہاد۔ اور اللہ کی کتاب پڑھنے اور سمجھنے کے لئے ہے یا اس لئے ہے کہ سب کچھ پوپ پر چھوڑ دیا جائے۔ اور نجات کا مدار ایمان پر ہے یا پوپ کی سندِ مغفرت پر ہے غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس نزاع میں پوپ اور کلیسا کی طرف سے لوتھر پر جو الزام لگائے گئے تھے ان میں سب سے بڑا یہ الزام تھا کہ وہ اسلام کا پیرو ہو گیا ہے اور قرآن کے مطالعہ سے اس میں یہ گمراہی پیدا ہو گئی ہے۔ (اڈورڈ ہسٹری آف دی ریفارم باب سوم از ترجمان القرآن ج ۲)

چوں کہ یورپ کے انقلاب میں اخلاقی تربیت کا باقاعدہ اور مسلسل پروگرام زیادہ دنوں نہ باقی رہ سکا تھا اس

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کامیابی اور استحکام کا مدار صرف افراد کی تربیت پر ہے جس قدر افراد کی تربیت کی جاتی ہے اسی قدر انقلاب میں استواری اور پائداری پیدا ہوتی ہے اس خصوص میں فلسفۂ تاریخ کا درج ذیل مسلمہ فیصلہ قابل ذکر ہے۔

"قومیں خطیبانہ بلند آہنگیوں اور جذبات انگیز استعارہ طرازیوں سے نہیں بنتی ہیں بلکہ اپنی تاریخی ماضی کے بعد افراد کی اعلیٰ ذہنی و اخلاقی قابلیتوں سے بنتی ہیں"۔ [۱]

ایمان پیدا ہونے کے بعد جان اور مال کا سودا ہو جاتا ہے

ایمان کی حقیقت سمجھنے کے لئے درج ذیل آیت خاص اہمیت رکھتی ہے

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ	بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے اس قیمت پر ان کی جانیں بھی خرید لی ہیں اور ان کا مال بھی کہ ان کے لئے بہشت کی جاودانی زندگی ہے چنانچہ وہ کسی دنیوی مقصد میں نہیں بلکہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اس جنگ میں وہ مرتے بھی اور مارتے بھی ہیں یہ وعدہ اللہ کے ذمہ ہو چکا ہے اور توراۃ۔ انجیل اور قرآن تینوں کتابوں میں یکساں طور پر اس کا اعلان ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لئے جلد مضر اثرات نمایاں ہونے لگے جس سے ایک طرف تو تقریباً تمام نوآبادیات میں تہلکہ مچ گیا اور ترقیات کی اسکیموں میں ان کے مرہونِ منت ہونے کے باوجود عام لوگوں کو خود مختاری میں عافیت نظر آنے لگی اور دوسری طرف "ردعمل" کے طور پر "ایشیا" میں ایک دوسرے انقلاب کی بنیاد پڑی۔ چونکہ یورپ کی پشت پناہی مذہب کر رہا تھا اور اس حقیقت کو انقلاب روس کے خداوندوں نے نہایت باریک بینی سے دیکھ لیا تھا اس لئے نئے دور کے آغاز میں مذہب سے بے توجہی برتتے ہوئے ان لوگوں نے دوسری راہوں سے ذہنی اور اخلاقی تبدیلیاں کیں اور کسی حد تک انقلاب کو کامیاب بنایا لیکن اس میں کمال یہ دکھلایا کہ لامذہبیت کو مذہب بنا کر پیش کیا جس کی بنا پر لوگوں نے مذہب کی طرح نہایت جوش و خروش کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ۔۔۔ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

[۱] از فلسفۂ اجتماع

پس مومنو تمہیں اس سودے پر خوشیاں منانا چاہیئے (۹/۱۱۱)

کیوں کہ یہ بہت بڑی کامیابی ہے عہ

اس آیت میں ایمان والی زندگی کا عجیب و غریب فلسفہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ کہ حقیقی ایمان پیدا ہونے کے بعد نہ جان اپنی رہ جاتی ہے اور نہ مال اس طرح پر کہ ہر ایک کا سودا ہو جاتا ہے اس کی قیمت طے ہو جاتی ہے اب مومن کا فقط اتنا کام باقی رہتا ہے کہ اسباب حوالہ کر کے اس کی قیمت وصول کر لے۔

ترک جان و ترک مال و ترک سر — در طریق عشق اول منزل است

یہ طرزِ تعبیر نفسیاتی لحاظ سے کس قدر دور رس نتائج کا حامل ہے؟ اور کیا کوئی قوم زندگی کے بارے میں ایسا فلسفۂ حیات اپنانے کے باوجود ذلیل و خوار اور ہلاک ہو سکتی ہے؟

حقیقی ایمان ہجرت جہاد اور نصرت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے

اسی بنا پر مومن کے واسطے مندرجہ ذیل آیات میں ہجرت۔ جہاد اور نصرت کو لازمی قرار دیا گیا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ حقیقی ایمان کا مدار اور موقوف علیہ بتایا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا (۸)	جو لوگ ایمان لائے اللہ کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا۔ جہاد کیا۔ لوگوں کو پناہ دی اور ان کی مدد کی حقیقت میں یہی سچے مومن ہیں۔
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۴۹/۱۶)	ایمان والے وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہیں پڑے اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کیا یہی لوگ سچے ہیں

عہ یہاں اس شبہ کی گنجائش نہیں کہ بغیر مال دیکھے ہوئے اس کا سودا کیسے ہو گیا کیوں کہ ایک مدت تک نسلِ انسانی کے باپ حضرت آدمؑ کو ٹریننگ کے لئے وہیں رکھا گیا تھا اور معراج میں رسول اللہ کو بحیثیت کمپنی کے ڈائرکٹر کے دکھا دیا گیا تھا یہ دونوں شخصیتیں ایسی ہیں کہ ان کا دیکھنا گویا سب کا دیکھنا ہے ۱۲۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا	جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ	اور جان و مال سے جہاد کیا ان کے لئے اللہ کے نزدیک
اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ وَاُولٰٓئِکَ	بڑا درجہ ہے اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔
ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۹/۲۱	

تینوں آیتوں میں بالترتیب "ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا"، "ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ" اور "ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ" سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہجرت، جہاد اور نصرت کے بغیر نہ تو حقیقی ایمان کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی قوم کامیابی کی منزل سے ہم کنار ہو سکتی ہے۔

انھیں تینوں کے ذریعہ قومیں عروج اور بقا حاصل کرتی ہیں | اس سلسلہ میں اگر آپ دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہر قوم اپنے عروج و بقا کے لئے انھیں تینوں کو کسی نہ کسی شکل میں اپناتی ہوئی نظر آئے گی۔

ہجرت ۱۔ مقصد کی خاطر ترک و اختیار کی کسوٹی پر پورا اترنا حتی کہ گھر بار چھوڑنے کی نوبت آجائے تو اس سے بھی دریغ نہ کرنا۔

نصرت ۲۔ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا اور مشکلات و مصائب کے وقت انھیں سنبھالے رکھنا یعنی زندگی کی تشکیل باہمی تعاون و تشارک اور ایثار و قربانی کی بنیادوں پر ہونا۔

جہاد ۳۔ مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کی انتہائی جد و جہد کرنا ہاتھ پاؤں سے اسی کے لئے دوڑ دھوپ کی جائے، زبان و قلم سے اسی کی تبلیغ کی جائے عقل و دماغ سے اس کے لئے تدبیریں سوچی جائیں غرض تمام امکانی وسائل اس بارے میں صرف کئے جائیں اور ہر مزاحمت کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا جائے حتی کہ جب جان کی بازی لگانے کا وقت آجائے تو اس میں بھی کسی طرح کا دریغ نہ کیا جائے۔

ایں شربت عاشقی ست خسرو | بے خون جگر چشید نتواں

جہاد کا مفہوم قتال سے بہت زیادہ وسیع اور عام ہے، بدقسمتی سے لوگوں نے اس کو قتال کا ہم معنی سمجھ لیا ہے جس کی بنا پر چند در چند غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں اور بالآخر مدافعانہ اور

جارحانہ کی تقسیم پر مجبور ہوئے ہیں حالاں کہ غور سے دیکھا جائے تو یہ ایسی فطری حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ دنیا کی ہر قوم اس کی محتاج ہے اور اسی پر عمل کرکے وہ اپنے عروج و بقار کی منزلیں طے کرتی ہے

ابو بکر صدیقؓ نے خلافت کی سب سے پہلی تقریر میں فرمایا تھا

"اے لوگو غور سے سن لو دنیا کی جو قوم جہاد کرنا ترک کر دیتی ہے اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل و خوار اور رسوا کر دیتا ہے۔"

درج ذیل آیت سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۳۹/۹

اے ایمان والو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں قدم اٹھاؤ تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین پکڑ لیتے ہیں کیا تم آخرت کے مقابلہ میں دنیوی زندگی پر ریجھ گئے ہو حالانکہ دنیوی زندگی کی متاع تو اس کے مقابلہ میں بہت تھوڑی ہے اگر اس راہ میں قدم نہ اٹھاؤ گے تو یاد رکھو کہ اللہ تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کر دے گا اور تمہاری جگہ کسی دوسرے گروہ (قوم) کو لا کھڑا کرے گا اور پھر تم اس کا کچھ نہ کر سکو گے وہ ہر شے پر قادر ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی حقیقت اور ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس موقع پر قابلِ لحاظ نکتہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے "جہاد فی سبیل اللہ" کا حکم دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ساری جد و جہد فتنہ و فساد کے ختم کرنے اور رحمتِ الٰہی کو عام کرنے کے لئے کی جائے نہ کہ ذاتی و قومی اقتدار اور ملک گیری کے لئے جیسا کہ دنیا کی قوموں اور حکومتوں کا دستور ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ

جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ و فساد نہ رہے اور اللہ کا

الدِّیْنُ لِلّٰہِ ۲/۱۹۰ راج قائم ہو جائے۔

جہاد کی غرض و غایت داعیِ انقلابؐ نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا (الحدیث) تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔

نفسانی جذبات اور انتقامی جوش کے ماتحت جہاد کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے بلکہ صرف "اعلاء کلمۃ اللہ" کی خاطر اللہ کی مرضی اور اس کے مقررہ اصول کے مطابق کیا جائے۔

چنانچہ اس بارے میں جو اصول و ضوابط مقرر ہیں اور دورِ اول کے مسلمانوں نے جس طرح اس کو عملی جامہ پہنایا ہے اُس سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ "جہاد فی سبیل اللہ" فتنہ و فساد کے ختم کرنے کا بہترین ذریعہ اور رحمتِ الٰہی کو عام کرنے کا بہترین وسیلہ ہے جس کے بغیر نہ صالح تمدن پیدا ہو سکتا ہے اور نہ نشوو ارتقاء کی منزلیں طے ہو سکتی ہیں۔

یورپ کے متعصب مؤرخوں نے جہاد کے بارے میں ناقابلِ معافی حد تک تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا ہے اور اسلام پر یہ غلط الزام لگانے کی ناکام کوشش کی ہے کہ وہ وحشت و بربریت کا مذہب ہے اور اس کی اشاعت میں تلوار کو زیادہ دخل رہا ہے اسی کی نقالی آج کل کے متعصب اور حقیقت سے ناآشنا مؤرخ کر رہے ہیں۔

ان مؤرخوں نے نہ تو کبھی یہ جاننے کی کوشش کی کہ جہاد کی حقیقت کیا ہے؟۔ اور قومی زندگی میں اس کا کیا مقام ہے؟ نیز شرعی نقطۂ نظر سے کسی کو مسلمان بنانے کے لئے جہاد کرنا جائز ہے یا نہیں اور نہ قرآن حکیم کے اس اعلان پر دیانتداری کے ساتھ غور کیا

لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ دین کے معاملہ میں جبر اور زبردستی نہیں ہے

بلکہ اگر کسی نے تنگ نظری اور تعصب کی بناء پر ابتداء میں کوئی بات لکھ دی اور وہ لوگوں کے جذبات اور نفسیاتی کیفیات کے موافق ہوئی تو بس آخر تک اس کی نقل در نقل ہوتی رہی اور وہی بات لوگوں کی دین و ایمان بن گئی۔

اجتماعیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ قومی تعصب نے دوسری قوم کے تاریخی حقایق پر پردہ ڈالنے

میں کس قدر چابکدستی دکھلائی ہے۔

اور اس حقیقت سے تو "علم النفس" کا ادنیٰ طالب علم بھی واقف ہے کہ قومی زندگی کے اصل وصف دو[2] ہیں (۱) ذی شعور ذات اور نقاد ذہن کا معدوم ہو جانا۔ (۲) احساسات وجذبات کا قوم اور جماعت کے مقصد وحید کے اندر فنا ہو جانا[1] ایسی حالت میں جامد دماغ اور مقلد طبیعتوں نے جہاد کے خلاف کچھ لکھ دیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ان لوگوں میں نہ تو قوت وجسارت تھی اور نہ روشن دماغی اور تنقیدی نظر کہ قومی وملکی تمام حد بندیوں سے گذر کر چشمۂ آفتاب کو اس کی اصلی اور صحیح شکل میں دیکھ سکتے۔

تاریخ کے لکھنے میں جن لوگوں نے ذرا جسارت سے کام لے کر اپنی قوتِ فکری پر زور دیا ہے ان کے سامنے جہاد کی اصل حقیقت واضح ہو گئی ہے چنانچہ یورپ کے دوسرے بہت سے مؤرخوں (ڈاکٹر گبن، ڈاکٹر موسیو سیدیو، سیل صاحب، الفنسٹن وغیرہ) نے جنھوں نے اسلامی تہذیب وتمدن اور اجتماعیات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے انھوں نے نہ صرف یہ کہ اسلام اور جہاد کے بارے میں بیش بہا معلومات فراہم کئے ہیں بلکہ ان متعصبین کے اقوال اور غلط استدلال کا دندان شکن جواب دیا ہے۔

چند واقعات وحقایق سے استشہاد

ذیل میں چند واقعات اور اعداد وشمار دئے جاتے ہیں۔

(۱) یرموک اور اجنادین کے میدانوں میں بازنطینی حکومت سے مقابلہ ہو رہا تھا لیکن شام کے لوگ محبت کے پیام اور رسد بھیج رہے تھے بُصرا کے لوگوں نے اپنے دروازے خود ہی کھول دئے تھے حمص کے باشندوں نے مسلمانوں کی آمد کے لئے منتیں اور سماجتیں کی تھیں طرابلس کی آبادیاں پہلے ہی سے منتظر تھیں صور کے پھاٹک بند ہی نہیں کئے گئے تھے۔ جب مصر کا رُخ ہوا تو وہاں کے عیسائیوں نے آگے بڑھ کر استقبال کیا[2]۔ اسی طرح تاریخ میں بہت سی ان قوموں کا ذکر ملتا ہے جن پر مسلمانوں نے نہ کبھی فوج کشی کی اور نہ اس کا خیال ظاہر

---

[1] روح الاجتماع ص۵۶ [2] ترجمان القرآن ج ۲

اس کے باوجود لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے۔

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ لوگوں نے سمجھ لیا تھا کہ اسلام خوف و دہشت کی طاقت نہیں ہے بلکہ رحمت و عدالت کا پیام ہے جس کی بنا پر وقت کی تمام مظلوم آبادیوں نے نجات دہندہ سمجھ کر اسکو خوش آمدید کہا تھا۔

(۲) تاتاریوں نے پچاس سال تک جس شدت کے ساتھ اسلام کا مقابلہ کیا اور مسلمانوں اور اسلامی حکومتوں کو تباہ و برباد کیا اس سے تاریخ کا طالب علم اچھی طرح واقف ہے لیکن حکومت و اقتدار کے زمانہ میں ان لوگوں کا اسلام قبول کرنا یعنی حاکم کا محکوم کے دین میں داخل ہونا اسلام کی حقانیت و صداقت کا معمولی کارنامہ نہیں ہے

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

(۳) ہندوستان میں آٹھ سو سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی اس کے باوجود مسلمان اقلیت میں ہیں اگر اسلام کی اشاعت میں تلوار کو دخل ہوتا تو آج عددی پوزیشن یہ نہ ہوتی اور اقلیت و اکثریت کی بحث کبھی کی ختم ہو گئی ہوتی۔

(۴) اسلام میں قانونی نقطۂ نظر سے مسلمان بنانے کے لئے جہاد کرنا جائز نہیں ہے کیوں کہ یہ شکل "لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن" کے منافی ہے اور ان بنیادی اصولوں کے خلاف ہے جو اسلام نے جہاد کے لئے مقرر کئے ہیں تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

چند ماہرین کے اقوال اور تاریخی شہادتیں یہ ہیں

چند ماہرین کے اقوال اور تاریخی دستاویزی شہادتیں حضرت عمرؓ کے آخری زمانہ یا حضرت عثمانؓ کے ابتدائی زمانہ میں ایک نسطوری پادری نے جو تاثرات سپردِ کاغذ کئے تھے وہ اتفاق سے محفوظ ہیں ان سے اسلام کی عالمگیر رحمت اور افادیت کا پتہ چلتا ہے نیز یہ کہ اسلام کی نشر و اشاعت میں کس بات کو دخل رہا ہے؟

وہ یہ ہیں

"یہ طائی (عرب) جن کو خدا نے آج کل حکومت عطا کی ہے وہ ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں لیکن وہ

عیسائی مذہب سے مطلق برسرپیکار نہیں بلکہ اس کے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں ہمارے پادریوں اور مقدس لوگوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجاؤں اور کلیساؤں کو جاگیریں عطا کرتے ہیں۔"[1]

اسی طرح کی ایک اور شہادت زمانۂ حال کے ایک متعصب رومن کیتھولک پادری نے کلیسائی تاریخ و جغرافیہ کے قاموس میں یہ دی ہے۔

"مسلمان عربوں کو یعقوبی (جاکوبائٹ) عیسائیوں نے بھی اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا مسلمانوں کی سب سے اہم جدت جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا یہ تھی کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک خود مختار وحدت قرار دیا جائے اور اس مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیاوی اور عدالتی اقتدارات عطا کئے جائیں۔"[2]

غور فرمایئے۔ خود مختار وحدت کے تصور کو دنیا کے سامنے سب سے پہلے عملی طور پر اسلام نے پیش کیا ہے اور وہ بھی اُس دور میں جس کو آج کل کے متجددین غیر مہذب و نا تربیت یافتہ دور کہتے ہیں آج کل کی مہذب و تربیت یافتہ دنیا غیر مذہب والوں کے ساتھ اس قسم کی وسعت اور فراخ حوصلگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہے۔

فرانسیسی مصنف "موسیو سیدیو" نے اپنی کتاب تاریخ عرب میں لکھا ہے

"دین اسلام کو وحشی مذہب کہنے والوں کی نابینائی قلب اور حق سے کان بند کر لینے اور راہ راست سے ہٹ کر پھسل جانے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی کہ قرآن مجید میں ایسی آیتیں ہیں جو عربوں کی گذشتہ عاداتِ بد کی ناسخ ہیں مثلاً انتقام کا جذبہ کھلم کھلا ظلم کرنا جو یورپ میں پہلے بھی تھا اور ڈوئل Duell کی صورت میں اب بھی موجود ہے۔"[3]

پروفیسر "واکر" نے قانون بین الممالک کی تاریخ لکھتے ہوئے یہ ملاحظہ پیش کیا ہے

"متمدن اور مہذب سلطنتوں پر وحشیوں کا دھاوا بولنا اور غالب آکر سلطنت و حکومت کا مالک بن جانا تاریخ کا ایک عادتی واقعہ ہے لیکن جرمنوں، تاتاریوں وغیرہ وحشیوں کے برخلاف عجیب بات یہ ہے کہ

---

[1] عہد نبوی میں نظام حکمرانی ص۱۴۸ بحوالہ پادری اسمعانی اور دخوبے کی کتاب [2] حوالہ بالا بحوالہ فرانسیسی قاموس [3] تاریخ عرب ص۱۰۷

عرب کے بدو جب یک بیک اپنے صحرائے اعظم سے بیرون میں امنڈنے لگے (خلافت راشدہ کے زمانہ میں) تو ان عربی فاتحین کو عام تصور کے وحشی فاتحین میں کسی طرح نہیں شامل کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ان وحشی بدوؤں میں پہلے ہی دن سے ان کے مفتوحوں سے بھی بڑھ کر تہذیب اور اخلاقِ حسنہ نظر آتے ہیں۔[1]

ذیل میں چند اعداد و شمار دئے جاتے ہیں جن سے جہاد کی حقیقت واضح ہونے میں مدد ملے گی

جنگ سے ہلاک شدگان کا تقابلی مطالعہ

داعیِ انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی دس سالہ زندگی میں ایک نہیں چوبیس[24] جہاد کئے اس عرصہ میں آپ کا اقتدار شہر مدینہ سے پھیل کر جزیرہ نمائے عرب اور جنوبی فلسطین کے دس لاکھ مربع میل کے رقبے پر محیط ہوگیا تھا (فتوحات کی روزانہ اوسط ۲۷۵ میل ہوتی ہے) لیکن اس پوری فتح میں دشمن کے بمشکل ڈھائی سو آدمی مارے گئے اور اگر بیر معونہ میں دھوکے سے اور جنگ احد میں فوجی نافرمانی کے نتیجہ میں بھگ دوڑ کے وقت جو ۱۳۰ مسلمان شہید کئے گئے تھے انھیں مستثنیٰ کر دیا جائے تو مسلمان شہداء کی تعداد بمشکل ۱۰۰ تک پہنچتی ہے۔[2]

ان لڑائیوں میں تمام اضافتوں کو حذف کر کے شہداء اور مقتولین کی جو زیادہ سے زیادہ تعداد بتائی جاتی ہے وہ ۱۰۴۸ ہے اس میں مسلم شہداء کی تعداد ۱۲۵ ہے اور دشمن مقتولین کی تعداد نو سو تیئیس ۹۲۳ ہے جب کہ مفتوحہ علاقہ کی آبادی یقیناً کئی ملین تھی اور آج کی طرح فوجی وغیر فوجی کی تقسیم نہ تھی بلکہ کل آبادی فوجی ہوتی تھی۔

ان اعداد و شمار کے مقابلے میں فرانس اور امریکہ کو جمہوریت قائم کرنے میں اور انگلستان کو پارلیمنٹ کا نظام اپنانے میں جتنے خون بہانے پڑے اور پچھلی جنگ عظیم اور حال کی جنگ کوریا وغیرہ میں جو خون کی ہولی کھیلی گئی ان کے دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ واقعی رحمتِ الٰہی کا ایک پہلو اور فتنہ و فساد ختم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یورپ کے دورِ جاہلیت میں اصلاحی تحریک کے روکنے کے لئے جو محکمہ احتساب قائم کیا گیا تھا اس کے احکام سے جو نفوس ہلاک کئے گئے "جان ڈیون پورٹ" نے اپنی کتاب اپالوجی آف محمد اینڈ قرآن میں ان کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی ہے جو عیسائیوں کی عیسائیوں کے ہاتھوں ہوئی تھی صرف اسپین میں اس محکمہ کی کارگزاری کا خلاصہ یہ ہے ۳۱۹۱۲ افراد زندہ جلائے گئے ۱۷۶۵۹ افراد کی تصویریں جلائی گئیں اور ۲۹۱۲۵۰

[illegible]

ندوۃ المصنفین کی نئی کتاب

تاریخ ادبیات ایران (اُردو)

مُصنّفہ

ڈاکٹر رضازادہ شفق پروفیسر ادبیات تہران یونیورسٹی - تہران - ایران

مترجم

سید مبارزالدین رفعت ایم - اے (عثمانیہ) حیدرآباد - دکن

از

(پروفیسر ہیرالال چوپڑہ ایم - اے - کلکتہ یونیورسٹی)

یوں تو ادبیات ایران پر ہر زبان میں کئی کتابیں لکھی جاچکی ہیں جن کی وساطت سے ایران کا ادب دنیا بھر کے ادب کے ذخیروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور جن میں مشہور مستشرق پروفیسر براؤن کی چار جلدوں میں انگریزی کی کتب ایک تاریخی کارنامہ ہیں جو ان کی چالیس سالہ ادبی کاوش کا نتیجہ ہیں اور اس کے ماورائے شعر العجم کے پانچ حصص مصنفہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نیز شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کی سخندان پارس بھی اسی زمرے کی اہم کڑیاں ہیں لیکن جو بات کہ ڈاکٹر رضازادہ شفق نے اپنی جامع اور مانع کتاب میں پیدا کی ہے وہ کسی اور تاریخ میں نہیں آسکی۔ ایران کی قبل از تاریخ زمانے کی ادبی پژوہش کو لے کر ایران کے ادب کا ڈھانچہ کھڑا کیا گیا ہے اور مابعد کا بتدریج ارتقاء فارسی زبان کو کن صلاحیتوں سے پُر کر کے زبانوں کے بازار میں لاکر کھڑا کر دیتا ہے اس ساری حکایت کو نہایت دل پذیر انداز سے ڈاکٹر شفق نے فارسی میں ادا کیا۔ براؤن کی کتاب ۱۹۲۴ء تک ختم ہو جاتی ہے۔ شعر العجم میں فقط فارسی شعر پر بحث کی گئی ہے سخندان پارس میں

فارسی الفاظ کی ساخت کے متعلق لکھا گیا ہے لیکن کتاب زیرِ نظر میں ادبیات ایران کے سب پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ کتاب کی مقبولیت کی یہ کافی دلیل ہے کہ ایران کی وزارت معارف یا تعلیم نے اسے سکولوں اور کالجوں کے لئے نصاب مقرر کیا ہے اور اس کے کئی ایڈیشن چھپ کر بک چکے ہیں۔

مدت سے ہندستان میں یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ کوئی ایسی ہی بلند پایہ کتاب اس مضمون کی اُردو میں شائع ہونی چاہیئے۔ لیکن حالات کی نامساعدت کو دیکھ کر کوئی شخص اس میدان میں گامزن ہونے کو تیار نہ تھا۔ انگریزی زبان میں دو تین نصابیے تیار ہوئے لیکن اس سے عاشقانِ فارسی کی تشنگی فرو نہ ہو سکتی تھی۔ ندوۃ المصنفین ہر اُردو داں کے تشکریے کی مستحق ہے کہ اس ادارے نے ایک ایسی گراں مایہ کتاب اپنے سلسلۂ مطبوعات میں شائع کی ہے جس کی قدر و قیمت مصدقہ اور مسلمہ ہے۔ بہترین لکھائی چھپائی کے ساتھ نہایت واجبی قیمت پر ایران کے ادبیات کی پوری تاریخ کو پڑھنے والوں کو دے دیا ہے۔ ابتدائی دور سے لے کر زمانہ معاصر تک کی فارسی نظم و نثر پر مثالیں دے کر بحث کی گئی ہے۔ ہر شاعر کے اور ہر مصنف کے پورے حالات کے ساتھ اس کے کلام یا تصنیف کا نمونہ بھی دیا گیا ہے جس سے پڑھنے والوں کو اس کے اندازِ تحریر یا اسلوب کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ اس مضمون پر اس سے بہتر کتاب ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہے۔ ہندوستانی شعرا اور نثر نویسوں کے حالات بھی مندرج ہیں۔ سید مبارز الدین صاحب رفعت پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے ایک مستقل ادبی خدمت سر انجام دی ہے کہ اس بیش بہا کتاب کا اردو ترجمہ کر کے اردو دانوں کو ممنونِ احسان کیا ہے۔ ترجمہ کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ تسلسل اور روانی کو کہیں ٹوٹنے نہ دے اور رفعت صاحب نے اس چیز کو ملحوظ رکھا ہے کہ کہیں بھی سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔

ہندوستان کی تمام زبانوں نے فارسی زبان سے اس قدر استفادہ حاصل کیا ہے کہ آج فارسی کے الفاظ بنگالی، گجراتی، پنجابی، مراٹھی اور دیگر زبانوں میں بافراط پائے جاتے ہیں اور اُردو تو فارسی کے سائے میں ہی پلی اور بنی ہے لہذا ہندوستان میں فارسی ادب کو بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے

آج سے ربع صدی پیشتر ہندوستان کی ابتدائی تعلیم فارسی کی گلستاں بوستاں نیز شاہنامہ سکندرنامہ، مثنوی مولانا روم، حافظ اور عمر خیام سے شروع کی جاتی تھی چنانچہ ہر وہ شخص جو تعلیم یافتہ کہلاتا تھا اس زبان کی خوشہ چینی پر فخر اور ناز کرتا تھا۔ دنیا کے ادب میں کوئی بھی ایسی زبان نہیں ہے جس میں مندرجہ بالا شعراء کے کلام کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو لہٰذا ان کے حالات، اردگرد کا ماحول، ایران کے ادب کی ہمہ گیری ان سب باتوں کے مطالعہ پر اس شخص کے لئے لازم ہے جو اپنے آپ کو مہذب اور متمدن کہلانا چاہتا ہے۔

اس کے علاوہ آج بھی فارسی میں چاشنی اور شیرینی دیگر زبانوں سے بڑھ چڑھ کر ہے اور فارسی ادب کی تاریخ اپنی وسعت نظر اور فراخ حوصلگی کو ظاہر کرتی ہے کیوں کہ اسلام سے قبل ایران کی زبان الگ اس کا دین الگ اس کا تمدن الگ تھا لیکن اسلام کی آمد سے ایران کی زبان میں عربی کا وہ خوشگوار پیوند لگا اور ایرانیوں نے اس جذب اور شوق سے اسلام اور عربی زبان کو حاصل کیا کہ عربوں کو مات کردیا۔ دنیائے ادب میں ایک نئے دین کے معرض وجود میں آنے کے ساتھ ایک نئی زبان بھی پیدا ہوئی اور اس نے اپنی صلاحیت اور ہمہ گیری کا سکہ ہر شخص کے دل پر بٹھادیا۔ آج فردوسی، نظامی، سعدی، جامی، رومی، حافظ، عطار، خیام اور ہندوستان میں ابوالفضل، فیضی، امیر خسرو، بیدل، غالب، برہمن، عرفی، نظیری، ظہوری، صائب اور اقبال نیز گرامی جیسے شعراء نے دنیائے شعر میں اپنی جدت سے ایک تہلکہ مچادیا۔ جس پر ایران کے علاوہ ہندوپاکستان کو بجا طور پر ناز ہے۔

کتاب زیر نظر سید مبارز الدین صاحب رفعت کے عشق ایران کی بین دلیل ہے جنہوں نے بہت کاوش سے اس کا اس قدر سلیس اور صحیح ترجمہ کر کے ادبیات عالم پر ایک احسان کیا ہے۔

ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں ایم۔ اے تک فارسی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بی۔ اے اور آنرز نیز ایم۔ اے کے امتحانات کے لئے یہ کتاب بہترین نصاب کا کام دے سکتی ہے۔ اردو کے امتحانات میں بھی اگر اس کتاب کو شامل نصاب کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس کی اردو

بھی معیاری اُردو ہے۔ اور اس کے لئے پروفیسر رفعت مستحق مبارک باد ہیں۔

ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کتاب کی اشاعت سے ایک بہت بڑی ادبی خدمت سر انجام دی ہے کہ اس کو اتنے اعلیٰ معیار کے ساتھ چھاپ کر اس قدر ارزاں قیمت پر دینا منظور کیا ہے۔ کیوں کہ اصل فارسی کتاب نیوز پرنٹ پر ٹائپ سے چھپی ہوئی اس سے زیادہ قیمت پر فروخت ہوتی ہے۔ اصل کتاب کا کاغذ بوسیدہ، طباعت درمیانہ ہے لیکن اس ترجمہ کی کتابت اور طباعت نیز جلد اور خوبصورت گرد پوش ہندوستانی طباعت کا ایک اعلیٰ کارنامہ ہیں۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت نہایت واجب ہے اردو اور فارسی کے ہر طالب علم کے لئے اس کتاب کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے۔ بہتر ہو اگر ہماری وزارت تعلیم اس کی دو چار ہزار کاپیاں خرید کر مختلف لائبریریوں اور تعلیمی اداروں کو مہیا کرے۔ سفارت خانہ ایران کو بھی اس کتاب کی تقسیم کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

ضخامت ۶۰۰ صفحات بڑا سائز۔ کتابت، طباعت دیدہ زیب۔ کپڑے کی جلد اور گرد پوش، قیمت مجلد نو ۹ روپے۔ بغیر جلد آٹھ روپے۔

العلم والعلماء

یہ جلیل القدر امام حدیث علامہ ابن عبد البر کی شہرہ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا نہایت صاف اور شگفتہ ترجمہ ہے۔ مترجم کتاب مولانا عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی اس دور کے بے مثال ادیب اور مترجم سمجھے جاتے ہیں، موصوف نے یہ ترجمہ حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا تھا ...... ندوۃ المصنفین سے شایع کیا گیا ہے۔ علم اور فضیلت علم کے بیان، اہل علم کی عظمت اور ان کی ذمہ داریوں کی تفصیل پر خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے آج تک کوئی کتاب اس مرتبہ کی شایع نہیں ہوئی، اس متبرک کتاب کی ایک ایک سطر سونے کے پانی سے لکھنے کے لایق ہے، ایک زبردست محدث کی کتاب اور ملیح آبادی صاحب کا ترجمہ موعظتوں اور نصیحتوں کے اس عظیم الشان دفتر کو ایک دفعہ ضرور پڑھئے۔ صفحات ۳۰۰ بڑی تقطیع قیمت چار روپے آٹھ آنے۔
مجلد پانچ روپے آٹھ آنے

ادبیات

کائنات

(ایک تبصرہ)

از

(جناب فضا ابن فیضی)

روش روش پہ خموشی تھی، جوئبار خموش — نسیم و زہہت و نکہت کے آبشار خموش
غمِ سکوت میں ڈوبا تھا لحنِ ساز ابھی — کہ پر فشاں نہ تھی روحِ نیاز و ناز ابھی
افق سے دور کہیں آفتاب سوتا تھا — اُداس چاند مقدر کو اپنے روتا تھا
نہ ربطِ خاص تھا کچھ رگِ گل کو شبنم سے — یہ زخمِ دل ابھی نا آشنا تھے مرہم سے
کرن سے سینۂ شبنم میں ارتعاش نہ تھا — صدف پہ اپنے گہر کا مقام فاش نہ تھا
تھا جن کا ایک تبسم بہارِ خلدِ بریں — ہنوز وہ گل و لالہ نہاں تھے زیرِ زمیں
نگاہ فیضِ تجلی سے تھی ابھی محروم — کلی کو رازِ شگفتن ابھی نہ تھا معلوم
لہو ہنوز نہ دوڑا تھا نبضِ امکاں میں — کوئی سحر نہ تھی بیدار خاورستاں میں
نہ ایسا فرقِ مراتب دن اور رات میں تھا — بس ایک چاکِ گریباں کائنات میں تھا

فضائے ارض و سما جلوہ آفریں اتنی — یہ کائنات تو پہلے نہ تھی حسیں اتنی
ذرا سی بھی جو ستاروں نے آنکھ جھپکائی — خُمِ اُفق سے نبیذِ سحر چھلک آئی
ہر ایک ڈوبی ہوئی نبض میں لہو آیا — زمیں پہ نیرِ اعظم نے نور برسایا
خود اپنے زخموں کا منہ چومنے لگے مرہم — کرن کی لَو سے دھڑکنے لگا دلِ شبنم
یہ آب و گل کے جھلکتے ہوئے صنم خانے — چلی ہے موجِ ہوا نکہتوں کو بہلانے
چمن میں قافلۂ سبزہ و نسیم آئے — فروغِ نور سے نابود ہو گئے سائے

سرور و کیفیت و رنگ و بو کے مے خانے — چھلک پڑے ہیں دماغ و نظر کے پیمانے
ارم طراز ہے دشت و جبل کی ویرانی — نوا فروش ہے خاموشیوں کی طغیانی
ضمیرِ کوکب و مہتاب تیرہ ناک نہیں — کہ آب و گِل کے گریباں میں کوئی چاک نہیں

انسان عہدِ زریں میں

وہ روحِ حکمت و رنگِ جمالِ یکتائی — حریمِ قدس میں جس کی ہوئی پذیرائی
گمان اس کی جِلو میں یقین تک آئے — کہ جبرئیلِ امیں بھی زمین تک آئے
اسی کی فکر سے ٹوٹا فسونِ تیرہ شبی — بجھا اسی کے نفس سے چراغِ بو لہبی
رہی متاعِ امانت جو سر سبد اس کی — تپ جنوں سے لہکتی رہی خرد اس کی
فرشتہ صید رہا یہ بغیرِ ناوک و تیر — ہیں اس کے زلہ ربا جبرئیلِ پاک ضمیر
کہاں یہ اور کہاں شیوۂ زبونِ حیات — اسی نے عام کیا سوزِ اندرونِ حیات
خرد پہ رازِ دو عالم ہے آشکار اس سے — جنوں ہے جوشِ تپیدن سے ہم کنار اس سے
یقین و علم سے عقبا کو روشناس کیا — ترے وجود سے دنیا کو روشناس کیا
ہر اک نظر تھی گہر سنج و کامراں اس کی — بہار چہرے پہ ملتی رہی خزاں اس کی

انسان عہدِ حاضر میں

سحر گذر گئی خود روشنی کو ٹھکرا کر — پلی ہے رات مہ و کہکشاں کا غم کھا کر
سیاہ راتوں سے سورج ہیں مطمئن کتنے — سیاہیوں کی طرف مڑ گئے ہیں دن کتنے
خود آگہی و خودی کے ایاغ ٹوٹ گئے — ہوائے تند سے لڑ کر چراغ ٹوٹ گئے
غریقِ زہرِ ہلاہل ہوئے سفینہ نوش — خضر کے بھیس میں ہیں کس قدر ضمیر فروش
وہ جس کا سینۂ روشن تھا مایۂ دارِ علوم — وہی ہے اب نفسِ جبرئیل سے محروم
دلوں کے کُنج میں کینے کا سانپ بستا ہے — وہ آدمی ہی ہے جو آدمی کو ڈستا ہے
یہ فکرِ عیش یہ تہذیب و کفر کے ناسور — یہ بے نگاہِ کلیم اور یہ خرابۂ طور
زمیں کے دوش پہ فکر و نظر کے یہ تابوت — یہ مقبرہ ہے الٰہی! کہ عالمِ ناسوت

تمام سعیٔ کرم رائگاں ہوئی تیری
متاعِ سود سپردِ زیاں ہوئی تیری

تبصرے

تفسیر ابن کثیر اردو پارہ نمبر ۱۴ تقطیع کلاں ضخامت ۶۹ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت درج نہیں پتہ :- نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی۔

تفسیر ابن کثیر عربی زبان کی مشہور مفصل اور مستند تفسیر ہے۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب نے اسی کو اردو کا جامہ پہنا کر چھاپنا شروع کیا ہے۔ چودھویں پارہ کا یہ اردو ترجمہ ہمارے پاس تبصرہ کے لئے بھیجا ہے۔ ترجمہ بہت صاف سلیس اور شگفتہ ہے۔ اگر یہ ترجمہ مکمل ہو گیا تو اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ اردو داں طبقہ بھی اس اہم تفسیر کے معانی و مطالب سے واقف ہو سکے گا۔

حیوانات قرآنی از مولانا عبد الماجد دریا بادی تقطیع خورد ضخامت ۱۶۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد دو روپیہ پتہ :- مکتبہ ندوۃ المعارف بنارس۔

قرآن مجید میں جہاں عالم کائنات کی مختلف چیزوں کا ذکر ہے چرند پرند حشرات الارض اور دوسرے جانوروں کا بھی تذکرہ ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں ان تمام حیوانات کو ایک جگہ حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا ہے اور ہر حیوان کے وہ افعال وخصائص جو قرآن مجید میں مذکور ہیں ان کی تشریح و توضیح کرنے کے بعد قرآن میں جس غرض کے لئے ان حیوانات کا تذکرہ آیا ہے اُس کو بیان کیا ہے اور کہیں کہیں علم الحیوانات کی جدید تحقیقات سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب قرآن میں بیان کئے ہوئے حیوانات سے متعلق مفید معلومات کا ایک مفید اور عمدہ مجموعہ بن گئی ہے جو قرآن کے طالب علم کے لئے بہرحال فائدہ سے خالی نہیں۔

مناجات مقبول ترجمہ وشرح از جناب مولانا عبد الماجد دریا بادی تقطیع خورد ضخامت ۱۶۷ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ۲ دو روپیہ پتہ :- عثمانیہ بک ڈپو نمبر ۱۰۲ لور چیت پور روڈ کلکتہ نمبر ۱

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے عربی میں قربات عند اللہ وصلوات الرسول کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں قرآن مجید اور احادیث میں بیان کی ہوئی دعاؤں کا انتخاب مع شرح کے کیا اور مولانا دریابادی نے کئی سال ہوئے اسی کتاب کو اپنی شرح اور عام فہم و سلیس تحشیہ کے ساتھ شائع کیا تھا زیر تبصرہ کتاب اسی کا دوسرا اڈیشن ہے جو کتابت وطباعت کے اعتبار سے بہ نسبت پہلے اڈیشن کے زیادہ بہتر ہے کتاب کی نہ صرف افادیت بلکہ ضرورت و اہمیت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا، کون سا مسلمان ہے جو کسی وقت اور کسی حالت میں بھی بارگاہِ خداوندی میں دعا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتا ہو لیکن موقع کے مناسب دعا معلوم نہ ہونے کے باعث اس دعا پر وہ ثمرہ مرتب نہیں ہوتا جو ہونا چاہیئے۔ اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو جائے گی دعاؤں کی ترتیب ہفتہ کے دنوں کے اعتبار سے ہے آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں مثنوی مولانا رومی سے انتخاب کر کے دعائیں منزل وار لکھی گئی ہیں ہر مسلمان مرد اور عورت کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

معلم الانشاء الجزء الثالث | از مولانا محمد الرابع الندوی تقطیع خورد ضخامت ۲۱۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ:۔ مکتبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

معلم الانشاء جس کے حصہ اول و دوم پر پہلے تبصرہ ہو چکا ہے یہ اسی کا تیسرا حصہ ہے اس میں انشاء یعنی مقالہ نگاری یا مضمون نویسی اور ترجمہ کے اصول و قواعد بتا کر ان کی مشق و تمرین کرائی گئی ہے۔ اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ مقالہ نگاری کی استعداد و صلاحیت ایک خداداد وصف ہے اور اس بناء پر اس میں کامیابی کا انحصار اصول و قواعد کی تعلیم اور ان کی پابندی سے کہیں زیادہ حسنِ ذوق، اور فطری مناسبتِ طبع پر ہے تاہم انشاء کے حسن و قبح کو جانچنے اور اس کی قدریں متعین کرنے کے لئے اصول ضروری ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی پہلے مختلف عنوانات کے ماتحت ایک مقالہ کے اجزاء ترکیبی اور پھر ہر جزء کے لوازم و مقتضیات پر کلام کیا گیا ہے اور اس کو مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ اس کے بعد تمرینات ہیں جو بالعموم مصر کی کتب متداولہ یا اخبارات و رسائل سے

ماخوذ ہیں۔ انشار کی تعلیم کے بعد اردو سے عربی اور عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے پر مختلف اسباق ہیں اور ان کی ترتیب بھی یہی ہے کہ پہلے اصول ترجمہ بیان کئے گئے ہیں اور پھر ان کی مشق کرائی گئی ہے۔ ان تمام تمرینات اور اسباق میں اس بات کا بھی خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ آج کل کی عام مصری ریڈروں کی طرح طوطا مینا کے قصے نہ ہوں بلکہ ایسے اسباق کے ذریعہ تمرین کرائی جائے کہ متعلم میں اسلامی سیرت و کردار کے نقوش بھی ابھر سکیں۔ غرض کہ ادبی۔ تعلیمی اور اخلاقی ان تینوں حیثیتوں کے اعتبار سے یہ کتاب اس لائق ہے کہ مدارسِ عربیہ اس کو نصاب میں شامل کریں اور اس سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھائیں۔

ذکرِ غالبؔ | از جناب مالک رام صاحب ایم۔ اے تقطیع متوسط ضخامت ۲۸۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت تین روپیہ پتہ :۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔

جناب مالک رام صاحب غالبیات کے مشہور فاضل ہیں اور ان کی یہ کتاب بھی غالبؔ کے قدر شناسوں کے حلقہ میں بڑی مقبول ہے۔ اگرچہ غالبؔ پر اب تک بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی جاچکی ہیں لیکن جہاں تک کہ مرزا کی لائف کا تعلق ہے یہ کتاب سب پر بھاری ہے اور سچ مچ خیر الکلام ماقل ودل کا مصداق ہے مرزا پر ریسرچ کا سلسلہ برابر جاری ہے جس کی وجہ سے بعض پرانے بیانات نظرثانی کے محتاج اور دوراول کی بعض تحقیقات مشکوک ہوگئی ہیں لائق مصنف نے کتاب کے اس تیسرے اڈیشن میں کچھ اضافے بھی کئے ہیں اور جدید تحقیقات کی روشنی میں اپنے بعض قدیم استنباطات وخیالات کا از سرِ نو جائزہ بھی لیا ہے۔ امید ہے کہ سابقہ دو اڈیشنوں کی طرح یہ تیسرا اڈیشن بھی مقبول ہوگا اور مرزا کے قدردان اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

قرآنی آئینہ | از جناب شیخ چاند محمد صاحب بی۔ اے تقطیع کلاں ضخامت ۸۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸۰ ر پتہ :۔ قرآنی آئینہ اکیڈمی آرام باغ روڈ کراچی۔

یہ قاعدہ بچوں کی نفسیات اور ان کے ذہن کے تدریجی ارتقار کی رفتار کو پیش نظر رکھ کر اس طرح لکھا گیا ہے کہ ایک متوسط ذہن کا بچہ بغیر کسی بار کے بہت جلد حروف شناس ہوجاتا ہے اور

ساتھ ہی صحیح مخارج کے ساتھ حروف کو ادا کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خاص قرأت قرآن سے متعلق بعض خاص خاص قاعدے اور تنبیہات بھی ہیں جن کی رعایت ملحوظ نہ رکھنے سے بڑا گناہ ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی علامات اوقاف اور ان کی مشقیں بھی ہیں اس میں شک نہیں کہ یہ قاعدہ قرآن خوانی کی ابتدائی تعلیم کے لئے بڑا مفید ہے۔ مکاتب کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

ہماری دنیا حصہ اول و دوم | از جناب افضل حسین صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی تقطیع خورد ضخامت حصہ اول ۹۶ صفحات قیمت ۹ ر ضخامت حصہ دوم ۱۲۸ صفحات قیمت ۱۲ ر کتابت و طباعت بہتر پتہ:۔ مکتبۂ جماعت اسلامی ہند رام پور (یوپی)

جماعت اسلامی ہند نے مسلمان بچوں اور بچیوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے اسکول کے مختلف مضامین پر خود اپنی کتابیں شائع کرنے کا جو مفید سلسلہ شروع کیا ہے یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی ہے ۳۱ و ۳۲ ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب جغرافیہ پر ہے اب جغرافیہ کا فن بہت ترقی کر گیا ہے اور اس کی خشکی دور کر کے بچوں کے لئے ایسے افسانوی انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ بچے اس سے بہت جلد مانوس ہو جاتے ہیں اور کہانی ہی کہانی میں ان کو بہت سے جغرافیائی معلومات حاصل ہو جاتے ہیں چنانچہ جغرافیہ کے موجودہ ترقی یافتہ طریق تعلیم سے فائدہ اٹھا کر یہ دونوں حصے بھی اسی طریق پر مرتب کئے گئے ہیں اور کہانیوں میں مسلمان بچوں کی نفسیات اور ان کے خانگی و مذہبی ماحول کا لحاظ رکھا گیا ہے زبان صاف و سلیس اور عام فہم ہے ترتیب موزوں اور مناسب ہے یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسلامی مکاتب ابتدائی جماعتوں میں جغرافیہ کی تعلیم کے لئے اس کو داخل نصاب کریں۔

رہنمائے قرآن

برہان

جلد ۳۶ شمارہ ۲

فروری ۱۹۵۶ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۷۵ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

جہاں تک ہماری حکومت کی خارجہ پالیسی کا تعلق ہے اس کے تعلقات سب ہی ممالکِ اسلامیہ و عربیہ سے دوستانہ ہیں۔ لیکن مصر کے ساتھ تو گویا اس کا دانت کاٹی روٹی کا سا تعلق ہے، اور اس کے اثرات مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے لگے ہیں انھیں تعلقات کا ایک نمایاں ثمر خوش اثر یہ ہے کہ حکومتِ مصر کی جانب سے جامعۂ ازہر کے دو نامور اساتذہ کلچرل مشن پر حال ہی میں ہندوستان آئے ہیں اور ان کا پروگرام دارالعلوم دیوبند میں رہ کر عربی ادب اور جدید زبان کی تعلیم دینا ہے۔ چنانچہ یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ یہ اساتذہ جن کے نام الاستاذ عبد المنعم النمر اور الاستاذ عبد العالی العقبادی ہیں دیوبند پہنچ کر اپنے کام میں باقاعدہ مشغول ہو گئے ہیں۔ ادھر کم و بیش ایک سال سے دارالعلوم کے طلباء میں عربی تحریر و تقریر میں مشق بہم پہنچانے اور جدید ادبیاتِ عرب سے واقفیت حاصل کرنے کا ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا ہوا ہے اور انھوں نے الہیئۃ العربیہ کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے جس کے اجتماعات میں پوری کارروائی از اول تا آخر عربی میں ہوتی ہے اور جو عربی جرائد و رسائل کے ذریعہ طلباء میں زبان کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے،

جو حضرات دارالعلوم دیوبند سے دلی تعلق رکھتے ہیں اور جو یہاں کے فارغ التحصیل طلباء کو علومِ دینیہ کے ساتھ عربی زبان و ادب میں بھی نمایاں امتیاز و مرتبہ کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں ان کو بے شبہ ان دونوں خبروں سے بڑی مسرت ہوگی۔ اس موقع پر حکومتِ مصر نے اپنے دو شیوخ ازہر کو اپنے مصارف پر دارالعلوم دیوبند کی خدمت کے لئے بھیج کر دارالعلوم کے ساتھ خصوصاً اور ہندوستان کے ساتھ عموماً جس دوستی، اخلاص و محبت اور خیر سگالی و خیر اندیشی کا ثبوت دیا ہے اُس کے لئے بے شبہ وہ تمام مسلمانوں کے دلی شکریہ کی مستحق ہے اور ہم بھی

ادارۂ ندوۃ المصنفین کی طرف سے اس کی خدمت میں اپنے جذباتِ امتنان وتشکر پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

لیکن ان مظاہرِ اخلاص ومحبت کا اظہار صرف یک طرفہ نہیں ہونا چاہیئے۔ جس طرح یہ حضرات دیوبند آئے ہیں اسی طرح حکومتِ ہند کو چاہیئے کہ وہ دیوبند کے کم از کم دو اساتذہ کو جامعہ ازہر کی خدمت کے لئے اپنے مصارف پر مصر بھیجے تاکہ افادہ واستفادہ اور افاضہ واستفاضہ کا سلسلہ دونوں جانب سے قائم رہے جس طرح دارالعلوم دیوبند کے طلبار کو ضرورت ہے کہ وہ شیوخِ ازہر سے فیض حاصل کریں، اسی طرح جامعۂ ازہر کے طلبار کے لئے ضروری ہے کہ وہ دارالعلوم کے اساتذہ سے استفادہ کریں، اساتذہ کے اس تبادلہ کا اثر جہاں علمی، ادبی اور لسانی ہوگا دینی بھی ہوگا۔

اساتذہ کے تبادلے کے علاوہ طلبار کا تبادلہ بھی ہونا چاہیئے۔ کچھ طلبار ہر سال ہندوستان سے مصر جائیں اور ان کے تمام اخراجات کا تکفل حکومت مصر کرے۔ اسی طرح مصر سے جو طلبا یہاں آئیں ان کے مصارف حکومتِ ہند کو برداشت کرنے چاہئیں۔ اساتذہ اور طلبار کے اس باہمی تبادلہ کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ اردو زبان کی بلند پایہ کتابوں کا ترجمہ عربی میں ہوگا اور ان کے ذریعہ عربی ممالک کے لوگوں کو موقع ہوگا کہ وہ ہندوستان کے علمائے محققین کے کارناموں سے واقف ہوں اور ان سے فائدہ اٹھائیں۔ ادھر ہندوستان کو یہ فائدہ ہوگا کہ اسے عربی زبان میں نشر واشاعت۔ عربی میں ریڈیو پروگرام اور سفارتی کاموں کے لئے خود اس میں ایسے لوگ مل جائیں گے جو ان تمام ضرورتوں کو بحسن وخوبی انجام دے سکیں گے۔

افسوس ہے پچھلے دنوں قاضی عبدالغفار صاحب مرادآبادی بھی داعیِ اجل کو لبیک کہہ کر رہ گرائے عالمِ باقی ہوگئے۔ مرحوم اردو کے نامور اور صاحب طرز ادیب۔ کامیاب صحافی اور بڑے خوش فکر و پُرجوش قومی کارکن تھے۔ ان کی شہرت کا آغاز بحیثیت ایک اخبار نویس کے ہوا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مولانا محمد علی مرحوم سے باقاعدہ ٹریننگ

لی تھی اور ہمدرد کے عملۂ ادارت میں شریک رہنے کے علاوہ خود اپنے بھی متعدد اخبار نکالے تھے۔ تحریک خلافت میں پیش پیش رہے اور قلم کے ساتھ زبان اور عمل سے بھی قومی خدمات انجام دیتے رہے تحریک خلافت کے ختم ہو جانے پر لوگ کچھ اُن کو بھول سے چلے تھے کہ پھر یکایک لیلیٰ کے خطوط نے ان کو ادبی شہرت کے آسمان پر مہر نیم روز بنا کر چمکا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے "مجنوں کی ڈائری" "دیتی بیسہ کی چھوکری" "حیات جمال الدین افغانی" اور "حیات اجمل" وغیرہ کتابیں لکھیں جو ان کی شہرت میں برابر اضافہ ہی کرتی رہیں مرحوم بڑے شگفتہ نگار مصنف اور صاحب قلم تھے اُن کی تحریروں میں شوخی کے ساتھ سنجیدگی کا بڑا لطیف امتزاج ہوتا تھا۔ طبیعت کی رنگینی کا اثر صفحۂ قرطاس پر بھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ اپنے فکر و خیال میں بڑے پکے اور سخت قسم کے انسان تھے۔ تجارت کے سلسلے میں یورپ بھی ہو آئے تھے اور وہاں کا سفرنامہ جو نقش فرنگ کے نام سے لکھا تھا وہ بجائے خود اُردو زبان کا ایک شاہکار ہے۔ تقسیم کے بعد انجمن ترقی اُردو (ہند) کا علی گڈھ میں از سرِ نو قیام ہوا تو قاضی صاحب اُس کے سکریٹری مقرر ہوئے اور آخر اسی انجمن کی خدمت کرتے کرتے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ بڑے ملنسار اور خوش خلق و خوش رو تھے جس سے ملتے تھے اخلاص و محبت سے ملتے تھے اس صدی کے ربع اول کی یوپی کی تہذیب و شائستگی اور مخلوط تمدن و شستگی کے بڑے اچھے نمونہ تھے بات کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے اور مسکراتے تھے تو گُلِ تر کے دامن پر شبنم کے قطرے بکھرتے تھے ہماری پرانی سوسائٹی جس میں اب پت جھڑ کا دور دورہ ہے اُس کی ایک حسین یادگار تھے۔ اب یہ محفل سونی ہوتی جا رہی ہے، پرانے بادہ آشام اُٹھتے جا رہے ہیں اور نئے بادہ کشوں میں وہ وضع اور شان نہیں۔ باقی رہے نام اللہ کا! اللہ تعالیٰ مرحوم کو مغفرت و بخشش کی رحمتوں سے نوازے۔

اُردو زبان کے مرکز جہاں سے اس کی شاخیں تمام ملک میں پھیلیں، دو ہی تھے ایک لکھنؤ اور دوسرا دہلی لکھنؤ اب تک اپنے اس حق کے لئے لڑ رہا ہے اور اس کی جنگ برابر جاری ہے۔ لیکن آثار و قرائن کہہ رہے ہیں کہ دلی کو اپنا یہ حق حاصل کرنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اردو کے حق میں اس ہمدردانہ فضا کے لئے جہاں کانگریس اور دوسری پارٹیوں کے انصاف پسند ممبر لائق مبارکباد ہیں۔ اس کا سب سے زیادہ کریڈٹ جناب گوپی ناتھ امن کو ملنا چاہئے جو اپنے فکر و عمل کے اعتبار سے ایک مثالی ہندوستانی ہیں اور جن کو صحیح معنی میں گاندھی جی کا پیرو کہا جا سکتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط

۲۔ محاذ عراق و عجم

از
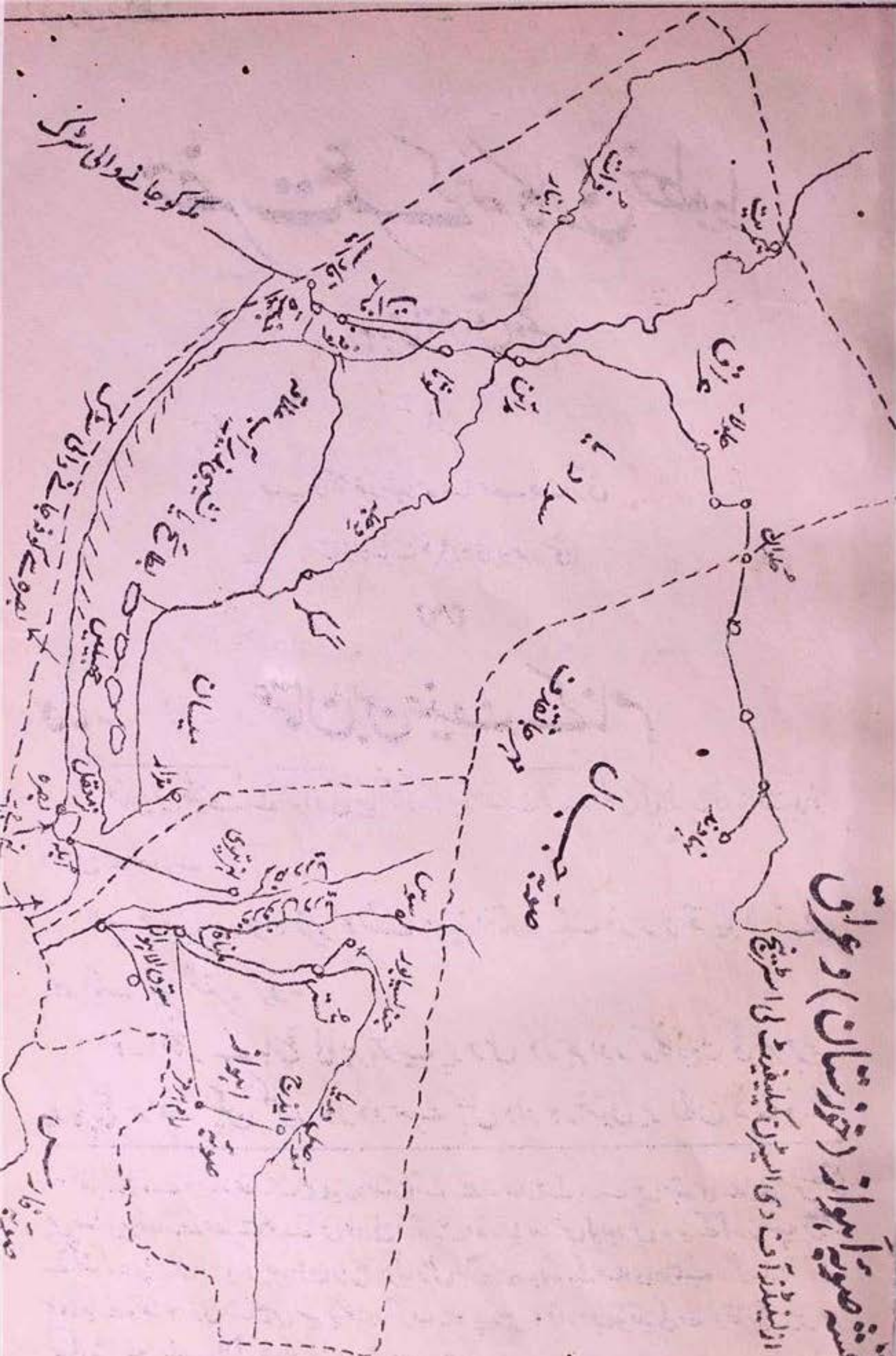
جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق
(استاذ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

(۸)

۷۵۔ عثمان بن حنیف کے نام

عثمان بن حُنیف نے سواد کی پیمائش کے بعد حضرت عمرؓ سے لگان کی شرح دریافت کی تو انھوں نے لکھا:۔

"ہر جریب پر خواہ زیرِ کاشت ہو یا افتادہ ایک درہم (تقریباً نو آنے) اور ایک قفیز[1] مقرر کرو۔

۲۔ انگور کے باغ کی ہر جریب پر دس درہم اور ترکاریوں کی ہر جریب پر پانچ درہم۔ لیکن کھجور اور دوسرے پھل دار درختوں پر لگان نہ لگاؤ۔"[2]

---

[1] قفیز ناج تولنے کا پیمانہ تھا جس میں بارہ صاع آتے تھے۔ صاع کے بارے میں مقدسی نے احسن التقاسیم میں ص۹۹ پر لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کا وزن آٹھ رطل مقرر کیا تھا جس کو بعد میں مدینے کے گورنر سعید بن عاص نے گھٹا کر ۵ ۱/۳ رطل کر دیا اور یہی وزن رائج ہو گیا۔ رطل تقریباً ایک پونڈ کے مساوی ہوتا ہے۔ اگر صاع آٹھ رطل کا مانا جائے تو قفیز کا وزن اڑتالیس سیر ہوگا اور اگر صاع ۵ ۱/۳ رطل کا قرار دیں تو قفیز کی مقدار تقریباً بتیس سیر ہوگی۔

[2] نصب الرّایہ لاحادیث الہدایہ مصر، ۳/۴۰۰۔

۷۶۔ قیصر روم کے نام

جیسا کہ سیف بن عمر کے بیان کردہ خط رقم ۳۷ میں بیان ہوا حضرت عمر نے جزیرہ کی مہم چار افسروں کے سپرد کی تھی جن میں ایک ولید بن عقبہ تھے۔ ولید جزیرہ کے عرب قبائل کو مطیع کرنے پر مامور تھے جب وہ عرب بستیوں میں پہنچے تو لوگ یا تو مسلمان ہو گئے یا جزیہ قبول کیا، مگر قبیلہ ایاد نے اسلام اور جزیہ دونوں سے انکار کر دیا، اس کے سارے افراد جن کی تعداد چار ہزار سے زیادہ تھی، گھر بار چھوڑ کر قیصر روم کی قلمرو میں چلے گئے۔ ولید نے اس کی اطلاع مرکز کو دی تو سیف کا کہنا ہے حضرت عمر نے یہ خط قیصر روم کو لکھا:-

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک عرب قبیلہ ہمارا ملک چھوڑ کر تمہارے ملک کو چلا گیا ہے۔ میں بتاکید کہتا ہوں کہ اس قبیلہ کو لوٹا دو، بخدا اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو ہم دارالاسلام کے نصاریٰ سے معاہدہ توڑ کر (عرب قبیلہ کے مساوی تعداد) تمہارے ملک کو جلا وطن کر دیں گے۔[1]"

۷۷۔ ولید بن عقبہ کے نام

جزیرہ کا ایک سربرآوردہ عیسائی عرب قبیلہ تغلب تھا۔ ولید نے ان کو اسلام کی دعوت دی مگر انھوں نے اسلام لانے سے انکار کیا اور کہا کہ ہم جزیہ دے کر اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ ولید نے کہا کہ تم عرب ہو اور عرب کو جزیہ دینے کا حق نہیں ہے، تم کو مسلمان ہونا پڑے گا۔ وہ راضی نہ ہوئے۔ ولید نے مرکز کو اطلاع دی تو حسب ذیل جواب آیا:-

---

[1] سیف بن عمر طبری ۴/ ۱۹۸، قیصر روم کے حکم سے قبیلہ ایاد کے چار ہزار آدمی اسلامی قلمرو کو لوٹ آئے، باقی ادھر اُدھر روپوش ہو گئے۔ جزیرہ پر مسلمانوں کا قبضہ بقول سیف بن عمر ۱۷ھ اور بقول ابن اسحاق ۱۹ھ میں ہوا۔

"صرف جزیرۂ عرب کے رہنے والے عربوں کے لئے اسلام قبول کرنا ضروری ہے، وہ اگر جزیہ دے کر اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہیں تو ان کو یہ حق نہیں دیا جائے گا۔

۲۔ قبیلۂ تغلب کے لوگ اگر اسلام قبول نہ کریں اور جزیہ دینا چاہیں تو ان کو ایسا کرنے دو بشرطیکہ وہ نوزائیدہ بچوں کو عیسائی نہ بنائیں اور نہ کسی عیسائی مرد یا عورت کو مسلمان ہونے سے روکیں"[1]

۷۸۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

جزیرہ پر فوج کشی کے موضوع پر سیف بن عمر کی روایت کے بموجب حضرت عمر کا خط اوپر بیان ہوا۔ اس موضوع پر ابن اسحاق نے ذیل کا خط نقل کیا ہے:۔

"خدا نے شام و عراق مسلمانوں کو فتح کرائے۔ اب تم کوفہ سے ایک لشکر جزیرہ کی تسخیر کے لئے بھیجو جس کی کمان ان تین میں سے کسی ایک کے ہاتھ میں ہو:۔ خالد بن عُرفطہ، ہاشم بن عُتبہ، اور عیاض بن غَنم۔"[2]

۷۹۔ حُرقوص بن زہیر سعدیؓ کے نام

یہ وہی صحابی ہیں جو بعد میں خارجیوں کے لیڈر ہو کر نہروان میں حضرت علی سے لڑے تھے عُتبہ بن غزوان گورنر بصرہ کے عہد میں ہُرمزان نے جو اہواز اور مہرجانقذف کے صوبوں کا حاکم تھا عربوں کو اہواز اور زیریں عراق سے نکالنے کے لئے صوبہ جبال کے بہادر کُردوں کی مدد سے ایک زبردست فوج تیار کی۔ اس علاقہ پر کئی جگہ مسلمانوں نے سرحدی چوکیاں بنالی تھیں اور مفتوحہ علاقہ کی تنظیم میں مشغول تھے کہ ہُرمزان کی چڑھائی کی خبر آئی۔ یہاں کے سالاروں نے گورنر بصرہ کو حالات سے مطلع کیا اور کمک طلب کی۔ گورنر نے ہُرمزان کی چڑھائی کی خبر حضرت عمر کو لکھ بھیجی۔ اُنھوں نے

---

[1] سیف بن عمر، طبری مصر، ۴/ ۱۹۸ [2] ابن اسحاق، طبری، مصر، ۴/ ۱۹۶

حرقوص بن زہیر کی سرکردگی میں مدینہ سے کچھ فوج روانہ کی اور اہواز کی ساری فوج کا ان کو سپہ سالار مقرر کیا۔ حرقوص نے آکر ہرمزان کو بمقام سوق الاہواز شکست دی اور رسالے اس کے تعاقب میں بھیجے۔ یہاں گرمی، مچھر اور سانپ، بچھو بہت ہوتے تھے اور غالباً ان سے بچنے کے لئے حرقوص نے اپنا کیمپ اہواز کی ایک پہاڑی پر لگایا جہاں نقل و حرکت دشوار تھی۔ جب حضرت عمر کو معلوم ہوا کہ لوگوں کو وہاں آنے جانے اور سامان فراہم کرنے میں تکلیف ہوتی ہے تو انھوں نے حرقوص کو لکھا:

"مجھے خبر ملی ہے کہ تم ایک دشوار گذار جگہ خیمہ زن ہو جہاں آنا جانا مشکل ہے۔ میری طرف سے تاکید ہے کہ تم اپنے پہاڑی مستقر سے اُتر کر میدان میں پڑاؤ ڈالو تاکہ کسی مسلمان یا مُعاہد کو تم تک پہنچنے میں دقت نہ ہو۔

۲۔ جو کام تمہارے سپرد ہے اس کی سربراہ کاری میں چُست اور مستعد رہو، ایسا کروگے تو آخرت میں تم کو انعام ملے گا اور دنیا میں بھی سربلند ہوگے۔

۳۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں جلد بازی یا کوتاہی کو نہ آنے دو ورنہ دنیا کا سکھ آرام بھی کھوؤ گے اور آخرت کی سرخروئی بھی"[1]

۸۰۔ عتبہ بن غزوان کے نام

اہواز میں شکست کھاکر ہرمزان اپنے پایۂ تخت رام ہرمز چلا گیا۔ عرب رسالے اس کے قلمرو میں ترکتازی کرنے لگے اور ان کی دست درازی اتنی بڑھی کہ ہرمزان صلح کے لئے مجبور ہوگیا۔ اس کی درخواست صلح مان لی گئی اور اس کے تصرف میں جو ضلعے باقی تھے یعنی رام ہرمز، تستر، سوس جُندی سابور، بنیان اور مہرجانقذق پر جزیہ اور خراج لگادیا گیا، ۱۷ھ اس وقت حضرت عمر نے عُتبہ کو لکھا کہ بصرہ کے دس پاکباز فوجی افسروں کا ایک وفد مدینہ بھیجیں۔ اس وفد میں مشہور عرب

---

[1] سیف بن عمر، طبری ۴/ ۲۱۰-۲۱۱-۲۱۲

سردار احنف بن قیس بھی تھے، حضرت عمرؓ کو ان کے قول و فعل پر بڑا اعتماد تھا۔ انھوں نے پوچھا: احنف! کیا مسلمان بصرہ کے ماتحت علاقہ (اہواز اور میسان) کے ذمیوں پر ظلم وستم کرتے ہیں جس سے پریشان ہو کر وہ بھاگ جاتے ہیں؟ احنف نے کہا کہ مسلمانوں کا سلوک ذمیوں کے ساتھ اچھا ہے اور ان کے بھاگنے کی وجہ مسلمانوں کا ظلم نہیں ہے۔ جب وفد بصرہ جانے لگا تو حضرت عمرؓ نے ان کے ہمراہ عُتبہ کو یہ خط بھیجا:-

"لوگوں کو ظلم وستم سے روکو، ڈرو اور چوکنا رہو اس بات سے کہ تمہاری کسی بے وفائی، کسی عہد شکنی یا کسی ستم سے سیادت و حکومت تم سے چھین لی جائے اور کوئی دوسری قوم تم پر غالب ہو جائے، کیوں کہ جو سیادت و حکومت تم نے حاصل کی ہے وہ محض "خدا کی مدد" سے حاصل کی ہے اور یہ مدد راستبازی کے ایک عہد کے ماتحت جو خدا نے تم سے لیا ہے تم کو دی گئی ہے اور اس عہد پر قائم رہنے کی خدا نے تم کو سخت تاکید کی ہے۔ پس ضروری ہے کہ تم خدا کے عہد کو بے کم و کاست پورا کرو اور اس کی مرضی کے مطابق عمل کرو، جب ایسا کرو گے تو اس کی مدد بھی ہمیشہ تمہارے شاملِ حال رہے گی۔"[1]

۸۱- عتبہ بن غزوان گورنر بصرہ کے نام

[علاء بن حضرمی گورنر بحرین سعد بن ابی وقاص کے حریف تھے، دونوں میں مسابقت کا جذبہ تھا علاء سعد سے آگے بڑھنا چاہتے اور سعد، علاء سے۔ علاء کو جب معلوم ہوا کہ سعد نے جنگ قادسیہ میں عظیم الشان فتح حاصل کر کے کسریٰ کی حکومت کی بنیادیں ہلا دی ہیں اور عراق میں بڑھتے چلے جا رہے ہیں تو ان کے دل میں پُرزور خواہش ہوئی کہ وہ بھی ایران میں کوئی بڑی کامیابی حاصل کریں۔ اُن کو معلوم تھا

---

[1] سیف بن عمر، طبری ۴/ ۲۱۱-۲۱۲

کہا تھی ...

کہ حضرت عمر بحری فوج کشی کے خلاف ہیں، اس لئے انھوں نے بالا بالا بحرین سے ایران کے جنوبی صوبہ فارس پر سمندر کے راستہ فوج اتاری ابتدائی چند فتوحات کے بعد ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ فارسیوں نے ان کے ساحلی مستقر پر قبضہ کیا اور ان کی ساری کشتیاں جلا دیں۔ ایک جنگ طاؤس نامی مقام پر ہوئی جس میں طرفین کو بھاری نقصان پہنچا۔ عرب فوجیں شکستہ حال خشکی کی راہ سے بصرہ کی طرف روانہ ہوئیں، فارسیوں نے ہر طرف سے ان کو گھیر لیا۔ حضرت عمر کو جب اس بحری فوج کشی کا علم ہوا تو وہ بہت ناراض ہوئے، اور علاء کو معزول کر کے ان کو سعد کا ماتحت کر دیا۔ دوسری طرف انھوں نے علاء کی فوج کی مدد کرنا ضروری سمجھا اور گورنر بصرہ کو ذیل کا خط لکھا۔]

"علاء بن حضرمی نے میری مرضی کے خلاف مسلمانوں کی ایک فوج سمندر کی راہ سے فارس کے ساحل پر اتاری ہے۔

۲۔ میرا خیال ہے ایسا کرتے میں ان کے پیشِ نظر نہ خدا کی خوشنودی ہے نہ اسلام کا بول بالا۔

۳۔ مجھے اندیشہ ہے وہ (مسلمان) کہیں شکست نہ کھا جائیں یا دشمن کی کسی چال میں نہ پھنس جائیں۔

۴۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ان کی مدد کے لئے بصرہ سے ایک فوج بھیجو اور قبل اس کے کہ وہ تباہ کر دئے جائیں ان کو اپنے پاس بلا لو۔"[1]

۸۲۔ علاء بن حضرمی کے نام

تاریخ التواریخ میں علاء بن حضرمی کی فارس پر چڑھائی سنہ ۱۹ھ میں بتائی گئی ہے جب کہ ابو موسیٰ اشعری بصرہ کے گورنر تھے۔ اس کتاب میں چڑھائی کی تفصیلات سیف بن عمر کے بیان سے کئی جگہ مختلف ہیں۔ ایک اہم اختلاف یہ ہے کہ مسلمانوں کی کشتیاں فارسیوں نے تباہ نہیں

---

[1] طبری ۴/ ۲۱۳

کیں جیسا کہ سیعت کی رائے ہے بلکہ ایک شدید بحری طوفان کی زد میں آ کر ڈوبیں :-

"واضح ہو کہ خدا نے حاکموں کی اطاعت ضروری قرار دی ہے کیونکہ نافرمانی سے اجتماعی نظام کو ضرر پہنچتا ہے۔

۲- تم نے میری اجازت بغیر لشکر تیار کیا اور فارس پہ چڑھائی کی اور مسلمانوں کو ہلاکت میں ڈالا۔

۳- میں نے بصرہ کے حاکم کو لکھا ہے کہ فوراً ایک فوج مسلمانوں کی قوت کے لئے فارس بھیجیں اور تم کو تباہی سے بچائیں۔

۴- اب تم کو بحرین واپس جانے کی اجازت نہیں ہے۔ خطرہ سے نکلتے ہی سعد بن ابی وقاص کے پاس پہنچو، اگر میں جانتا کہ تم کو سعد بن ابی وقاص کی ماتحتی سے زیادہ اور کوئی بات ناگوار ہوگی تو وہی کرتا[1]"

۸۳- مغیرہ بن شعبہ کے نام

{ بصرہ کے مؤسس اور گورنر عتبہ بن غزوان کا سنہ ۱۶ھ میں انتقال ہوا ان کے بعد بصرہ اور اس کے ماتحت علاقہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ ہوئے۔ عتبہ کے وقت میں یعنی سنہ ۱۴ھ سے تا سنہ ۱۶ھ نافع بن حارث بن کلدہ ثقفی (مشہور صحابی ابوبکرہ کے بھائی) نے بصرہ کے باہر کچھ اراضی میں باغ لگائے تھے اور ایک سرسبز میدان میں گھوڑے پالے تھے، یہ مدینہ آئے اور حضرت عمرؓ سے کہا کہ میں نے بصرہ کے پاس ایک میدان میں جو کسی ذمی کی ملکیت نہیں ہے گھوڑے پالے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس زمین کے مالکانہ حقوق مجھے عنایت کئے جائیں۔ حضرت عمرؓ نے گورنر کو یہ سفارشی خط لکھا -]

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ عبداللہ عمر امیر المؤمنین کی طرف سے مغیرہ بن شعبہ کو سلام علیک۔ اس معبود کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی

---

[1] ناسخ التواریخ محمد تقی، بمبئی ۴/ ۳۶۶

عبادت کا مستحق نہیں۔ واضح ہو کہ ابوعبداللہ (نافع) نے مجھے بتایا کہ عتبہ بن غزوان کے وقت سے وہ بصرہ میں کاشت کر رہے ہیں اور انھوں نے سب سے پہلے (اسلامی فوج کو مہیا کرنے کے لئے) گھوڑے پالے ہیں۔ لائق تحسین اور حوصلہ افزائی ہے نافع کا یہ اقدام! اس میں تم جو ان کی مدد کرسکتے ہو بے دریغ کرو۔ وہ زمین جو ان کے تصرف میں ہے بطور جائداد ان کو دے دو، بشرطیکہ وہ نہ تو کسی ذمی کی ملکیت ہو، اور نہ اہل جزیہ کے دریاؤں یا نہروں سے اس کو سیراب کیا جاتا ہو۔"[1]

دوسری روایت کی رو سے یہ سفارشی خط مغیرہ کو نہیں بلکہ ان کے جانشین ابوموسیٰ اشعری کو لکھا گیا تھا جو محرم ۱۷ھ بصرہ کے گورنر ہوئے، اور خط کا مضمون یہ تھا:۔

"ابو عبداللہ نے دِجلہ کے دہانہ کے قریب ایک قطعہ زمین گھوڑے پالنے کے لئے مجھ سے مانگی ہے اگر یہ قطعہ ذمیوں کی زمین پر نہ ہو اور نہ ذمیوں کی نہروں سے سیراب ہوتا ہو تو ان کو بطور جائداد دے دو۔"[2]

۴۸۔ مغیرہ بن شعبہ کے نام

[مُغیرہ بن شعبہ جب بصرہ کے گورنر تھے (یعنی ۱۶ھ تا محرم ۱۷ھ) تو ایک خاتون اُم جمیل ان کے گھر آیا کرتی تھی، یہ شریف خاندان کی عورت تھی جس کا خاوند جنگ میں مارا گیا تھا۔ شوہر کے بعد اُس کی مالی حالت خراب ہوئی اور وہ بصرہ کے بڑے گھروں میں مالی مدد کے لئے آتی جاتی تھی مغیرہ صنفی میلان کے لئے مشہور تھے۔ بعض راویوں کا کہنا ہے کہ ان کو ام جمیل سے محبت تھی مغیرہ کے کمرہ کی کھڑکی کے سامنے ابوبکرہ کی کھڑکی کھلتی تھی۔ ابوبکرہ کو مغیرہ سے کد تھی، مغیرہ ان کی طرف بڑھتے مگر ابوبکرہ ان سے کٹتے۔ ابوبکرہ کا خیال تھا کہ مغیرہ میں وہ اخلاقی طہارت نہیں جو مسلمانوں کے امام

---

[1] فتوح البلدان مصر، ص ۳۵۶ [2] فتوح البلدان، مصر، ص ۳۵۹

کے لئے ضروری ہے۔ ایک دن جب کہ مغیرہ اپنی بیوی سے مشغول تھے جن کی عورت ام جمیل سے ملتی تھی، ہوا کے جھونکے سے ابو بکرہ اور مغیرہ کے کمروں کی کھڑکی کھل گئی۔ ابو بکرہ اس کو بند کرنے اٹھے تو سامنے مغیرہ کو مشغول دیکھا، وہ سمجھے کہ ام جمیل ہے انھوں نے اپنے تین ساتھیوں کو جن سے وہ باتیں کر رہے تھے بلا کر یہ نظارہ دکھایا اور جب مغیرہ نماز پڑھانے نکلے تو ان کا راستہ روک لیا اور مسجد جانے سے باز رکھا۔ لوگوں نے مداخلت کی اور ابو بکرہ کو مشورہ دیا کہ مرکز سے شکایت کریں، گورنر کو نماز پڑھانے سے نہ روکیں۔ ابو بکرہ مع گواہوں کے مدینہ گئے۔ حضرت عمر ان کی شکایت سن کر دم بخود رہ گئے، انھوں نے صحابی ابو موسیٰ اشعری کو بلایا اور کہا: میں تم کو بصرہ کا گورنر بناتا ہوں جہاں شیطان نے انڈے دئے ہیں۔ یہ خط مغیرہ کو دو اور بلا تاخیر ان کو مدینہ بھیج دو۔ خط کا مضمون یہ تھا:۔

"مجھے ایک سنگین خبر موصول ہوئی ہے جس کے زیر اثر ابو موسیٰ کو بصرہ کا گورنر بنا کر بھیج رہا ہوں، ان کو حکومت کا چارج دے کر فوراً ادھر کا رخ کرو۔"

اس خط کے ساتھ بصرہ کے باشندوں کے نام یہ خط بھیجا:۔

۸۵۔ بصرہ کے باشندوں کے نام

"میں ابو موسیٰ کو تمہارا گورنر بنا کر بھیج رہا ہوں تاکہ وہ

۱۔ ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کی مدد کریں۔

۲۔ تمہاری مدد سے تمہارے دشمنوں کے ساتھ جنگ کریں۔

۳۔ ذمیوں کی جان و مال اور حقوق کی نگرانی کریں۔

۴۔ تمھارا خراج وصول کریں اور اس کو تم پر صرف کریں۔ اور

۵۔ راستوں کو خطرہ سے محفوظ رکھیں۔" [1]

---

[1] طبری ۴/۲۰۷، مغیرہ پر الزام اور مدینہ میں ان کے کھلے مقدمہ کا سب سے زیادہ مفصل تصہ اغانی میں بیان ہوا ہے۔

۸۶- سعد بن ابی وقاص کے نام

یزدجرد کو جب معلوم ہوا کہ ایک طرف عربوں نے سمندر سے قلب ایران یعنی صوبہ فارس پر اور دوسری طرف بصرہ سے صوبۂ اہواز پر یورش شروع کردی ہے تو وہ بہت پریشان ہوا اور اس نے اہواز اور فارس کے ارباب اقتدار سے خط وکتابت کی اور ان کو اکسایا کہ عربوں کو اپنے پیارے ملک سے نکالنے میں وہ تن، من، دھن کی بازی لگا دیں۔ چنانچہ اہواز کے ان شہروں میں جو ازروئے معاہدہ ہرمزان براہ راست مسلمانوں کے زیر تصرف نہ تھے شد ومد سے عسکری تیاری ہونے لگی۔ جب اہواز کے کمانڈر انچیف حرقوص اور دوسرے ضلع کمانڈروں کے پاس اس تیاری کی خبریں آئیں اور یہ افواہ گرم ہوئی کہ ہرمزان عہد شکنی کر کے عنقریب حملہ کرنے والا ہے تو انھوں نے ایک طرف حضرت عمر کو اور دوسری طرف بصرہ کے نئے گورنر ابو موسیٰ اشعری کو صورت حال سے مطلع کیا اور کمک مانگی۔ حضرت عمر نے کوفہ کے گورنر سعد کو یہ ارجنٹ خط بھیجا:-

اہواز کے مورچہ پر بہت جلد ایک بڑی فوج بھیجو جس کے سالار اعلیٰ نعمان بن مقرن ہوں۔ اس فوج کے حسب ذیل افسر سوید بن مقرن عبداللہ بن ذی السہمین، جریر بن عبداللہ حمیری، اور جریر بن عبداللہ بجلی رسالے لے کر ہرمزان کے مستقر کا رخ کریں اور وہاں تحقیق کریں کہ اس کے بارے میں جو افواہ گرم ہے کہاں تک درست اور اس کے ارادے کیا ہیں؟[1]

۸۷- ابو موسیٰ اشعری کے نام

سعد کو مذکورہ بالا خط لکھنے کے بعد ذیل کا فرمان ابو موسیٰ اشعری کو جو اس

[1] سیف بن عمر طبری ۴/ ۲۱۴ - ۲۱۵

وقت بصرہ کے گورنر تھے، ارسال کیا:۔

"ایک بڑی فوج اہواز کے محاذ کو بھیجو جس کے سالارِ اعلیٰ سہیل بن عدیؓ ہوں اور اُن کے ماتحت سالاروں میں یہ لوگ ہوں:۔ عرفجہ بن ہرثمہ، حذیفہ بن محصن، عبدالرحمٰن بن سہل اور حصین بن معبد (ان میں سے کئی اس فوج کے سالار بھی رہ چکے تھے جو بصرہ سے علاء حضرمی کی فوج کو نکالنے فارس بھیجی گئی تھی) بصرہ اور کوفہ کی متحدہ فوجوں کی کمان ابوسبرہ بن رُہم (صحابی) کے سپرد کرو۔ جو فوجیں بطور کمک بعد میں آئیں وہ بھی ابوسبرہ ہی کے ماتحت ہوں گی"[1]

---

[1] سیف بن عمر، طبری ۴/۲۱۵

العلم والعلماء

یہ جلیل القدر امام حدیث علامہ ابن عبدالبر کی شہرۂ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا نہایت صاف اور شگفتہ ترجمہ ہے۔ مترجم کتاب مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی اس دور کے بے مثال ادیب اور مترجم سمجھے جاتے ہیں، موصوف نے یہ ترجمہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا تھا۔ ندوۃ المصنفین سے شائع کیا گیا ہے۔ علم اور فضیلتِ علم کے بیان، اہل علم کی عظمت اور ان کی ذمہ داریوں کی تفصیل پر خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے آج تک کوئی کتاب اس مرتبہ کی شائع نہیں ہوئی، اس متبرک کتاب کی ایک ایک سطر سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق ہے، ایک زبردست محدث کی کتاب اور ملیح آبادی صاحب کا ترجمہ، موعظتوں اور نصیحتوں کے اس عظیم الشان دفتر کو ایک دفعہ ضرور پڑھئے۔ صفحات ۳۰۰ بڑی تقطیع قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ مجلد پانچ روپے آٹھ آنے۔

صدیق اکبرؓ سے حضرت علیؓ کی بیعت

از

(سعید احمد)

"یہ مضمون اڈیٹر "برہان" کی جدید ضخیم کتاب کا ایک ٹکڑہ ہے۔ جو ۱۹۵۶ء کی مطبوعات ندوۃ المصنفین میں شامل ہوگی۔"

وان أسأت فقوّموني۔ الصدق أمانةٌ والكذب خيانةٌ والضعيف منكم قوي عندي حتى أزيح علته ان شاء الله۔ والقوي فيكم ضعيف حتى آخذ عنه الحق ان شاء الله۔ لا يدع قوم الجهاد في سبيل الله الا ضربهم الله بالذل۔ ولا يشيع قومٌ قطّ الفاحشة الا عمّهم الله بالبلاء أطيعوني، ما أطعت الله ورسوله، فاذا عصيت الله ورسوله فلا طاعة لي عليكم قوموا الى صلاتكم يرحمكم الله[1]

تم میری مدد کرو۔ اور اگر بُرا کروں تو مجھ کو سیدھا کردو۔ سچائی ایک امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔ تم میں جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے۔ چنانچہ میں اس کا شکوہ دور کروں گا اور تم میں جو قوی ہے وہ کمزور ہے چنانچہ میں انشاء اللہ اس سے حق لوں گا۔ جو قوم جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کر دیتی ہے اللہ اس کو ذلت کی مار مارتا ہے اور جس قوم میں شدید قسم کی بُری باتیں عام ہو جاتی ہیں اللہ ان پر مصیبت عام کر دیتا ہے جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں ہے۔ اچھا! اب جاؤ نماز پڑھو۔ اللہ تم پر رحم فرمائے

[1] البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۲۴۸

مستخلفین | سیر و تاریخ کی کتابوں میں بعض ایسی شخصیتوں کے نام ملتے ہیں جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس وقت بیعت نہیں کی۔ ان میں سب سے اہم نام نامی اور اسم گرامی حضرت علی مرتضیٰ کا ہے۔ ان کے بعد حضرت زبیر اور سعد بن عبادہ کے نام آتے ہیں۔ چوں کہ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے اور اس قدر معمولی نہیں جیسا کہ عام مورخین نے اس کو سمجھ رکھا ہے چنانچہ وہ اس کا سرسری ذکر کر کے آگے بڑھ گئے ہیں اور اس مسئلہ کی صحیح حقیقت معلوم نہ ہونے سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں اس بنا پر ہم ان تینوں بزرگوں میں سے ہر ایک کی نسبت الگ الگ کلام کرتے ہیں۔

صدیق اکبر سے حضرت علی کی بیعت | حضرت علی کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ آپ نے چھ ماہ یعنی حضرت فاطمہ کی وفات تک حضرت ابو بکر سے بیعت نہیں کی اور ناراض ہوئے گھر میں بیٹھے رہے آخر جب حضرت فاطمہ کا انتقال ہو گیا تو آپ نے اور آپ کے ساتھ جو دوسرے بنو ہاشم تھے انھوں نے حضرت ابو بکر کو حضرت علی کے مکان پر بلایا۔ یہاں دونوں میں گفتگو ہوئی شکوہ شکایت ہوئے اور آخر جب صلح صفائی ہو گئی تو حضرت علی نے بیعت کی جس سے سب مسلمانوں کو بڑی مسرت حاصل ہوئی۔

مورخین اور عام ارباب سیر کی اس رائے کا منشا دراصل صحیح بخاری کی روایت ذیل ہے:

عن عائشة ان فاطمة بنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ارسلت الی ابی بکر تسئلہ میراثہا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مما افاء اللہ علیہ بالمدینة وفدک وما بقی من خمس خیبر فقال ابو بکر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لانورث ماترکنا صدقة انما یاکل آل محمد فی

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی فاطمہ نے حضرت ابو بکر کے پاس پیغام بھیجا جس میں انھوں نے ان چیزوں میں جو اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں بہ طور فئے عطا فرمایا تھا اور فدک میں اور خیبر کے خمس میں جو کچھ بچا تھا اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی میراث کا مطالبہ کیا تھا۔ حضرت ابو بکر نے جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوگا۔ جو کچھ

هذا المال وانی واللہ لا أغیر شیئا
من صدقة رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم عن حالها التی کان
علیها فی عهد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم ولاعملن فیها بما
عمل بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم فابی ابوبکر ان یدفع الی
فاطمة منها شیئا فوجدت
فاطمة علی ابی بکر فی ذالک فهجرته
فلم تکلمه حتی توفیت وعاشت
بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم
ستة اشهر فلما توفیت دفنها
زوجها علی لیلا ولم یؤذن بها
ابابکر وصلی علیها وکان لعلی
وجه حیاة فاطمة فلما توفیت
استنکر علی وجوہ الناس فالتمس
مصالحة أبی بکر ومبایعته
ولم یکن یبایع تلک الاشهر
فارسل الی ابی بکر ان أئتنا
ولا یأتنا احد معک کراهیة
لمحضر عمر فقال عمر لا واللہ

ہم چھوڑ جائیں گے وہ صدقہ ہوگا اور آل محمد بھی
اُسی میں سے کھائیں گے قسم اللہ کی آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ آپ کی زندگی میں جس حالت
پر تھا میں اس میں کوئی تغیر نہیں کروں گا اور میں
اس سے متعلق وہی عمل کروں گا جو آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے کیا تھا۔ یہ کہہ کر ابوبکر نے فاطمہ کو ان چیزوں
میں سے کوئی بھی چیز کے دینے سے انکار کر دیا۔ اس
پر فاطمہ ابوبکر سے ناراض ہو گئیں۔ انھوں نے
ان کو چھوڑ دیا اور وفات پانے تک ان سے کلام
نہیں کیا۔ فاطمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
بعد چھ مہینے زندہ رہیں۔ جب ان کی وفات ہوئی
تو ان کے شوہر علی نے رات ہی کو انھیں دفن کر دیا
اور ابوبکر کو اس کی خبر نہیں کی اور علی نے ان کی نماز
پڑھی۔ فاطمہ کی زندگی میں علی کا بڑا وقار تھا لیکن جب
فاطمہ کی وفات ہو گئی تو علی نے محسوس کیا کہ اب
لوگوں کے دلوں میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی ہے
اس لئے انھوں نے ابوبکر سے صلح کر لینی اور ان سے
بیعت کرنی چاہی اور انھوں نے ان مہینوں میں
بیعت نہیں کی تھی۔ چنانچہ علی نے ابوبکر کو گھر بلایا
اور ساتھ ہی یہ بھی کہلا بھیجا کہ آپ کے ساتھ کوئی
اور نہ آئے کیوں کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے

لا ندخل علیهم وحدك فقال ابوبکر
وما عسیتهم ان یفعلوه بی والله
لآتینهم فدخل علیهم ابوبکر فتشهد
علی فقال انا قد عرفنا فضلك وما
اعطاك الله ولم ننفس علیك
خیرا ساقه الله الیك ولكنك
استبددت علینا بالامر وكنا نری
لقرابتنا من رسول الله صلی الله
علیه وسلم نصیبا حتی فاضت
عینا ابی بکر فلما تکلم ابوبکر
قال والذی نفسی بیده لقرابة
رسول الله صلی الله علیه وسلم
احب الی ان اصل من قرابتی
واما الذی شجر بینی وبینکم من
هذه الاموال فانی لم آل فیها
عن الخیر ولم اترك امرا رأیت
رسول الله صلی الله علیه وسلم
یصنعه فیها الا صنعته فقال علی
لابی بکر موعدك العشیة للبیعة
فلما صلی ابوبکر الظهر رقی علی
المنبر فتشهد وذکر شان علیؓ

تھے کہ ان کے ساتھ عمر آئیں۔ عمر نے ابوبکر کو مشورہ
دیا کہ وہ تنہا نہ جائیں۔ ابوبکر نے کہا کہ مجھ کو ان
(بنو ہاشم) سے یہ امید نہیں کہ وہ میرے ساتھ ایسا
ویسا معاملہ کریں گے۔ بخدا میں ان کے پاس ضرور
جاؤں گا۔ چنانچہ ابوبکر ان کے پاس آئے تو علی نے
کلمہ تشہد پڑھا اور پھر کہا کہ ہم آپ کے فضل کو اور جو
کچھ اللہ نے آپ کو دیا ہے اس کو پہچانتے ہیں اور جو
خیر (خلافت) اللہ نے آپ کو بخشا ہے ہم اس میں
آپ کی ریس نہیں کرتے لیکن ہاں آپ نے خلافت
کا معاملہ خود ہی طے کر لیا۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے ساتھ قرابت کی وجہ سے ہم بھی اس میں
اپنا حصہ سمجھتے تھے۔ ابوبکر یہ سن کر آبدیدہ ہو گئے
پھر جب انھوں نے بولنا شروع کیا تو کہا "قسم ہے
اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت مجھ کو اس
سے زیادہ محبوب ہے کہ میں اپنے اعزہ کے ساتھ
صلہ رحمی کروں رہا وہ اختلاف جو میرے اور تمہارے
درمیان ان اموال کے بارہ میں رونما ہو گیا ہے تو
میں نے خیر کے کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے
اور میں نے کوئی ایسا کام جس کو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے کیا ہو اس کو کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ یہ سن کر

وتخلفه عن البيعة وعذره بالذي
اعتذر اليه ثم استغفر وتشهد
علي فعظم حق ابي بكر وحدث انه
لم يحمله على الذي صنع نفاسةً
على ابي بكرٍ ولا انكارًا للذي
فضله الله به ولكنا كنا نرى
لنا في هذا الامر نصيبًا واستبد
علينا فوجدنا في انفسنا فسرّ
بذلك المسلمون وقالوا اصبت
وكان المسلمون الى علي قريبا حين
راجع الامر بالمعروف[1]

علی نے ابوبکر سے کہا کہ اچھا! آپ بیعت کے لئے
شب میں آیئے۔ پھر جب ابوبکر نے ظہر کی نماز ادا
کرلی تو انھوں نے کلمہ تشہد پڑھا اور علی کا حال اور
بیعت سے ان کی علیحدگی اور اس کا جو عذر انھوں نے
بیان کیا تھا وہ سب بیان کیا پھر استغفار پڑھا اس
کے بعد علی نے تشہد پڑھا۔ ابوبکر کے حق کی بڑائی
بیان کی اور انھوں نے کہا کہ میں نے جو کچھ کیا تھا اس
کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ابوبکر پر حسد کرتا تھا اور
اللہ نے ان پر جو انعامات کئے ہیں میں ان کا منکر تھا
لیکن بات یہ ہے کہ ہم لوگ بھی خلافت کے معاملہ میں
اپنا کچھ حصہ سمجھتے تھے ابوبکر نے اس میں ہماری بات
بھی نہیں پوچھی اس لئے ہمارے دل میں اس کا ملال
تھا یہ سن کر سب مسلمان بہت خوش ہوئے اور انھوں
نے کہا "آپ نے درست فرمایا" اور مسلمان علی
سے قریب ہوگئے جب وہ امر بالمعروف کی طرف
لوٹ آئے۔

اس کے علاوہ صحیح مسلم میں بھی امام زہری سے روایت ہے کہ کسی شخص نے ان سے بیان کیا کہ حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے حضرت فاطمہ کی وفات کے وقت تک بیعت نہیں کی تو انھوں نے کہا کہ نہیں! حضرت علی ہی نے نہیں بلکہ بنو ہاشم میں سے کسی نے بھی نہیں کی۔ لیکن حافظ ابن حجر نے بیہقی سے نقل کیا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے کیوں کہ زہری نے اس کی سند نہیں بیان کی[2] بیہقی نے

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۰۹ و ۶۰۸ باب غزوہ خیبر [2] فتح الباری جلد ۷ ص ۳۷۹

اس روایت کی جو وجہ ضعف بیان کی ہے اس کے علاوہ اس روایت کا یہ جز بھی تمام روایات کے خلاف ہے کہ بنو ہاشم میں سے کسی نے بھی بیعت نہیں کی۔

اب رہ گئی صحیح بخاری کی روایت تو اس پر اشکال یہ ہے کہ حضرت علی کا چھ ماہ تک بیعت نہ کرنا ایک ایسی بات ہے جو حضرت علی کی شان سے بھی بعید ہے اور حضرت ابو بکر کا اتنے دنوں تک اس پر صبر کرنا خود حضرت ابو بکر سے مستبعد ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابو بکر کو صحابہ کرام میں جو بلند مرتبہ و مقام حاصل تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر جو خصوصی اعتماد و اعتبار تھا اور جس کی وجہ سے آپ نے صراحۃً اشارۃً (جس کا ذکر آگے آئے گا) حضرت ابو بکر کی خلافت کی طرف ایما فرمایا تھا حضرت علی اس سے ناواقف نہیں ہو سکتے تھے، علاوہ بریں خود حضرت علی درویشی و بے نفسی اور ولایت و انابتِ الی اللہ کے جس مرتبۂ اعلیٰ و ارفع پر متمکن تھے وہ بھی کوئی پوشیدہ حقیقت نہیں ہے اس بنا پر یہ قطعی ناممکن ہے کہ حضرت علی حضرت ابو بکر کو مستحقِ خلافت یا خلیفۂ برحق نہ سمجھتے ہوں۔ چنانچہ صحیح بخاری کی اسی روایت میں حضرت علی صاف لفظوں میں حضرت ابو بکر کے فضائل و مناقب اور ان کے استحقاق خلافت کا اعتراف کرتے ہیں اور یہ بھی بصراحت فرماتے ہیں کہ ان کو خلافت کے معاملہ میں حضرت ابو بکر کے ساتھ نہ کچھ اختلاف تھا اور نہ وہ اس پر ان کے ساتھ کوئی مناقشت رکھتے تھے۔

یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اپنی پرانی عصبیت کی بنا پر اس وقت غیر ذمہ دارانہ گفتگو کر کے حضرت علی کو مشتعل کرنا بھی چاہا تو آپ نے سختی کے ساتھ ان کو ڈانٹ دیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابو سفیان نے جو حضرت امیر معاویہ کے والد تھے حضرت علی کو عار دلائی اور ان کو حضرت ابو بکر کی مخالفت پر برانگیختہ کرنے کی غرض سے کہا کہ "یہ دیکھیے! قریش میں جو گھٹیا درجہ کا قبیلہ ہے خلافت اس میں چلی گئی۔ خدا کی قسم اگر آپ اس کے خواہاں ہوں تو میں مدینہ کو سوار اور پیادہ فوج سے بھر دوں۔ حضرت علی یہ سنتے ہی برہم ہو گئے اور بگڑ کر فرمایا "اے ابو سفیان تم اسلام اور مسلمانوں کے پرانے دشمن ہو۔ تم ایسی باتوں سے اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ ہم نے ابو بکر کو خلافت کا اہل پایا ہے[1]۔ حضرت ابو بکر تو ابو بکر تھے

[1] ابن جریر طبری ج ۲ ص ۲۴۹

حضرت علی کی شان تو یہ ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان کے مقابلہ میں بھی اپنے لئے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا اور کبھی جمہور امت سے اس معاملہ میں الگ نہیں ہوئے چنانچہ ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت علی سے دریافت کیا کہ یہ کیا بات ہے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافت پر مسلمانوں میں اختلاف نہیں ہوا لیکن آپ کی خلافت پر وہ متفق نہیں ہیں تو حضرت علی نے جواب دیا کہ ابوبکر و عمر میرے جیسے مسلمانوں پر والی تھے اور میں تم جیسے مسلمانوں کا والی ہوں"[1]

ان بیانات سے صاف ظاہر اور ثابت ہے کہ حضرت علی کو حضرت ابوبکر کی خلافت پر کوئی اعتراض نہیں تھا اور وہ اس معاملہ میں ان کے مخالف نہیں تھے البتہ ہاں جیسا کہ بخاری کی اسی روایت میں اور دوسری روایات میں ہے حضرت علی کو حضرت ابوبکر کی طرف سے ملال ضرور تھا۔ جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ عین اس وقت جب کہ حضرت علی اور دوسرے آل بیت نبوی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے حضرت ابوبکر سقیفۂ بنو ساعدہ کی خبر سنتے ہی حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو ساتھ لے وہاں پہنچ گئے اور خلافت کا معاملہ طے کر آئے اور حضرت علی سے اس بارہ میں کوئی مشاورت نہیں کی۔ اس کے علاوہ دوسری وجہ حضرت فاطمہ کا حضرت ابوبکر کی طرف سے تکدر خاطر تھا جو بربنائے بشریت پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ حضرت علی کے ملال کی یہ دونوں وجہیں محض ذاتی اور شخصی تھیں اس بنا پر ان کا اثر یہ تو ہو سکتا تھا کہ حضرت علی اور حضرت ابوبکر کے تعلق باہمی میں وہ شگفتگی نہ ہو جو معاشرتی زندگی میں ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن چونکہ خلافت ایک قومی اور اجتماعی مسئلہ تھا اس بنا پر اس ذاتی رنجش کا نتیجہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ حضرت علی سرے سے بیعت ہی نہ کرتے اور تفرق بین المسلمین کا سبب بنتے۔ حضرت علی کی جمہوریت پسندی اور رائے عامہ کے احترام کی کیفیت تو یہ تھی کہ جب حضرت ابوبکر نے اپنے مرض الموت میں حضرت عمر کا نام اپنی جانشینی کے لئے تجویز کیا تو اگرچہ حضرت علی ذاتی طور پر اس سے متفق نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس رائے کا اظہار کر بھی دیا تھا۔ لیکن آخر جب حضرت عمر نامزد ہو ہی گئے تو پھر کوئی مخالفت نہیں کی اور سب مسلمانوں کے ساتھ انھوں نے بھی بیعت

---

[1] تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۱۷۶

کرلی۔ پس جب ان کی یہ فطرت تھی تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا تھا کہ بیعت عامہ ہو جانے کے باوجود حضرت علی سب مسلمانوں سے الگ رہتے اور بیعت نہ کرتے۔

ماوردی اور اشعری نے حضرت علی کے تخلف عن البیعۃ کا ایک عذر یہ بھی بیان کیا ہے کہ خلیفہ سے فرداً فرداً ہر مسلمان کا بیعت کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہزاروں مسلمان بیعت کر ہی چکے تھے اس لئے اگر ایک حضرت علی نے بیعت نہیں کی تو اس کو مخالفت پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔[1]

لیکن ہمارے نزدیک یہ عذر صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ حضرت علی اپنی ذات سے تنہا ایک شخص نہیں تھے بلکہ پوری ایک جماعت۔ ایک قوم اور ایک گروہ تھے ان کا بیعت نہ کرنا اسلامی وحدت کے لئے عظیم ترین رخنہ کا باعث ہو سکتا تھا اور اپنی اس حیثیت سے یقیناً وہ خود بھی بے خبر نہیں تھے۔[2]

صحیح بخاری کی روایت پر ہم نے اشکال کی جو تقریر سطور بالا میں کی ہے وہ درایت کے اعتبار سے تھی روایتی حیثیت سے تحقیق کی جائے تو معلوم ہو گا کہ اس روایت کے مقابلہ میں چند ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے چھ مہینے تک بیعت نہ کرنے کی تردید ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم وہ روایت ہے جس کو حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اگرچہ امام بخاری اور امام مسلم نے اس روایت کو صحیحین میں درج نہیں کیا ہے لیکن ہے ان دونوں کی شرط پر ہے اور اس لئے صحیح ہے، روایت یہ ہے:۔

ان عبد الرحمٰن بن عوف کان مع عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ وان محمد بن مسلمۃ کسر سیف الزبیر ثم قام ابو بکر فخطب الناس	عبد الرحمٰن بن عوف بھی عمر بن الخطاب کے ساتھ تھے اور محمد بن مسلمہ نے زبیر کی تلوار توڑ دی تھی پھر ابو بکر کھڑے ہوئے انھوں نے خطبہ دیا اور معذرت چاہتے ہوئے کہا، "اللہ کی قسم مجھ کو امارت کا لالچ

---

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۳۷۸ و فیض الباری ج ۴ ص ۴۲۱

[2] جلال الدین سیوطی نے اتقان میں ایک روایت نقل کی ہے جس کی انھوں نے تصحیح بھی کی ہے کہ حضرت علی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک خطبہ دیا اور فرمایا کہ میں جب تک قرآن جمع نہیں کر لوں گا گھر سے نہیں نکلوں گا۔ بعض حضرات نے اس جمع قرآن کو حضرت علی کی طرف سے بیعت نہ کرنے کا عذر بتایا ہے لیکن اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ اگر یہ کوئی عذر ہے بھی تو عذر بارد ہے۔ چند منٹ کے لئے بیعت کے واسطے آ جانا جمع قرآن کے کام میں کیوں کر خلل انداز ہو سکتا تھا۔

واعتذر الیهم وقال واللہ ما کنت حریصا علی الامارة یوما ولا لیلة قط ولا کنت فیها راغبا ولا سالتها اللہ فی سر وعلانیة ولکنی اشفقت من الفتنة ومالی فی الامارة من راحة ولکن قلدت امرا عظیما مالی به من طاقة ولا ید الا بتقویة اللہ عزوجل ولوددت ان اقوی الناس علیها مکانی الیوم فقبل المهاجرون منه ما قال وما اعتذر به - قال علی والزبیر ما غضبنا الا لا نا قد اخرنا عن المشاورة وانا نری ابابکر احق الناس بها بعد رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم انه لصاحب الغار وثانی اثنین وانا لنعلم بشرفه وکبره ولقد امره رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بالصلٰوة بالناس وهو حی (المستدرک ج ۳ ص ۶۶)

کسی دن یا کسی رات بالکل بھی نہیں تھا اور نہ مجھ کو اس کی کوئی رغبت تھی اور نہ میں نے پوشیدہ طور پر یا علانیہ اس کا اللہ سے سوال کیا تھا لیکن ہاں میں فتنہ سے ڈرتا تھا اور امارت میں میرے لئے کوئی راحت نہیں ہے - بلکہ میرے گلے میں ایک اتنے بڑے کام کا طوق ڈال دیا گیا ہے جس کی بجز توفیق الٰہی کے مجھ میں طاقت نہیں ہے - میں چاہتا تھا کہ کوئی مجھ سے زیادہ قوی آدمی آج میری جگہ پر ہوتا - ابوبکر نے جو کچھ کہا تھا مہاجرین نے اس کو قبول کر لیا - علی رضی اللہ عنہ اور زبیر نے کہا، ہم کو صرف اس بات پر غصہ تھا کہ مشورہ کے وقت ہمیں پس پشت ڈال دیا گیا - ورنہ ہم بے شبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امارت کا سب سے زیادہ مستحق ابوبکر ہی کو سمجھتے تھے - وہ صاحب غار اور ثانی اثنین ہیں اور ہم ان کے شرف اور عظمت کو جانتے ہیں - اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نماز پڑھانے کا حکم اپنی حیات ہیں ہی دیا تھا۔

اب ایک اور پہلو سے غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اگر بالفرض حضرت علی بیعت نہ کرتے تو حضرت ابوبکر

ان معاملات میں جس قدر سخت تھے اس کے پیش نظر ان سے یہ بالکل بعید بات تھی کہ وہ صبر کر کے خاموش بیٹھے رہتے اور فتنہ کے اس دروازہ کو کھلا چھوڑ دیتے۔ چنانچہ اس ذیل میں ہم ایک اور روایت نقل کرتے ہیں جس سے اس بیعت کے معاملہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت علی دونوں کے طرزِ عمل پر ایک ساتھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ روایت حضرت ابوسعید الخدری کی ہے سقیفۂ بنی ساعدہ کے واقعہ کے ابتدائی اجزاء بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں

فلما قعد ابوبکرٍ علی المنبر نظر فی وجوہ القوم فلم یر علیا فسال عنہ فقام ناسٌ من الانصار فاتوا بہ فقال ابوبکر ابن عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وختنہ اردت ان تشق عصا المسلمین فقال لا تثریب یا خلیفۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبایعہٗ . . . .
ھذا حدیث صحیحٌ علی شرط الشیخین ولم یخرجاہ[1]

جب ابوبکر منبر پر بیٹھ گئے تو انھوں نے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور جب علی کو نہیں دیکھا تو اُن کی نسبت پوچھا کچھ انصاری کھڑے ہوئے اور جا کر علی کو لے آئے اب ابوبکر نے ان سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور داماد بھی ہیں کیا آپ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔ علی نے کہا اے خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملامت نہ کیجئے اس کے بعد علی نے ابوبکر سے بیعت کر لی۔ امام حاکم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے شرط شیخین پر ہے اور انھوں نے صحیحین میں اس کو درج نہیں کیا ہے۔

ابن سعد میں حضرت حسن سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی نے فرمایا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ہم نے خلافت کے معاملہ میں غور و خوض کیا۔ اور ہم نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو نماز میں آگے کر دیا تھا۔ اس بناء پر ہم اپنی دنیا کے واسطے اس شخص سے راضی ہو گئے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دین کے لئے راضی ہوئے تھے۔ اب ہم نے بھی ابوبکر

[1] المستدرک للحاکم ج ۳ ص ۷۶.

کو آگے کر دیا یعنی بالاتفاق انھیں خلیفہ بنا دیا۔[۱]

اب ان تمام روایات کو سامنے رکھو ان سب پر یک جائی طور پر نگاہ ڈالو۔ حضرت ابو بکر اور حضرت علی دونوں کی جلالتِ شان اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا قرب و اختصاص پھر نفس خلافت کی اہمیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس وقت تبلیغ و اشاعت اور استحکام اسلام کے لئے باہمی اتفاق و اتحاد کی سخت ضرورت۔ ان سب کو بھی پیش نظر رکھو اور بتاؤ کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ صاف نظر آتا ہے کہ حضرت علی نے حضرت ابو بکر سے ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ بیعت کی ہے۔ پہلی بیعت بیعت خلافت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دوسرے ہی دن مسجد نبوی میں بیعت عامہ کے موقع پر کی گئی اور دوسری بیعت بیعت رضا ہے جو آپ نے حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد کی ہے اس بیعت کا مقصد آپس میں صلح صفائی کرنا اور باہمی تعلقات کو پھر از سر نو خوشگوار کر لینا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر حضرت ابو سعید الخدری کی روایت جو مستدرک کے حوالہ سے اوپر گذر چکی ہے اور جس سے حضرت علی کا پہلے ہی موقع پر بیعت کر لینا ثابت ہوتا ہے حافظ صاحب موصوف اس کو اصح بتاتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں

وجمع غیرہ بانہ بایعہ بیعۃً ثانیۃً موکدۃً للاولی لازالۃ ماکان وقع بسبب المیراث کما تقدم وعلی ھذا فقول الزھری لم یبایعہ علی فی تلک الایام علی ارادۃ الملازمۃ لہ والحضور عندہ وما اشبہ ذالک فان فی انقطاع مثلہ عن مثلہ مایوھم من لایعرف

اور دوسرے لوگوں نے دونوں روایتوں میں تطبیق اس طرح دی ہے کہ حضرت علی نے حضرت ابو بکر سے پہلی بیعت کو موکد کرنے کی غرض سے دوسری بیعت کی تھی۔ تاکہ میراث کی وجہ سے جو تکدر پیدا ہو گیا تھا وہ جاتا رہے۔ اس قول کی بناء پر زہری جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی نے بیعت نہیں کی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت علی حضرت ابو بکر کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور ان کے پاس آتے جاتے

[۱] ابن سعد تذکرہ حضرت ابو بکر

باطن الامر انہ بسبب عدم الرضا بخلافتہ فاطلق من اطلق ذالک وبسبب ذالک اظھر علی المبایعۃ التی بعد موت فاطمۃ علیھا السلام لازالۃ ھذہ الشبھۃ ۔ [1]

نہیں تھے ۔ کیوں کہ جو شخص حقیقت حال سے واقف نہیں تھا وہ حضرت علی جیسے شخص کو حضرت ابوبکر جیسی شخصیت سے کنارہ کش دیکھ کر یہی سمجھتا تھا کہ حضرت علی کا یہ طرز عمل اس بنا پر ہے کہ وہ حضرت ابوبکر کی خلافت سے راضی نہیں ہیں ۔ پس جس نے بیعت کی نفی کی ہے اسی وہم اور غلط فہمی کی وجہ سے کی ہے اور حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد حضرت علی نے جو بیعت کی تھی وہ درحقیقت اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے کی تھی

تاریخ اسلام کے نہایت مشہور محقق اور نقاد حافظ عماد الدین ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ حضرت ابوسعید الخدری کی مذکورہ بالا روایت اور اسی مضمون کی دوسری روایات کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں ۔

وھذا اللائق بعلی رضی اللہ عنہ والذی یدل علیہ الآثار من شھودہ معہ الصلوات وخروجہ معہ الی ذی القصۃ بعد موت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما سنوردہ وبذلہ لہ النصیحۃ والمشورۃ بین یدیہ [2]

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شایان شان یہی تھا اور اس پر دوسرے آثار بھی دلالت کرتے ہیں ۔ مثلاً حضرت علی کا حضرت ابوبکر کے ساتھ نمازوں میں شریک ہونا ۔ ذوالقصہ کے معرکہ میں جس کا بیان آگے آئے گا اور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد پیش آیا تھا حضرت علی کا حضرت ابوبکر کے ساتھ رہنا اور ان کو مشورہ دینا اور نصیحت کرنا ۔

---

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۳۷۹ [2] البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۳۰۲ ۔

اس کے بعد حافظ صاحب موصوف حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد بیعت کرنے کی روایت کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں:

واما ما یاتی من مبایعتہ ایاہ بعد موت فاطمۃ وقد ماتت بعد ابیھا علیہ السلام بستۃ اشھر فذالک محمول علی انھا بیعۃ ثانیۃ ازالت ماکان قد وقع من وحشۃ بسبب الکلام فی المیراث [1]	اور یہی وہ روایت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی نے حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد بیعت کی تھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دوسری بیعت تھی جس نے اس باہمی تکدر اور شکر رنجی کا ازالہ کر دیا جو میراث کے بارہ میں گفتگو سے پیدا ہو گئی تھی۔

حضرت علی کا تکدر طبع جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے اپنی جگہ مسلم! لیکن اس کا اثر یہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ خالص دین کے معاملہ میں حضرت علی کی طرف سے کسی طرح کی مداہنت صادر ہوتی امام قرطبی فرماتے ہیں "حضرت علی اور حضرت ابو بکر کے درمیان جو شکر رنجی ہوئی اور بعد میں حضرت علی نے اس کے لئے جو معذرت خواہی کی جو شخص بھی اس پوری داستان پر غور و خوض کرے گا اس کو اس میں کوئی شبہ نہیں رہے گا کہ دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے فضل و کمال کا اعتراف کرتا تھا اور دونوں کے دل میں ایک دوسرے کی محبت و احترام موجود تھا۔ اگرچہ بشری طبیعت کبھی کبھی غالب آجاتی تھی لیکن دیانت اس کو رد کر دیتی تھی۔" [2]

جہاں تک حضرت عائشہ کی روایت کا تعلق ہے جو صحیح بخاری میں ہے یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت عائشہ نے جو واقعہ بیان کیا ہے اُس کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب کہ حضرت فاطمہ نے میراث کا مطالبہ کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ ٹھیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے یا بیعت عامہ کے دن نہیں ہوا ہو گا بلکہ چند روز کے بعد جب کہ حضرت ابو بکر بحیثیت خلیفۂ اول کے معاملات و امورِ خلافت کو باقاعدہ انجام دینے لگے ہوں گے اس بنا پر عین بیعت عامہ کے دن

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۳۰۲　[2] بحوالہ فتح الباری ج ۷ ص ۳۷۹

حضرت فاطمہ کی رنجش کے باعث حضرت علی کا بیعت سے الگ رہنا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا کیوں کہ وجہ رنجش اب تک پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علی حضرت ابوبکر کے ساتھ گفتگو کے وقت اپنی رنجش کی وجہ میراث کے معاملہ کو نہیں بتاتے بلکہ اُس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق خصوصی کے باعث اس کو اپنا حق سمجھتے تھے کہ خلافت کا معاملہ طے کرتے وقت حضرت ابوبکر حضرت علی کو بھی اپنے اعتماد میں لیتے اور جس طرح انھوں نے حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ کو اس موقع پر اپنے ساتھ رکھا تھا حضرت علی کو بھی ساتھ رکھتے اور ان کی غیر موجودگی میں بالاہی بالا سقیفۂ بنی ساعدہ میں خلیفہ کے انتخاب کا مرحلہ طے نہ کرآتے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ حضرت علی کی کشیدگی کی اصل وجہ حضرت فاطمہ کا ہی تکدر طبع تھا۔ لیکن جب حضرت ابوبکر نے میراث کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی پڑھ کر سنا دیا تو اب حضرت علی کے لئے گنجائش نہ تھی کہ وہ میراث کے معاملہ کو اپنی رنجش کا سبب قرار دیں اس بنا پر جب صلح صفائی کا وقت آیا تو حضرت علی نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا بلکہ صرف امر خلافت کے بارہ میں ان کی بات نہ پوچھنے کا گلہ کیا یہ وہی بات ہے جس کو ارباب معانی کی زبان میں نکتہ بعد الوقوع کہتے ہیں۔

پھر یہ بھی دیکھو کہ حضرت عائشہ حضرت علی کے بیعت نہ کرنے کو "وما کان بایعہ" وغیرہ صاف لفظوں سے بیان نہیں فرمائیں جیسا کہ امام زہری کی روایت میں ہے۔ بلکہ "ولم یکن یبایع تلک الاشھر" جیسے غیر واضح لفظوں سے بیان فرماتی ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضرت عائشہ دراصل فرمانا یہ چاہتی ہیں کہ حضرت علی نے بیعت تو کرلی تھی لیکن چوں کہ اس کے بعد ہی رنجش پیدا ہوگئی اور اس کی وجہ سے وہ کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے اس لئے ان کا بیعت کرنا نہ کرنا دونوں برابر تھے۔ انھوں نے رسمی طور پر اگرچہ بیعت کرلی تھی مگر عملاً ایسا تھا کہ گویا بیعت کی ہی نہیں تھی۔

ہم نے یہ جو کچھ لکھا ہے اُس کی تائید طبری کی مندرجۂ ذیل دو روایتوں سے بھی ہوتی ہے

قال عمرو بن حریث لسعید بن زید — عمرو بن حریث نے سعید بن زید سے پوچھا کہ کیا آپ

اشهدت وفاة رسول الله صلى الله عليه وسلم قال فمتى بويع ابو بكر قال يوم مات رسول الله كرهوا ان يبقوا بعض يوم وليسوا في جماعة قال فخالف عليه احد قال لا الا مرتد او من قد كاد ان يرتد لولا ان الله عزوجل ينقذهم من الانصار قال فهل قعد احد من المهاجرين قال لا تتابع المهاجرون على بيعته من غير ان يدعوهم [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت موجود تھے۔ انھوں نے فرمایا ہاں پھر پوچھا کہ ابوبکر سے بیعت کب کی گئی؟ تو بولے کہ جس دن آنحضرت کی وفات ہوئی اسی دن۔ صحابہ اس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ دن کا ایک حصہ بھی اس طرح گذاریں کہ وہ جماعت کے ساتھ منسلک نہ ہوں اب عمرو بن حریث نے پوچھا کہ کیا ابوبکر کی کسی نے مخالفت کی تھی؟ سعید بن زید نے جواب دیا کہ نہیں البتہ مرتد نے یا انصار میں سے اس شخص نے مخالفت کی جو قریب تھا کہ مرتد ہو جاتا اگر اللہ تعالیٰ اس کو اس سے بچا نہ لیتا۔ اس کے بعد عمرو بن حریث نے دریافت کیا کہ کیا مہاجرین میں سے بھی کسی نے بیعت سے پہلو تہی کی تھی۔ سعید بن زید نے کہا کہ نہیں۔ مہاجرین تو بغیر بلائے ہی بیعت کے لئے ٹوٹ پڑے۔

اس روایت میں تو عام مہاجرین کی بیعت کا تذکرہ ہے جن میں خود حضرت علی بھی شامل تھے لیکن جہاں تک خاص حضرت علی کی ذات کا تعلق ہے اس کا ذکر اس روایت میں ہے اور اس قدر وضاحت وصراحت کے ساتھ کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔

حدثنا عبيد الله بن سعيد قال اخبرني عمي قال اخبرني سيف عن عبد العزيز بن سياه عن حبيب بن ابي

حبیب بن ابی ثابت سے مروی ہے کہ علی اپنے گھر میں تھے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ ابوبکر بیعت لینے کے لئے بیٹھے ہیں۔ علی یہ

[1] طبری ج ۲ ص ۴۴۷

ثابت قال کان علی فی بیتہ اذاُتی فقیل لہ قد جلس ابوبکر للبیعۃ فخرج فی قمیص ما علیہ ازارٌ ولا رداءٌ عجلاً کراھیۃ ان یبطئ عنہا حتی بایعہ ثم جلس الیہ وبعث الی ثوبہ فاتاہ فتجللہ ولزم مجلسہٗ

سنتے ہی صرف قمیص پہنے ہی باہر نکل آئے اُس وقت ان کے بدن پر نہ چادر تھی اور نہ تہبند۔ ان کو جلدی اس لئے تھی کہ وہ بیعت میں پیچھے رہ جانے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ابوبکر سے بیعت لی پھر اُن کے پاس جاکر بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے منگوائے جب وہ آگئے تو انھوں نے کپڑے پہنے اور ابوبکر کی مجلس میں بیٹھے رہے۔

---

[۱] طبری ج ۲ ص ۴۴۷

تزک بابری

از

(جناب محمد رحیم صاحب دہلوی)

(۵)

۹۰۰[1] ہجری کے حالات

چاندی سونے کے پستے بادام اس سال سلطان محمود مرزا کے پاس سے عبد القدوس ایلچی آیا۔

سلطان محمود مرزا نے اپنے بڑے بیٹے سلطان مسعود مرزا کی شادی اپنے بڑے بھائی سلطان احمد مرزا کی دوسری بیٹی[2] سے کی۔ اس شادی کا حصہ لایا تھا۔ اس شادی میں سونے چاندی کے پستے بادام بانٹے گئے۔

ایلچی کی بے ایمانی ایلچی نے بظاہر اپنے آنے کی وجہ حسن یعقوب کی رشتہ داری بتائی۔ لیکن در اصل وہ دل فریب وعدوں سے حسن یعقوب کو ملانے آیا تھا۔ حسن نے بھی کچھ کچھ آمادگی ظاہر کی بلکہ ان ہی کی طرف ہو گیا۔

شادی کی مبارک باد وغیرہ کی رسمیں ادا کرنے کے بعد قاصد کو رخصت کیا گیا۔

حسن یعقوب کی غداری پانچ چھ مہینے بعد حسن یعقوب کا رنگ بدلنا شروع ہوا۔ میرے عزیز دل وند دوستوں سے بدسلوکی کرنے لگا۔ اور یہاں تک بندوبست ہو گیا کہ مجھے بے وقوف بنا کر جہانگیر مرزا کو بادشاہ بنا دے۔

حسن یعقوب کا برتاو تمام امراء اور فوج کے ساتھ بھی اچھا نہ تھا۔ اب اس کے منصوبے سے جو سب واقف ہوئے تو خواجہ قاضی۔ قاسم قوچین، علی دوست طغائی، اوزون حسن

---

[1] مطابق ۹۵-۱۴۹۴ء [2] مسٹر جان لیڈی نے اپنے ترجمے میں لکھا تھا۔ "دوسری بیٹی آق بیگم سے کی"۔

اور دیگر دولت خواہ میری نانی الیسن دولت بیگم کے پاس حاضر ہوئے۔

الیسن دولت بیگم کا تدبر | مشورے کے بعد یہ طے پایا کہ حسن یعقوب کو معزول کردینا چاہیئے۔ اس کی معزولی سے فتنہ وفساد کا خاتمہ ہوجائے گا۔

میری نانی الیسن دولت بیگم الیسی صائب الرائے اور مدبر تھیں کہ عورتوں میں کم ہوتی ہیں۔ وہ بڑی دور اندیش اور عقلمند تھیں۔ اکثر کام ان ہی کے مشورے سے طے ہوتے تھے۔

حسن یعقوب کا فرار | حسن یعقوب ارک میں تھا میری نانی صاحبہ قلعہ سنگین میں جا قار[1] میں تھیں۔ یہاں سے میں اسی لئے ارک چلاگیا۔ حسن یعقوب شکار کھیلنے گیا ہوا تھا۔ میری خبر پہنچی تو ادھر کا ادھر ہی سمرقند چلاگیا۔ جو سردار وغیرہ اس سے ملے ہوئے تھے وہ گرفتار کئے گئے۔ ان میں محمد باقر بیگ اور سلطان محمود[2] دولدائی (سلطان محمد[3] دولدائی کا باپ) وغیرہ تھے۔ ان میں سے بعض کو میں نے سمرقند بھیج دیا۔

قاسم قوچین کی وزارت | اب حکومت اندجان اور عہدۂ وزارت پر قاسم قوچین مقرر ہوا۔

حسن یعقوب سمرقند جانے کے ارادے سے کندبادام تک گیا تھا۔ چند روز بعد آخشی میں فتنہ وفساد برپا کرنے کے خیال سے وہ خوقان[4] اور آخشی کے قریب آگیا۔ یہ خبر سنتے ہی کچھ سرداروں کو فوج کے ساتھ ایکا ایکی حملہ کردینے کے لئے اس کی طرف بھیجا گیا۔

حسن یعقوب کی موت | ان سرداروں نے کچھ فوج دشمن کی خیر خبر حاصل کرنے کے لئے آگے بھیجی۔ حسن یعقوب نے یہ سنتے ہی راتوں رات اس اگلی فوج پر جو اصلی فوج سے الگ تھلگ تھی شب خون مارا۔ ان کے خیموں کو گھیر لیا اور تیر برسانے شروع کئے لیکن اندھیری رات میں خود اسی کے ایک سپاہی کا تیر اس کی پیٹھ میں لگا۔ اور بھاگنے سے پہلے اس نے اپنے کئے کی سزا پائی۔

اپنے بُرے کاموں کی آفتوں سے ڈر۔ کیوں کہ تجھے ان کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

---

[1] قاچار [2] سلطان محمد [3] سلطان محمود [4] عربی جغرافیہ میں اس کو خوکند لکھا ہے۔ اور اب اس کو کوکان کہتے ہیں۔ یہ جگہ خجند اور آخشی کے راستے میں ہے۔

پرہیزگاری اسی سال میں نے مشتبہ کھانے سے پرہیز شروع کیا۔ یہاں تک کہ چھری، پچھے اور دستر خوان کی بھی احتیاط ہونے لگی۔ تہجد کی نماز بھی بہت کم قضا ہوتی تھی۔

سلطان محمود مرزا کا انتقال ربیع الثانی کے مہینے میں سلطان محمود مرزا سخت بیمار پڑا۔ اور چھ[2] دن میں مرگیا[1]۔ اس کی عمر تینتالیس سال تھی۔ ۸۵۷ھ میں پیدا ہوا۔ ابوسعید مرزا کا تیسرا بیٹا تھا۔ وہ اور سلطان احمد مرزا ایک ماں کے بیٹے سے تھے۔

وضع قطع مرزا کا حلیہ یہ تھا۔ ٹھگنا قد، چگی داڑھی، فربہ بدن۔

اخلاق و اطوار کا حال یہ تھا کہ نماز ترک نہ کرتا تھا۔ انتظام اور ہر بات کا قاعدہ بہت درستہ تھا۔ وہ حساب کتاب کا خوب ماہر تھا۔

نظم و ضبط اس کی حکومت کا ایک پیسہ بھی اس کی اطلاع کے بغیر خرچ نہ ہوتا۔ اس کے نوکروں کی تنخواہ ایک دن نہ چڑھتی، اس کی بزم، انعامات، بخشش، دربار اور دعوتوں کے قاعدے قرینے نہایت عمدہ تھے۔ جو دستور ایک دفعہ مقرر کر دیا۔ کیا مجال ہے کہ کوئی شخص یا کوئی سپاہی اس کو توڑ دے۔

پُرتکلف لباس اس کا لباس پُرتکلف اور اس زمانہ کے مطابق ہوتا تھا۔

شکار کا شوق شروع میں باز سے بہت شکار کھیلتا تھا۔ پھر نیل گائے کے شکار کا شوق ہو گیا

فسق و فجور آخر میں ظلم و ستم اور فسق و فجور بہت کرنے لگا تھا۔ رات دن شراب کا گلاس منہ سے لگا رہتا بیسیوں خوبصورت غلام پاس رکھا کرتا۔ اس کے ملک میں جہاں کوئی لڑکا خوبصورت نظر پڑتا۔ اس کو کسی نہ کسی طرح پکڑ کر لونڈوں میں داخل کر لیتا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اپنے امرار کے بچوں اور دودھ شریک بھائی بہنوں کے بچوں بلکہ دودھ شریک بھائیوں تک کو بھی ان میں داخل کر لیا کرتا۔

اس بیہودہ رسم نے اس کے زمانے میں اتنا رواج پایا کہ کوئی آدمی ایسا نہ تھا جس کے

---

[1] ۱۴۹۵ء [2] ۱۴۹۳ء

پاس لونڈا نہ ہو - بلکہ لونڈا نہ رکھنا عیب تھا۔ ان ہی بداعمالیوں کی شامت سے اس کے سارے
کے سارے بچے جوان ہی مرے۔

شعر و ادب | وہ شعر بھی کہتا تھا۔ پورا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ شعر تو بہت تھے مگر بدمزہ تھے۔ میرے
خیال میں ایسے شعر کہنے سے نہ کہنا اچھا ہے۔

بیہودہ حرکتیں | بداعتقاد آدمی تھا۔ حضرت خواجہ عبید اللہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ دل
کا اچھا نہ تھا۔ مزاج میں حیا بہت کم تھی۔ لُچے اور مسخرے اس کے ہم صحبت تھے۔ وہ سر دربار
اور علانیہ بیہودہ حرکتیں اور شرمناک باتیں کیا کرتے۔

بات اس بری طرح کرتا تھا کہ فوراً سمجھ میں نہ آتی تھی۔

سلطان محمود مرزا کے معرکے | وہ دو لڑائیاں سلطان حسین مرزا سے لڑا۔
ایک لڑائی استرآباد[1] میں، جہاں اُسے شکست ہوئی۔
دوسری لڑائی چکمن[2] کے مقام میں جو، اندخود[3] کے قریب ہے۔ اس لڑائی میں بھی اُسے
ہار ہوئی۔

دو دفعہ بدخشاں[4] کے جنوب میں کافرستان پر جہاد بولا۔ اسی سبب سے اس کے فرمانوں
میں سلطان محمود غازی لکھا جاتا تھا۔

مقبوضہ ملک | سلطان ابو سعید مرزا نے اپنے ملک میں سے استرآباد اس کو دیا تھا۔
عراق کے جھگڑے کے بعد وہ خراسان[5] گیا۔ اسی زمانہ میں حصار کا حاکم قنبر علی بیگ،
سلطان ابو سعید مرزا کے حکم سے ہندی فوج لے کر مرزا کی مدد کے لئے عراق چلا اور خراسان پہنچ
کر سلطان محمود مرزا سے جا ملا۔

---

[1] استرآباد خلیج کیسپین کے جنوب دمشرق میں ہے [2] چکمن کو بعض جگہ چکمان سرائے بھی لکھا ہے۔
[3] اندخود بلخ کے مغرب میں ۸۰ میل دور پہاڑ کے نیچے واقع ہے۔ [4] بدخشاں میں لعل اور سونے کی کانیں ہیں۔ بدخش، بدخشاں کا مخفف ہے۔ [5] خراسان دریائے جیحون کے اتر کی جانب ہے۔

خراسان والوں نے سلطان حسین مرزا کی شہرت سنی تو ان سب نے بلوہ کر کے سلطان محمود مرزا کو خراسان سے نکال باہر کیا۔ اور وہ سلطان احمد مرزا کے پاس سمرقند چلا گیا۔

کئی مہینے کے بعد احمد مشتاق، سید بدر اور خسرو شاہ وغیرہ سلطان محمود مرزا کو لے کر قنبر علی بیگ کے پاس گئے۔ پھر تہلقہ اور کوہ کوتین[1] کے جنوب کے ضلع ترمذ[2]، چغانیاں، حصار، ختلان[3]، قندز[4] اور بدخشاں وغیرہ کوہ ہندوکش تک، تمام ملک سلطان محمود مرزا کے قبضے میں آگیا۔

اس کے بڑے بھائی سلطان احمد مرزا کے مرنے کے بعد اُس کا ملک بھی اسی کے تحت آگیا۔

اولاد | اس کے پانچ بیٹے اور گیارہ بیٹیاں تھیں:۔

مسعود مرزا | سب سے بڑا مسعود مرزا تھا۔ اس کی ماں خان زادہ بیگم میر بزرگ ترمذی کی بیٹی تھی۔

بائسنغر مرزا | دوسرا بیٹا بائسنغر مرزا تھا۔ وہ پستہ بیگم کے بطن سے تھا۔

سلطان علی مرزا | تیسرا بیٹا سلطان علی مرزا تھا۔ اس کی ماں ازبکوں میں سے تھی۔ اس کا نام زہرہ بیگی آغا تھا اور وہ لونڈی تھی۔

سلطان حسین مرزا | چوتھا بیٹا سلطان حسین مرزا تھا۔ اس کی ماں میر بزرگ کی پوتی تھی۔ اس کا نام بھی خان زادہ بیگم تھا۔ یہ لڑکا تیرہ برس کی عمر میں مرزا کے سامنے ہی مر گیا۔

سلطان ویس مرزا | پانچواں بیٹا سلطان ویس مرزا تھا۔ اس کی والدہ یونس خاں کی بیٹی اور میری والدہ کی چھوٹی بہن سلطان نگار خانم تھیں۔

آئندہ برسوں کے واقعات میں ان لڑکوں کے حالات لکھے جائیں گے۔

بائسنغر کی سگی بہنیں | تین بیٹیاں بائسنغر مرزا کی سگی بہنیں تھیں۔

ان میں سے سب سے بڑی لڑکی کی شادی سلطان محمود مرزا نے اپنے چچا منوچہر مرزا کے بیٹے ملک محمد مرزا سے کی تھی۔

---

[1] کوہ کوتین قرتگین کی سرحد پر پہاڑی ملک ہے۔ [2] ترمذ، بلخ اور حصار کے بیچ میں دریائے آمو کے قریب واقع ہے۔ [3] ختلان، بدخشاں میں ہے۔ وہاں کے گھوڑے بہت مشہور ہیں۔ اس کو بعض جگہ خلتان بھی لکھا گیا ہے۔ [4] قندز، دریائے اکسیر اکے اوپر کی طرف ہے۔

اہلیہ ابا بکر کاشغری | پانچ بیٹیاں میر بزرگ کی پوتی خان زادہ بیگم کے پیٹ سے تھیں۔

ان میں سے سب سے بڑی کا بیاہ سلطان محمود مرزا کے بعد ابا بکر کاشغری سے ہوا۔

بیگہ بیگم | ان ہی میں سے دوسری بیٹی بیگہ بیگم تھی۔

سلطان حسین مرزا نے جب حصار کا محاصرہ کیا تو اپنے بیٹے حیدر مرزا سے (جو سلطان ابو سعید مرزا کی بیٹی پایندہ سلطان بیگم کے پیٹ سے تھا) اس کی شادی کر کے حصار کا محاصرہ اُٹھا لیا۔

آق بیگم | تیسری بیٹی آق بیگم تھی۔

چوتھی بیٹی کی منگنی عمر شیخ مرزا کے بیٹے جہانگیر مرزا سے اس زمانے میں ہوئی۔ جب سلطان حسین مرزا نے قندز پر چڑھائی کی اور عمر شیخ مرزا نے فوجی کمک کے ساتھ جہانگیر مرزا کو بھیجا۔

۹۱۰ھ[1] میں دریائے آموہ[2] کے کنارے پر باقی چغانیانی آ کر مجھ سے ملا۔ تو یہ بیگمات جو اپنی والدہ کے ساتھ ترمذ میں تھیں باقی چغانیانی کی بیوی کے ہمراہ میرے پاس آگئیں اور جب ہم کہمرد پہنچے تو اس کی شادی جہانگیر مرزا سے ہو گئی۔ اس کے ہاں ایک لڑکی ہوئی۔ وہ آج کل اپنی نانی خان زادہ بیگم کے پاس بدخشاں میں ہے۔

زینت سلطان بیگم | پانچویں بیٹی زینت[3] سلطان بیگم تھی۔ جب میں نے کابل لیا تو اپنی والدہ قتلق نگار خانم کے مشورے سے میں نے اس سے شادی کر لی۔ اس سے موافقت نہ ہوئی دو تین برس بعد چیچک میں اس کا انتقال ہوا۔

مخدومہ سلطان بیگم | ایک بیٹی کا نام مخدومہ سلطان بیگم ہے۔ وہ اور سلطان علی مرزا دونوں ایک ماں کے پیٹ سے ہیں۔ وہ مرزا سے بڑی ہے۔ اور اب بدخشاں میں ہے۔

رجب اور محب | دو اور لڑکیاں لونڈی کے پیٹ سے تھیں۔ ایک رجب سلطان اور دوسری محب سلطان۔

بیویاں اور لونڈیاں | سب سے بڑی بیوی خان زادہ بیگم تھی۔ وہ میر بزرگ کی بیٹی تھی۔ مرزا کو اس سے

---

[1] ۱۵۰۴ء [2] آموں اس دریا کا نام ہے جو ایران و توران کے بیچ میں ہے۔ [3] زینب سلطان بیگم

بڑی محبت تھی ۔ سلطان مسعود مرزا اسی کے پیٹ سے تھا ۔ وہ جب مری تو مرزا نے بڑا ماتم کیا ۔

خان زادہ بیگم | اس کے بعد میر بزرگ کی پوتی سے نکاح کرلیا ۔ وہ مرنے والی کی بھتیجی تھی ۔ اسے بھی خان زادہ بیگم ہی کہتے تھے ۔ یہ بیوی پانچ بیٹیوں اور ایک بیٹی کی ماں تھی ۔

پشہ بیگم | ایک بیوی پشہ بیگم تھی ۔ وہ علی شیر بیگ بہارتو کی بیٹی تھی ۔ علی شیر بیگ ترکمان[1] قراقوبلوق[2] کے امرا میں سے تھا ۔

پشہ بیگم کی پہلی شادی جہاں شاہ بارانی[3] قراقوبلوق کے بیٹے محمدی مرزا سے ہوئی تھی ۔

جس زمانے میں جہاں شاہ کی اولاد میں سے مرزا آق[4] قوب لوق کے بیٹے اوزون حسن نے عراق اور آذربائیجان[5] چھینا ۔ تو علی شیر بیگ کی اولاد نے قراقوب لوق ترکمانوں کے پانچ چھ ہزار گھروں سمیت[6] سلطان ابوسعید مرزا کی ملازمت کرلی ۔ اور ابوسعید مرزا کی شکست کے بعد اس ملک میں چلے آئے اور جب سلطان محمود مرزا سمرقند سے حصار میں آیا تو اس وقت ان لوگوں نے مرزا موصوف کی ملازمت کرلی ۔ مرزا نے اسی زمانے میں پشہ بیگم سے نکاح کیا ۔ اس بیگم سے ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہوئیں ۔

سلطان نگار خانم | ایک بیوی سلطان نگار خانم تھی ۔ اس کا حسب نسب اوپر لکھا جاچکا ہے ۔

زہرہ بیگی آغا | اور لونڈیاں بہت سی تھیں ۔ سب سے بڑھی چڑھی زہرہ بیگی آغا ازبک تھی ۔

سلطان ابوسعید مرزا کی زندگی میں اس سے تعلق ہوا یہ ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی ماں تھی ۔

لونڈیاں | لونڈیاں بہت سی تھیں ۔ ان میں سے دو کے ہاں دو بیٹیاں ہوئیں ۔ ان کا ذکر اوپر ہوچکا ہے ۔

خسرو شاہ | امراء میں سے اول ترکستان کی قوم قب[7] چاق میں سے خسرو شاہ تھا ۔

لڑکپن میں اس نے ترخان امرا کی جوتیاں سیدھی کیں ۔ پھر مزید بیگ ارغون کی نوکری

---

[1] ترکمان ترکوں کی ایک قوم کا نام ہے ۔ انھیں ترکوں سے کمتر درجہ کا سمجھا جاتا ہے ۔ اسی لئے یہ نام مشہور ہوا ۔ ترکمان یعنی ترک کے مانند ۔ [2] کالی بھیڑوں والے یہ ان کے ہاں کا نشان ہے ۔ [3] بارانی ، ترکوں کے ایک قبیلہ کا نام ہے ۔ [4] سفید بھیڑوں والے ۔ [5] آذربائیجان تبریز کا ایک صوبہ ہے ۔ [6] اس زمانے میں مردم شماری کی بجائے گنتی کا بھی طریقہ رائج تھا کہ گھروں کی گنتی کی جاتی تھی ۔ [7] قب چاق یوں تو نڈر اور بے باک کو کہتے ہیں لیکن توازن اور ترکستان کے بیچ میں ایک جنگل کا نام بھی قب چاق تھا ۔ وہاں ڈاکو اور لٹیرے رہتے تھے ۔ ان کی قوم کا نام بھی قب چاق مشہور ہے ۔ (ق پر زبر ہے)

کر لی اُسی نے اس کو کسی قدر بڑھا چڑھا دیا۔

عراق کی تباہی و بربادی کے زمانے میں وہ سلطان محمود مرزا کے ساتھ ہو گیا۔ راستے میں اس نے مرزا کی خوب خدمت کی۔ اس لئے مرزا نے بھی اس کے ساتھ بڑی رعایتیں کیں۔ رفتہ رفتہ وہ بڑا آدمی بن گیا۔

سلطان محمود مرزا کے زمانے میں اس کے ملازمین کی تعداد پانچ چھ ہزار تک پہنچ گئی۔ دریائے آمو سے کوہ ہندوکش تک سوائے بدخشاں کے تمام ملک کا حاکم وہی تھا۔

وہاں کا تمام محصول وہی کھا اُڑا جاتا۔ وہ بہت مہمان نواز اور سخی آدمی تھا۔ اگرچہ ترک تھا لیکن مال گذاری وصول کرنے میں نہایت ہوشیار تھا۔ مگر جتنا پیدا کرتا سب کا سب اُڑا دیتا۔

سلطان محمود مرزا کے بیٹوں کے دور میں وہ بہت ہی بڑا آدمی ہو گیا۔ اس وقت اس کے ملازمین کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی۔ نماز کا پابند تھا اور کھانے پینے میں بھی احتیاط برتتا تھا۔ مگر سیاہ دل، فاسق، کودن، بے سمجھ، بے وفا اور نمک حرام آدمی تھا۔ اس نے چند روزہ دنیا کے لئے اپنے ایک آقازادے کو جسے اس نے خود پالا تھا اور اس کی خدمت کی تھی اندھا کر دیا اور دوسرے کو قتل کر ڈالا ان ناشائستہ حرکتوں کی وجہ سے وہ خدا کی درگاہ میں گنہگار ہوا۔ اور مخلوق کے نزدیک مردود ہو کر قیامت تک کے لئے نفرت و لعنت کے قابل ہو گیا۔

ناپائیدار دنیا کے لئے اس نے ایسے بُرے کام کئے۔ آخر میں اس قدر وسیع اور آباد ملک کے باوجود اور اتنے سامان جنگ اور نوکروں چاکروں کے ہوتے ہوئے ایک مرغی پر بھی اُس کا قابو نہ رہا۔ اس کے حالات اس کتاب میں آئندہ لکھے جائیں گے۔

پیر محمد ایلچی — امرا میں ایک شخص پیر محمد ایلچی توچین پہلوان تھا۔ بلخ کے دروازے پر جنگ ہزار اسپ میں سلطان ابو سعید مرزا کے سامنے دعویٰ کر کے خوب گھمسان لڑائی لڑا۔ وہ بہادر آدمی تھا۔ ہمیشہ مرزا کے پاس رہتا اور مرزا اس کے مشوروں پر عمل کرتا۔

ف مسٹر جان لیڈی کے یہاں یہ فقرہ زیادہ ہے کہ "اور خود سر ہو گیا تھا"

تزک بابری

از

(جناب محمد رحیم صاحب دہلوی)

(۵)

۹۰۰ھ سنہ ہجری کے حالات

چاندی سونے کے پستے بادام | اس سال سلطان محمود مرزا کے پاس سے عبدالقدوس ایلچی آیا۔

سلطان محمود مرزا نے اپنے بڑے بیٹے سلطان مسعود مرزا کی شادی اپنے بڑے بھائی سلطان احمد مرزا کی دوسری بیٹی[1] سے کی۔ اس شادی کا حصہ لایا تھا۔ اس شادی میں سونے چاندی کے پستے بادام بانٹے گئے۔

ایلچی کی بے ایمانی | ایلچی نے بظاہر اپنے آنے کی وجہ حسن یعقوب کی رشتہ داری بتائی۔ لیکن دراصل وہ دل فریب وعدوں سے حسن یعقوب کو ملانے آیا تھا۔ حسن نے بھی کچھ کچھ آمادگی ظاہر کی بلکہ ان ہی کی طرف ہو گیا۔

شادی کی مبارکباد وغیرہ کی رسمیں ادا کرنے کے بعد قاصد کو رخصت کیا گیا۔

حسن یعقوب کی غداری | پانچ چھ مہینے بعد حسن یعقوب کا رنگ بدلنا شروع ہوا۔ میرے عزیزوں دوستوں سے بدسلوکی کرنے لگا۔ اور یہاں تک بندوبست ہو گیا کہ مجھے بے وقوف بنا کر جہانگیر مرزا کو بادشاہ بنا دے۔

حسن یعقوب کا برتاؤ تمام امراء اور فوج کے ساتھ بھی اچھا نہ تھا۔ اب اس کے منصوبے سے جو سب واقف ہوئے تو خواجہ قاضی۔ قاسم قوچین، علی دوست طغائی، اوزون حسن

[1] مطابق ۱۴۹۴ء [2] مسٹر جان لیڈی نے اپنے ترجمے میں لکھا تھا "دوسری بیٹی آق بیگم سے کی"

اور دیگر دولت خواہ میری نانی ایسن دولت بیگم کے پاس حاضر ہوتے۔

ایسن دولت بیگم کا تدبر | مشورے کے بعد یہ طے پایا کہ حسن یعقوب کو معزول کر دینا چاہیئے۔ اس کی معزولی سے فتنہ و فساد کا خاتمہ ہو جائے گا۔

میری نانی ایسن دولت بیگم ایسی صائب الرائے اور مدبر تھیں کہ عورتوں میں کم ہوتی ہیں۔ وہ بڑی دور اندیش اور عقلمند تھیں۔ اکثر کام ان ہی کے مشورے سے طے ہوتے تھے۔

حسن یعقوب کا فرار | حسن یعقوب ارک میں تھا میری نانی صاحبہ قلعہ سنگین میں جا قار[1] میں تھیں۔ اس یہاں سے میں اسی لئے ارک چلا گیا۔ حسن یعقوب شکار کھیلنے گیا ہوا تھا۔ میری خبر پہنچی تو ادھر کا ادھر ہی سمرقند چلا گیا۔ جو سردار وغیرہ اس سے ملے ہوتے تھے وہ گرفتار کئے گئے۔ ان میں محمد باقر بیگ اور سلطان محمود[2] دولدائی (سلطان محمد[3] دولدائی کا باپ) وغیرہ تھے۔ ان میں سے بعض کو میں نے سمرقند بھیج دیا۔

قاسم قوچین کی وزارت | اب حکومت اندجان اور عہدہ وزارت پر قاسم قوچین مقرر ہوا۔

حسن یعقوب سمرقند جانے کے ارادے سے کندبادام تک گیا تھا۔ چند روز بعد اخشی میں فتنہ و فساد برپا کرنے کے خیال سے وہ خوقان[4] اور اخشی کے قریب آگیا۔

یہ خبر سنتے ہی کچھ سرداروں کو فوج کے ساتھ ایکا ایکی حملہ کر دینے کے لئے اس کی طرف بھیجا گیا۔

حسن یعقوب کی موت | ان سرداروں نے کچھ فوج دشمن کی خبر خبر حاصل کرنے کے لئے آگے بھیجی۔ حسن یعقوب نے یہ سنتے ہی راتوں رات اس اگلی فوج پر جو اصلی فوج سے الگ تھلگ تھی شب خون مارا۔ ان کے خیموں کو گھیر لیا اور تیر برسانے شروع کئے لیکن اندھیری رات میں خود اسی کے ایک سپاہی کا تیر اس کی پیٹھ میں لگا۔ اور بھاگنے سے پہلے اس نے اپنے کئے کی سزا پائی۔

اپنے بُرے کاموں کی آفتوں سے ڈر۔ کیوں کہ تجھے ان کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

---

[1] قاچار [2] سلطان محمد [3] سلطان محمود [4] عربی جغرافیہ میں اس کو خوکند لکھا ہے۔ اور اب اس کو کوکان کہتے ہیں۔ یہ جگہ خجند اور اخشی کے راستے میں ہے۔

|پرہیزگاری| اسی سال میں نے مشتبہ کھانے سے پرہیز شروع کیا۔ یہاں تک کہ چھری، چمچے اور دسترخوان کی بھی احتیاط ہونے لگی۔ تہجد کی نماز بھی بہت کم قضا ہوتی تھی۔

|سلطان محمود مرزا کا انتقال| ربیع الثانی کے مہینے میں سلطان محمود مرزا سخت بیمار پڑا۔ اور چھ دن میں مرگیا۔[1] اس کی عمر تینتالیس سال تھی۔ ۸۵۷ھ میں پیدا ہوا۔ ابوسعید مرزا کا تیسرا بیٹا تھا۔ وہ اور سلطان احمد مرزا ایک ماں کے پیٹ سے تھے۔

|وضع قطع| مرزا کا حلیہ یہ تھا۔ ٹھگنا قد، چگی داڑھی، فربہ بدن۔

اخلاق واطوار کا حال یہ تھا کہ نماز ترک نہ کرتا تھا۔ انتظام اور ہر بات کا قاعدہ بہت درست تھا۔ وہ حساب کتاب کا خوب ماہر تھا۔

|نظم وضبط| اس کی حکومت کا ایک پیسہ بھی اس کی اطلاع کے بغیر خرچ نہ ہوتا۔ اس کے نوکروں کی تنخواہ ایک دن نہ چڑھتی، اس کی بزم، انعامات، بخشش، دربار اور دعوتوں کے قاعدے قرینے نہایت عمدہ تھے۔ جو دستور ایک دفعہ مقرر کردیا۔ کیا مجال ہے کہ کوئی شخص یا کوئی سپاہی اس کو توڑ دے۔

|پُرتکلف لباس| اس کا لباس پُرتکلف اور اس زمانہ کے مطابق ہوتا تھا۔

|شکار کا شوق| شروع میں باز سے بہت شکار کھیلتا تھا۔ پھر نیل گائے کے شکار کا شوق ہوگیا

|فسق وفجور| آخر میں ظلم وستم اور فسق وفجور بہت کرنے لگا تھا۔ رات دن شراب کا گلاس منہ سے لگا رہتا بیسیوں خوبصورت غلام پاس رکھا کرتا۔ اس کے ملک میں جہاں کوئی لڑکا خوبصورت نظر پڑتا۔ اس کو کسی نہ کسی طرح پکڑ کر لونڈوں میں داخل کرلیتا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اپنے امرار کے بچوں اور دودھ شریک بھائی بہنوں کے بچوں بلکہ دودھ شریک بھائیوں تک کو بھی ان میں داخل کرلیا کرتا۔

اس بیہودہ رسم نے اس کے زمانے میں اتنا رواج پایا کہ کوئی آدمی ایسا نہ تھا جس کے

---

[1] ۱۴۹۵ء ۱۴۹۳ء

پاس لونڈا نہ ہو۔ بلکہ لونڈا نہ رکھنا عیب تھا۔ ان ہی بداعمالیوں کی شامت سے اس کے سارے کے سارے بچے جوان ہی مرے۔

شعر و ادب | وہ شعر بھی کہتا تھا۔ پورا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ شعر تو بہت تھے مگر بدمزہ تھے۔ میرے خیال میں ایسے شعر کہنے سے نہ کہنا اچھا ہے۔

بیہودہ حرکتیں | بداعتقاد آدمی تھا۔ حضرت خواجہ عبیداللہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ دل کا اچھا نہ تھا۔ مزاج میں حیا بہت کم تھی۔ لُچے اور مسخرے اس کے ہم صحبت تھے۔ وہ بھرے دربار اور علانیہ بیہودہ حرکتیں اور شرمناک باتیں کیا کرتے۔

بات اس بری طرح کرتا تھا کہ فوراً سمجھ میں نہ آتی تھی۔

سلطان محمود مرزا کے معرکے | وہ دو لڑائیاں سلطان حسین مرزا سے لڑا۔

ایک لڑائی استرآباد[1] میں، جہاں اُسے شکست ہوئی۔

دوسری لڑائی چکمن[2] کے مقام میں جو، اندخود[3] کے قریب ہے۔ اس لڑائی میں بھی اُسے ہار ہوئی۔

دو دفعہ بدخشاں[4] کے جنوب میں کافرستان پر جہاد بولا۔ اسی سبب سے اس کے فرمانوں میں سلطان محمود غازی لکھا جاتا تھا۔

مقبوضہ ملک | سلطان ابوسعید مرزا نے اپنے ملک میں سے استرآباد اس کو دیا تھا۔

عراق کے جھگڑے کے بعد وہ خراسان[5] گیا۔ اسی زمانہ میں حصار کا حاکم قنبر علی بیگ، سلطان ابوسعید مرزا کے حکم سے ہندی فوج لے کر مرزا کی مدد کے لئے عراق چلا اور خراسان پہنچ کر سلطان محمود مرزا سے جا ملا۔

---

[1] استرآباد خلیج کیسپین کے جنوب و مشرق میں ہے۔ [2] چکمن کو بعض جگہ چکمان سرائے بھی لکھا ہے۔
[3] اندخود بلخ کے مغرب میں ۸۰ میل دور پہاڑ کے نیچے واقع ہے۔ [4] بدخشاں میں لعل اور سونے کی کانیں ہیں۔ بدخش، بدخشاں کا مخفف ہے۔ [5] خراسان دریائے جیحون کے اتر کی جانب ہے۔

خراسان والوں نے سلطان حسین مرزا کی شہرت سنی تو ان سب نے بلوہ کر کے سلطان محمود مرزا کو خراسان سے نکال باہر کیا۔ اور وہ سلطان احمد مرزا کے پاس سمرقند چلا گیا۔

کئی مہینے کے بعد احمد مشتاق، سید بدر اور خسرو شاہ وغیرہ سلطان محمود مرزا کو لے کر قنبر علی بیگ کے پاس گئے۔ پھر تہلقہ اور کوہ کوتین[1] کے جنوب کے ضلع ترمذ[2]، چغانیاں، حصار۔ ختلان[3]۔ قندز[4] اور بدخشاں وغیرہ کوہ ہندوکش تک تمام ملک سلطان محمود مرزا کے قبضے میں آ گیا۔

اس کے بڑے بھائی سلطان احمد مرزا کے مرنے کے بعد اُس کا ملک بھی اسی کے تحت آ گیا۔

اولاد اس کے پانچ بیٹے اور گیارہ بیٹیاں تھیں:۔

مسعود مرزا سب سے بڑا مسعود مرزا تھا۔ اس کی ماں خاں زادہ بیگم میر بزرگ ترمذی کی بیٹی تھی۔

بائسنغر مرزا دوسرا بیٹا بائسنغر مرزا تھا۔ وہ پستہ بیگم کے بطن سے تھا۔

سلطان علی مرزا تیسرا بیٹا سلطان علی مرزا تھا۔ اس کی ماں ازبکوں میں سے تھی۔ اس کا نام زہرہ بیگی آغا تھا اور وہ لونڈی تھی۔

سلطان حسین مرزا چوتھا بیٹا سلطان حسین مرزا تھا۔ اس کی ماں میر بزرگ کی پوتی تھی۔ اس کا نام بھی خان زادہ بیگم تھا۔ یہ لڑکا تیرہ برس کی عمر میں مرزا کے سامنے ہی مر گیا۔

سلطان ویس مرزا پانچواں بیٹا سلطان ویس مرزا تھا۔ اس کی والدہ یونس خاں کی بیٹی اور میری والدہ کی چھوٹی بہن سلطان نگار خانم تھیں۔

آئندہ برسوں کے واقعات میں ان لڑکوں کے حالات لکھے جائیں گے۔

بائسنغر کی سگی بہنیں تین بیٹیاں بائسنغر مرزا کی سگی بہنیں تھیں۔

ان میں سے سب سے بڑی لڑکی کی شادی سلطان محمود مرزا نے اپنے چچا منوچہر مرزا کے بیٹے ملک محمد مرزا سے کی تھی۔

---

[1] کوہ کوتین قرتگین کی سرحد پر پہاڑی ملک ہے۔ [2] ترمذ، بلخ اور حصار کے بیچ میں دریائے آمو کے قریب واقع ہے۔ [3] ختلان، بدخشاں میں ہے۔ وہاں کے گھوڑے بہت مشہور ہیں۔ اس کو بعض جگہ خلتان بھی لکھا گیا ہے۔ [4] قندز، دریائے اکسیرا کے اوپر کی طرف ہے۔

اہلیہ ابابکر کاشغری | پانچ بیٹیاں میر بزرگ کی پوتی خان زادہ بیگم کے پیٹ سے تھیں۔

ان میں سے سب سے بڑی کا بیاہ سلطان محمود مرزا کے بعد ابابکر کاشغری سے ہوا۔

بیگہ بیگم | ان ہی میں سے دوسری بیٹی بیگہ بیگم تھی۔

سلطان حسین مرزا نے جب حصار کا محاصرہ کیا تو اپنے بیٹے حیدر مرزا سے (جو سلطان ابو سعید مرزا کی بیٹی پایندہ سلطان بیگم کے پیٹ سے تھا) اس کی شادی کر کے حصار کا محاصرہ اٹھا لیا۔

آق بیگم | تیسری بیٹی آق بیگم تھی۔

چوتھی بیٹی کی منگنی عمر شیخ مرزا کے بیٹے جہانگیر مرزا سے اس زمانے میں ہوئی۔ جب سلطان حسین مرزا نے قندز پر چڑھائی کی اور عمر شیخ مرزا نے فوجی کمک کے ساتھ جہانگیر مرزا کو بھیجا۔

۹۱۰ھ[1] میں دریائے آموں[2] کے کنارے یہ باقی چغانیانی آکر مجھ سے ملا۔ تو یہ بیگمات جو اپنی والدہ کے ساتھ ترمذ میں تھیں باقی چغانیانی کی بیوی کے ہمراہ میرے پاس آگئیں اور جب ہم کھمرد پہنچے تو اس کی شادی جہانگیر مرزا سے ہو گئی۔ اس کے ہاں ایک لڑکی ہوئی۔ وہ آج کل اپنی نانی خان زادہ بیگم کے پاس بدخشاں میں ہے۔

زینت سلطان بیگم | پانچویں بیٹی زینت سلطان[3] بیگم تھی۔ جب میں نے کابل لیا تو اپنی والدہ قتلق نگار خانم کے مشورے سے میں نے اس سے شادی کر لی۔ اس سے موافقت نہ ہوئی دو تین برس بعد چیچک میں اس کا انتقال ہوا۔

مخدومہ سلطان بیگم | ایک بیٹی کا نام مخدومہ سلطان بیگم ہے۔ وہ اور سلطان علی مرزا دونوں ایک ماں کے پیٹ سے ہیں۔ وہ مرزا سے بڑی ہے۔ اور اب بدخشاں میں ہے۔

رجب اور محب | دو اور لڑکیاں لونڈی کے پیٹ سے تھیں۔ ایک رجب سلطان اور دوسری محب سلطان۔

بیویاں اور لونڈیاں | سب سے بڑی بیوی خان زادہ بیگم تھی۔ وہ میر بزرگ کی بیٹی تھی۔ مرزا کو اس سے

[1] ۱۵۰۴ء [2] آموں اس دریا کا نام ہے جو ایران و توران کے بیچ میں ہے۔ [3] زینب سلطان بیگم

بڑی محبت تھی۔ سلطان مسعود مرزا اسی کے پیٹ سے تھا۔ وہ جب مری تو مرزا نے بڑا ماتم کیا۔

خان زادہ بیگم | اس کے بعد میر بزرگ کی پوتی سے نکاح کرلیا۔ وہ مرنے والی کی بھتیجی تھی۔ اسے بھی خان زادہ بیگم ہی کہتے تھے۔ یہ بیوی پانچ بیٹیوں اور ایک بیٹی کی ماں تھی۔

پشہ بیگم | ایک بیوی پشہ بیگم تھی۔ وہ علی شیر بیگ بہارتو کی بیٹی تھی۔ علی شیر بیگ ترکمان[1] قراقوبلوق[2] کے امرا میں سے تھا۔

پشہ بیگم کی پہلی شادی جہان شاہ یارانی[3] قراقوبلوق کے بیٹے محمدی مرزا سے ہوئی تھی۔

جس زمانے میں جہاں شاہ کی اولاد میں سے مرزا آق قوب لوق[4] کے بیٹے اوزون حسن نے عراق اور آذربائیجان[5] چھینا۔ تو علی شیر بیگ کی اولاد نے قراقوب لوق ترکمانوں کے پانچ چھ ہزار گھروں[6] سمیت سلطان ابو سعید مرزا کی ملازمت کرلی۔ اور ابو سعید مرزا کی شکست کے بعد اس ملک میں چلے آئے اور جب سلطان محمود مرزا سمرقند سے حصار میں آیا تو اس وقت ان لوگوں نے مرزا موصوف کی ملازمت کرلی۔ مرزا نے اسی زمانے میں پشہ بیگم سے نکاح کیا۔ اس بیگم سے ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہوئیں۔

سلطان نگار خانم | ایک بیوی سلطان نگار خانم تھی۔ اس کا حسب نسب اوپر لکھا جاچکا ہے۔

زہرہ بیگی آغا | اور لونڈیاں بہت سی تھیں۔ سب سے بڑھی چڑھی زہرہ بیگی آغا ازبک تھی۔

سلطان ابو سعید مرزا کی زندگی میں اس سے تعلق ہوا یہ ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی ماں تھی۔

لونڈیاں | لونڈیاں بہت سی تھیں۔ ان میں سے دو کے ہاں دو بیٹیاں ہوئیں۔ ان کا ذکر اوپر ہوچکا ہے

خسرو شاہ | امراء میں سے اول ترکستان کی قوم قب چاق[7] میں سے خسرو شاہ تھا۔

لڑکپن میں اس نے ترخان امرا کی جوتیاں سیدھی کیں۔ پھر مزید بیگ ارغون کی نوکری

---

[1] ترکمان ترکوں کی ایک قوم کا نام ہے۔ انھیں ترکوں سے کمتر درجہ کا سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے یہ نام مشہور ہوا۔ ترکمان یعنی ترک کے مانند۔ [2] کالی بھیڑوں والے یہ ان کے ہاں کا نشان ہے۔ [3] یارانی، ترکوں کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ [4] سفید بھیڑوں والے۔ [5] آذربائیجان تبریز کا ایک صوبہ ہے۔ [6] اس زمانے میں مردم شماری کی بجائے گنتی کا بھی طریقہ رائج تھا کہ گھروں کی گنتی کی جاتی تھی۔ [7] قب چاق یوں تو نڈر اور بے باک کو کہتے ہیں لیکن توازن اور ترکستان کے بیچ میں ایک جنگل کا نام بھی قب چاق تھا۔ وہاں ڈاکو اور لٹیرے رہتے تھے۔ ان کی قوم کا نام بھی قب چاق مشہور ہے۔ (ق پر زبر ہے)

کرلی اُسی نے اس کو کسی قدر بڑھا چڑھا دیا۔

عراق کی تباہی و بربادی کے زمانے میں وہ سلطان محمود مرزا کے ساتھ ہوگیا۔ راستے میں اس نے مرزا کی خوب خدمت کی۔ اس لئے مرزا نے بھی اس کے ساتھ بڑی رعائتیں کیں۔ رفتہ رفتہ وہ بڑا آدمی[1] بن گیا۔

سلطان محمود مرزا کے زمانے میں اس کے ملازمین کی تعداد پانچ چھ ہزار تک پہنچ گئی۔ دریائے آمو سے کوہ ہندوکش تک سوائے بدخشاں کے تمام ملک کا حاکم وہی تھا۔

وہاں کا تمام محصول وہی کھا اُڑا جاتا۔ وہ بہت مہمان نواز اور سخی آدمی تھا۔ اگرچہ ترک تھا لیکن مال گذاری وصول کرنے میں نہایت ہوشیار تھا۔ مگر جتنا پیدا کرتا سب کا سب اُڑا دیتا۔

سلطان محمود مرزا کے بیٹوں کے دور میں وہ بہت ہی بڑا آدمی ہوگیا۔ اس وقت اس کے ملازمین کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی۔ نماز کا پابند تھا اور کھانے پینے میں بھی احتیاط برتتا تھا۔ مگر سیاہ دل، فاسق، کودن، بے سمجھ، بے وفا اور نمک حرام آدمی تھا۔ اس نے چند روزہ دنیا کے لئے اپنے ایک آقازادے کو جسے اس نے خود پالا تھا اور اس کی خدمت کی تھی اندھا کر دیا اور دوسرے کو قتل کر ڈالا ان ناشائستہ حرکتوں کی وجہ سے وہ خدا کی درگاہ میں گنہگار ہوا۔ اور مخلوق کے نزدیک مردود ہوکر قیامت تک کے لئے نفرت و لعنت کے قابل ہوگیا۔

ناپائیدار دنیا کے لئے اس نے ایسے بُرے کام کئے۔ آخر میں اس قدر وسیع اور آباد ملک کے باوجود اور اتنے سامان جنگ اور نوکروں چاکروں کے ہوتے ہوئے ایک مرغی پر بھی اُس کا قابو نہ رہا۔ اس کے حالات اس کتاب میں آئندہ لکھے جائیں گے۔

پیر محمد ایلچی امرا میں ایک شخص پیر محمد ایلچی قوچین پہلوان تھا۔ بلخ کے دروازے پر جنگ ہزار اسپ میں سلطان ابوسعید مرزا کے سامنے دعویٰ کر کے خوب گھمسان لڑائی لڑا۔ وہ بہادر آدمی تھا۔ ہمیشہ مرزا کے پاس رہتا اور مرزا اس کے مشوروں پر عمل کرتا۔

---

[1] مسٹر جان لیڈن کے یہاں یہ فقرہ زیادہ ہے کہ "اور خود سر ہو گیا تھا"

سلطان حسین مرزا نے جب قندز کا محاصرہ کیا۔ اس وقت اس نے خسرو شاہ کی چوٹ پر تھوڑی سی بے سرو سامان فوج لے کر بے دیکھے بھالے اور بے سوچے سمجھے شبخون مارا۔ مگر کچھ نہ بنا سکا۔ اتنے بڑے لشکر کے مقابلے میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس کے پیچھے دشمن نے تعاقب کیا۔

وہ دریا میں کود پڑا اور وہیں ڈوب گیا۔

ایوب بے حیا | ایک شخص ایوب تھا۔ وہ سلطان ابو سعید مرزا کے ہاں خراسانی جوانوں کے گروہ میں شامل تھا بہادر آدمی تھا۔ بائسنغر مرزا کی سرکار میں مختار تھا۔ کھانے پہننے میں کفایت شعار تھا۔ بڑا مسخرہ اور چالاک آدمی تھا۔ سلطان محمود مرزا اس کو "بے حیا" کہتا تھا۔

ولی | ایک شخص ولی تھا۔ وہ خسرو شاہ کا سگا چھوٹا بھائی تھا۔ اپنے ملازمین کو اچھی طرح رکھتا تھا۔ اس نے سلطان مسعود مرزا کو اندھا کیا تھا اور اسی نے بائسنغر مرزا کو قتل کرایا تھا۔

وہ ہر ایک کی غیبت کیا کرتا تھا۔ بدزبان۔ فحش گو۔ خود پسند اور بد دماغ آدمی تھا۔ اور اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔

میں نے جب نواح کہل کاٹے اور دوشی میں جو قندز کے نواح میں ہیں۔ خسرو شاہ کو اس کے ملازمین سے الگ کر کے اسے رخصت کیا تو ولی ازبک سے ڈر کر اندراب اور سراب چلا گیا۔ اس نواح کی قوموں نے بھی اس کو شکست دے کر لوٹ لیا۔ اور وہی قومیں مجھ سے اجازت لے کر کابل آ گئیں۔

ولی، شیبانی خاں کے پاس چلا گیا۔ شیبانی خاں نے اسے سمرقند میں مروا ڈالا۔

شیخ عبداللہ برلاس | ایک شخص شیخ عبداللہ برلاس تھا۔

سلطان محمد کی ایک بیٹی جو سلطان محمود خاں اور ابابکر مرزا کی خالہ تھی اس کی بیوی تھی۔

وہ زرق برق اور چست لباس پہنتا تھا۔ شریف اور اصیل آدمی تھا۔

محمود برلاس | ایک شخص نون داک کے برلاسوں میں سے محمود برلاس تھا۔ وہ ابو سعید مرزا کے زمانے ہی میں امراء میں داخل ہو گیا تھا[1]۔

---

[1] جب اس شہزادے نے عراق فتح کیا تو کرمان محمود برلاس کو دے دیا۔ مسٹر جان لیڈن نے اپنے ترجمے میں اس فقرہ کا ترجمہ نہیں کیا ہے۔

جس زمانے میں ابا بکر مرزا نے مزید بیگ ارغون اور ترکمان امرا کو ساتھ لے کر سلطان محمود خاں پر چڑھائی کی اور مرزا اپنے بھائی کے پاس سمرقند چلا گیا۔ تب بھی محمود برلاس نے حصار نہ چھوڑا اور اس کو خوب سنبھالا۔

وہ شاعر تھا اور صاحب دیوان تھا۔

خسرو شاہ کو سمرقند سے نکالا گیا | سلطان محمود مرزا کے مرنے کی خبر خسرو شاہ نے لوگوں سے چھپائی۔ اور خزانے پر ہاتھ ڈالا۔ ایسی خبر کس طرح چھپی رہتی۔ فوراً تمام شہر میں خبر اڑ گئی۔ اور سمرقند والوں کے ہاں تو گویا اس دن گھی کے چراغ جل گئے۔

فوج اور رعیت نے بلوہ کر کے خسرو شاہ کو گھیر لیا۔ احمد حاجی بیگ اور ترخان امرا نے اس فساد کو ٹھنڈا کیا اور خسرو شاہ کو اس کشمکش سے نکال کر حصار کی طرف بھیج دیا۔

سمرقند کا تخت بائسنغر کو ملا | سلطان محمود مرزا نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے مسعود مرزا کو حصار اور بائسنغر مرزا کو بخارا کا حاکم بنا دیا تھا۔ اس موقع پر ان دونوں میں سے سمرقند میں کوئی نہ تھا۔ خسرو شاہ کے جانے کے بعد سمرقند اور حصار کے امرا نے متفقہ طور پر بائسنغر مرزا کے پاس آدمی دوڑایا۔ اور اس کو بلا کر سمرقند کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس وقت بائسنغر مرزا کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔

سمرقند پر محمود خاں کا حملہ | اسی زمانے میں سلطان جنید برلاس اور سمرقند کے بعض اکابر کے اشارے پر محمود خاں نے سمرقند لینے کے لئے چڑھائی کی اور کنبائی[1] کے قریب آ گیا۔

بائسنغر مرزا بھی سمرقند سے اپنی بہت سی ہتھیار بند فوج لے کر باہر نکلا۔ کنبائی کے قریب مقابلہ ہوا حیدر کوکلتاش[2] مغلوں کی فوج کا بڑا سردار اور ہراول تھا وہ اور اس کے ساتھی گھوڑوں سے اتر کر شیبہ[3] مارنے لگے۔

سمرقند اور حصار کی فوج کے ہتھیار بند اور من چلے جوانوں نے سوار ہو کر فوراً گھوڑے کو

---

[1] کنبائی کو قلمی نسخے میں کی بائی لکھا ہے اور یہ سمرقند کے قریب ہے۔

[2] کوکلتاش دودھ شریک بھائی کو کہتے ہیں۔ [3] "شیبہ" ایک قسم کا تیر۔

کو ڈٹ پایا۔ حیدر کوکلتاش کے حکم سے جو لوگ گھوڑوں سے اتر پڑے تھے۔ وہ دشمن کے گھوڑوں کی روندن میں آگئے۔ اس تباہی کے بعد باقی فوج مقابلہ نہ کر سکی۔ اور مغلوں کو شکست ہوئی اور بہت سے آدمی مارے گئے۔

بائستغر مرزا نے بھی ان میں سے بہت سے آدمیوں کو اپنے سامنے قتل کروایا۔ مقتولین کی اتنی کثرت تھی کہ مرزا کا خیمہ تین جگہ بدلا گیا۔[1]

ابراہیم سارو کی بغاوت | ابراہیم سارو نے (جو قوم منیکلیغ میں سے تھا اور بچپن سے میرے والد کی خدمت میں رہ کر امیری کے درجہ پر پہنچا تھا۔ اور آخر میں کسی جرم کے سبب نکال دیا گیا تھا) قلعۂ اسفرہ میں آکر بائستغر مرزا کا خطبہ پڑھوایا اور میری مخالفت کی۔

قلعۂ اسفرہ پر بابر کا حملہ | میں ابراہیم سارو کے فتنہ و فساد کو کچلنے کے لئے شعبان[2] میں اپنے لشکر کے ساتھ روانہ ہوا۔ اور آخر مہینے میں اسفرہ کے سامنے جا اترا۔

ہمارے سپاہیوں نے اسی دن دلیری کی اور پرانے قلعہ کی دیوار کے پاس پہنچتے ہی نئے قلعہ کو جو ان ہی دنوں بنا تھا چھین لیا۔

انعام کے طور پر جھوٹا کھانا کھانے کی رسم | آج سید قاسم ایشک آغا سب سے اول رہا۔ اس نے سب سے پہلے فوج میں سے نکل کر شمشیر زنی کی سلطان احمد تنبل اور دوست محمد طغائی نے بھی بہت کوشش کی۔ مگر جھوٹا کھانا[3] سید قاسم ہی نے حاصل کیا۔

جھوٹا کھانا حاصل کرنا مغلوں میں قدیم رسم ہے۔ کھانے پینے کے موقع پر جو آدمی سب میں سے اکیلا تلوار مارتا ہے وہ بہادری کے اس انعام کو پاتا ہے

میں جب اپنے ماموں سلطان محمود خاں سے ملنے شاہرخیہ[4] گیا تو بہادری کا یہ انعام سید قاسم

---

[1] قیدیوں میں سے ایک ایک قیدی شاہی خیمے کے سامنے لایا جاتا تھا اور قتل کیا جاتا تھا" مسٹر جان لیڈن کے ترجمے میں یہ فقرہ اور درج ہے۔ [2] ۸۹۹ھ ۱۴۹۵ء [3] اس رسم کا نام الش بہادری ہے۔ الش عربی ہے۔ اس کے معنی اس کھانے کے ہیں جو جھوٹا بچ جاتا ہے۔ لیکن عموماً اس کا استعمال امراء کے جھوٹے کھانے پر ہوتا ہے۔ یونانیوں کے ہاں بھی یہ رسم تھی۔ [4] شاہرخیہ، غالباً شاہ رخ سے منسوب ہے۔ وہ تیمور کا بیٹا تھا

نے لیا۔

دودھ شریک بھائی کی موت | پہلے دن کی لڑائی میں میرا دودھ شریک بھائی خدا بیردی سے چپلہ تیر کھا کر مرا۔ ہم نے بغیر زرہ بکتر مقابلہ کیا۔ اس لئے ہمارے بہت سے سپاہی مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔

بے نظیر تیر انداز | ابراہیم سارو کے پاس ایک آدمی نہایت عمدہ تیر انداز تھا۔ ایسا تیر انداز نہ دیکھا نہ سنا اس نے ہمارے بہت سے آدمیوں کو زخمی کیا۔ قلعہ فتح ہونے کے بعد اس نے میری ملازمت کر لی۔

ابراہیم سارو کی شکست | محاصرے کو جب بہت دن گزر گئے۔ تو میں نے دو تین جگہ ٹیلے بنا کر سرنگ لگانے کا حکم دیا قلعہ لینے کے لئے لوگ اسباب جمع کرنے میں مشغول ہوئے۔ اور محاصرے کو چالیس دن گذر گئے۔ آخر ابراہیم سارو تنگ ہو گیا۔ اور خواجہ مولانا کی معرفت اس نے فرمانبرداری اختیار کی۔ شوال کے[1] مہینے میں وہ ترکش اور تلوار گلے[2] میں ڈال کر حاضر ہوا اور شہر ہمارے سپرد کر دیا۔

خجند پر حملہ | خجند مدت سے عمر شیخ مرزا کے زیر تحت تھا۔ لڑائی جھگڑوں میں مرزا کی سرکار بگڑی تو سلطان احمد مرزا نے اسکو دبا لیا۔

میں جب اس کے قریب پہنچ گیا تو اس پر حملہ کر دیا وہاں میر مغل کا باپ عبدالوہاب شغاول حاکم تھا۔ جیسے ہی میں وہاں پہنچا۔ اس نے بغیر تامل شہر حوالے کر دیا۔

محمود خاں کی خدمت میں حاضری | اسی زمانے میں محمود خاں شاہرخیہ آئے ہوئے تھے۔ سلطان احمد مرزا جن دنوں اندجان کی نواح میں آیا تھا۔ اسی زمانے میں خان نے بھی آخشی کو گھیر لیا تھا۔ تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے۔

مصلحت | میں نے سوچا مجھ میں ان میں تھوڑا ہی سا فاصلہ ہے۔ وہ باپ اور بڑے بھائی کے برابر ہیں۔ ان کی خدمت میں پہنچنا چاہیے۔ اس طرح پچھلی رنجشیں ختم ہو جائیں گی۔ دیکھنے والے دیکھیں گے اور سننے والے سنیں گے تو میرے لئے مفید ہو گا۔ یہ سوچ کر میں چل پڑا۔

(باقی آئندہ)

---

[1] صلیبی کمان کا تیر [2] جون ۱۴۹۵ء [3] ترکوں میں یہ عاجزی اور اطاعت مندی کی علامت ہے۔

عروج وزوال کے الٰہی قوانین

از

(جناب مولوی محمد تقی صاحب امینی)

(۵)

یہ واقعہ ہے کہ ان حقائق کے باوجود اسلام اور جہاد پر وہی اعتراض کرے گا جس نے بقول "موسیو سیدیو" حق سے کان بند کر لیا ہو اور قلب کی بینائی سے محروم ہو گیا ہو۔

ایمان کے لئے مرکزیت اطاعت اور اتحاد ضروری ہے | دنیا کا یہ مسلمہ فیصلہ ہے کہ قومی اور جماعتی زندگی کی کامیابی کے لئے تنظیم ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ تنظیم کی بنیاد تین چیزوں پر ہے۔

۱۔ مرکزیت ۲۔ اطاعت ۳۔ اور اتحاد

یہ تینوں وصف عمدگی کے ساتھ اسی صورت میں پائے جا سکتے ہیں جب کہ افراد میں وحدت فکر پائی جائے دراصل تنظیم کی جان یہی وحدت فکر ہے اسی بنا پر علماء نفسیات کی اصطلاح میں جماعت کا اطلاق ہمیشہ ان مجامع پر ہوتا ہے جن میں ناموس وحدت فکری (مع اپنے دیگر فروع اور لوازم کے) تنہا موثر اور عمل کرنے والی ہو[1]

اور اسی بناء پر ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی ذی شعور شخصیتیں اور نقاد طبیعتیں جماعت میں شامل ہونے کے بعد فکری لحاظ سے ایسا گم ہو جاتی ہیں کہ ان کا پتہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔

ایمان کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ افراد کی زندگی میں وحدت فکر پیدا کرتا ہے یعنی اس کے ذریعہ پہلے خیالات وعقائد اور احساسات وفوائد میں عمومیت اور اتحاد ہوتا ہے اور پھر بعد میں تمام ان عناصر کی نشوونما شروع ہوتی ہے جو تمدنی ارتقاء کا موجب بنتے ہیں۔

---

[1] روح الاجتماع

قرآن حکیم میں ایمان کے نتیجہ میں جس قسم کی تنظیم کا ذکر ملتا ہے اس میں عشق و محبت کا جذبہ زیادہ کارفرما دکھائی دیتا ہے حقیقت یہ ہے کہ صرف سزا کا خوف دلا کر دلوں کی دنیا پر نہیں فتح حاصل کی جا سکتی بلکہ اس کے لئے عشق و محبت کا جذبہ ہی درکار ہے

چند آیتیں یہ ہیں

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۴/۶۵

"آپ کے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک حقیقی مومن نہیں ہو سکتے ہیں جب تک اپنے تمام جھگڑوں اور قضیوں میں آپ کو حاکم نہ بنائیں اور ان کے دلوں کی ایسی حالت ہو جائے کہ جو کچھ آپ فیصلہ کر دیں اس کے خلاف کسی طرح کی کھٹک نہ محسوس کریں اور جس طرح کسی بات کا تسلیم کر لینا ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح تسلیم نہ کر لیں۔

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۳۳/۳۶

جب کسی معاملہ میں اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے تو پھر کسی مومن اور مومنہ کو ماننے اور نہ ماننے کا اختیار نہیں باقی رہتا ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۳/۱۰۳

سب مل جل کر (ہر لحاظ سے) اللہ کی رسی مضبوط پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔

مذکورہ آیتوں میں (۱) "اعتصام بحبل اللہ" (۲) "لَا يَجِدُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ" (۳) "وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا" (۴) "أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ" قرآنی تنظیم کی روح ہیں۔

ان آیتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایمان کے لئے مرکزیت ضروری ہے اور پھر اُس

مرکزیت کی ایسی اطاعت کی جائے کہ اپنی شخصیت اس میں گم ہو جائے اور اس کے حکم و فرمان کے آگے چون و چرا کی گنجائش نہ باقی رہے ؏

قرآنی تنظیم کے لئے صحابہ کرام کی زندگی کو دیکھنا چاہئے

قرآنی حدود و نقوش کے مطابق جس جماعت کی تنظیم ہوئی ہو اس کی یک جہتی اور یک رنگی کا اندازہ صحابہ کرامؓ کی زندگی سے لگایا جاسکتا ہے جن کی تنظیم سرکار دو عالمؐ نے بنفس نفیس خود فرمائی تھی اور جن کی صفت "کَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ" سے بیان کی گئی ہے ان کی زندگی میں بنیادی حیثیت سے چند باتیں نمایاں تھیں:

۱- یہ سب آپس میں اور اپنے قائد کے ساتھ دل و جان سے عاشق تھے۔

۲- اجتماعی مقصد کو اپنا عین مقصد سمجھتے تھے۔

؏ ۱۹۱۲ء میں جب ٹرکی اور ریاستہائے بلقان سے جنگ شروع ہوئی تو اس میں ٹرکی کی پے در پے شکست کے بارے میں جنگ کے ایک خاص نامہ نگار کے رشحات قلم یہ ہیں:-

"میرے نزدیک ٹرکی کی شکست دو خاص اسباب کا نتیجہ تھی (۱) جرمن افسران اور جرمن طریقہ جنگ کی تقلید کامل (جو ان کی طبیعت اور مزاج کے موافق نہ ثابت ہو سکی) (۲) فوج کے افسران سے اس خالص اسلامی جوش کا فقدان جس کی موجودگی ترک سپاہیوں میں ناممکن التسخیر قوت پیدا کر دیتی تھی اور جس نے پچھلی جنگوں میں انھیں اپنے سے دو چند فوج کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھا .... مذہبی جوش برابر گذشتہ جنگوں میں ترکوں کی کامیابی اور نصرت کا ضامن رہا آج بھی جو چند کامیاب جنرل موجود ہیں وہ سب قدیم اسکول (وضع) کے ہیں ان کے ماتحتوں کو ان پر پورا اعتماد ہے اور یہ اپنے اسلامی جوش کو ان میں حلول کر سکتے ہیں .... افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نوجوان ترکوں سے اطاعت اور بزرگوں کے ادب و لحاظ کا مادہ بہت کچھ سلب ہو گیا ہے مذہب و اخلاق ان کے تمسخر کا آماجگاہ ہیں اور جائے حیف یہ ہے کہ سب چیزیں تو انھوں نے اجنبی قوموں سے سیکھ لیں لیکن ان کی خوبیاں کچھ نہ سیکھیں ایسی حالت میں جب کہ ترک افسروں کو نماز سے کوئی تعلق نہ ہو بلکہ وہ لنتے میں مخمور رہتے ہوں اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس کے سپاہی اپنے افسروں کے زیر کمان جی توڑ کر لڑیں گے جیسا ابھی کہا جا چکا ہے ان نوجوان ترکوں کی بڑی شامت یہ ہے کہ انھوں نے غیر اقوام کے معائب چن لئے ہیں لیکن ان کے محاسن نہ لئے کوئی ان سے پوچھے کہ جس وقت یہ مشکلات کے نرغہ میں ہوتے ہیں یا جب میدان جنگ میں اظہار شجاعت کا موقع آتا ہے تو اس وقت یورپین لٹریچر سے واقفیت اور یورپین دار السلطنتوں کے گلی کوچوں کی خاک بیزی ان کے کس کام آتی ہے ۱۲ (فلسفہ اجتماع ص۳۰۶)

(۳) ایک دوسرے کی مراعات اور پاسداری کو فرض عین جانتے تھے۔

(۴) اس کے باوجود ان کا شعور کامل تھا ان کا احساس بیدار تھا اور ان کی شخصیت منظم تھی جس کی بنا پر حریت اور مساوات کے دو اصولوں کا باہمی تصادم نہ ہونے پاتا تھا۔

جدید دنیا کے ماہر نفسیات نے ایسی تنظیم کو نہایت اعلیٰ قسم کی تنظیم شمار کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ایسے اجتماعی عصر کے اخلاقی ماہیت کو ترقی دئے اور غلبہ حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔[۱]

ڈاکٹر "جوزیف ہیل" کہتا ہے

عرب جماعت میں بنیادی حیثیت سے دو خوبیاں پیدا ہو گئی تھیں اسلام کی تمام بعد کی جنگی کامیابیاں انھیں دو کی بناء پر تھیں

(۱) پابندی ضوابط اور

(۲) موت سے بے خوفی۔[۲]

داعی انقلاب نے موت سے بے خوفی نہیں بلکہ موت کے ساتھ عشق پیدا کر دیا تھا صحابہ کرام موت کو حقیقی وجاودانی زندگی سمجھتے تھے اور زندگی کے اس فلسفہ پر ان کا یقین تھا۔

ع "ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی"

ایمان کا تقاضا پیہم حرکت اور مسلسل سعی و عمل ہے

قرآن حکیم میں بکثرت "امنوا وعملوا الصّٰلحٰت" ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ذکر اس بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ حقیقی ایمان کے لئے "عمل صالح" کا پایا جانا لازمی ہے گویا اس کی نظر میں یہ بات محال ہے کہ کوئی قوم و جماعت کسی اصول و نظریہ پر ایمان کی مدعی ہو اور پھر وہ اس کو بروئے کار لانے کے لئے سرتاپا عمل نہ بن جائے۔

ایمان اور جمود ایمان اور بے حسی ایمان اور بے عملی دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے ہیں اگر قومی زندگی میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ سچا اور سچا ایمان نہیں باقی رہ گیا ہے۔

چوں کہ ایمان کا نتیجہ ہمیشہ عمل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اس لئے قرآن حکیم میں مومنوں کے واسطے

---

[۱] ملاحظہ ہو معاشرتی نفسیات ص۲۲۸ مصنفہ ولیم میک ڈوگل ایف۔ آر۔ ایس [۲] تمدن عرب ص۳۶و۳۷

دنیا میں "الاعلون" بن کر رہنے ان کی مدد کرنے اور خلافت ونیابت کے حاصل ہونے کا وعدہ کیا گیا ہے

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۳/۱۳۹ — تم ہمت نہ ہارو غم گین نہ ہو اگر (سچے) مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ — ہمارے اوپر لازم ہے مؤمنوں کی مدد کرنا۔

آیۂ استخلاف میں ایمان و عمل صالح کے نتیجے میں تین باتوں کا وعدہ ہے۔

(ا) یہ کہ غلبہ و اقتدار حاصل ہوگا "لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ"

(ب) یہ کہ اپنے نظریات و آئینِ حیات پر آزادی اور قوت کے ساتھ عمل کرنے کا موقع ملے گا۔ "وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ"

(ج) یہ کہ ہر طرف سے امن اور بے خوفی کا دور دورہ ہوگا۔ "وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا"

اسلامی تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ مذکورہ صداقتیں کس طرح اس کے دور اول میں ثابت ہو کر رہیں۔

پھر اجتماعی حیثیت سے جوں جوں ایمانی زندگی میں کمی آتی گئی اسی نسبت سے تنزل ہوتا گیا۔

ایمان اخلاقی مدرسہ اور نفسیاتی تربیت گاہ ہے

اس موقع پر یہ بات ذکر کر دینا ضروری ہے کہ قرآن حکیم میں صرف ایمان باللہ کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ایمان بالرسالت اور ایمان بالیوم الآخرۃ وغیرہ کو لازمی قرار دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان باللہ کی تکمیل اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کی بیان کردہ دوسری حقیقتوں پر ایمان نہ ہو۔ یہ مجموعۂ ایمان انسان کو وہ سب کچھ دے دیتا ہے جس کی ایک صالح اور نمو پذیر معاشرہ کو ضرورت ہوتی ہے مثال کے طور پر چند یہ ہیں

۱۔ اس مجموعہ کے ذریعہ ذہن انسانی کی تربیت ہوتی ہے۔

۲۔ ایسی سیرت پیدا ہوتی ہے جو زندگی پر چھا کر پوری دنیا بدل دیتی ہے۔

۳۔ خلوت و جلوت ہر موقع پر انسان کی امانت و دیانت اور عدالت و شرافت کی محافظت

ہوتی ہے۔

۴۔ اعلیٰ درجہ کی قوت ارادی پیدا ہوتی ہے۔

۵۔ خیالات پر قابو رکھنے، قوتِ فیصلہ کو مضبوط بنانے اور حرکات و سکنات میں شائستگی پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

۶۔ زندگی کے ہر میدان میں سمجھ بوجھ کر قدم اٹھانے اور فکر و عمل کے ہر گوشہ میں عزم و احتیاط کے ساتھ کام لینے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے جس کو قرآن حکیم نے "تقویٰ" کے جامع لفظ سے تعبیر کیا ہے "تقویٰ" ایک نہایت لطیف روحانی کیفیت ہے جس کا تعلق دل سے ہوتا ہے یہ کیفیت دل کو اتنا حساس بنا دیتی ہے کہ انسان خیر و شر میں تمیز کرنے لگتا ہے اور اتنا بیدار کر دیتی ہے کہ قدم ڈگمگانے کی صورت میں فوراً دل میں خلش محسوس ہونے لگتی ہے اسی بناء پر پیغمبر اسلامؐ نے قلبِ مومن پر اعتماد ظاہر کرتے ہوئے فرمایا تھا

استفت قلبك (الحدیث) اپنے قلب سے فتویٰ طلب کر لیا کرو۔

اور فراستِ مومن کے بارے میں فرمایا تھا۔

اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله (الحدیث) مومن کی فراست سے ہشیار رہو کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

قلب مومن کی یہ حالت و کیفیت محض اس بناء پر ہوتی ہے کہ اللہ رب العزت اپنی جامعیت و کمالات کے ساتھ اس میں موجود ہوتے ہیں جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ارشاد ہے۔

لا یسعنی الا قلب مومن (الحدیث) میری سمائی بجز قلب مومن کے اور کہیں نہیں ہو سکتی ہے۔

دل را اگر تو صاف کنی ہمچو آئینہ ۔۔۔ در دے جمالِ دوست بہ بینی چو آئینہ

او در دلِ من ست من اندر کفِ ویم ۔۔۔ چوں آئینہ بدست من و من در آئینہ

ایمان کے ذریعہ ایک طرف یہ صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں اور دوسری طرف تمام ان باتوں سے

اجتناب ہوتا رہتا ہے جو اندرونی سرچشمہ کو گدلا کرکے بالآخر تمدن کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہیں مثلاً جمود و تعطل، غفلت و قساوت، جہالت و حماقت، ہوسناکی و شہوت پرستی، حرص و طمع، فحش و بدکاری، ناشائستہ و غیر مہذب حرکات، جاہلانہ و سوقیانہ اطوار اور خلق خدا کی ایذا رسانیاں وغیرہ۔

مومنین کی نفسیاتی کیفیت اور ان کی اخلاقی حالت ذیل میں چند آیتوں کا مفہوم ذکر کیا جاتا ہے جن سے مومنین کی نفسیاتی کیفیت اور ان کی اخلاقی حالت کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں۔

(۲) جب اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں۔

(۳) وہ ہر حال میں اپنے رب پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔

(۴) نماز قائم کرتے ہیں۔

(۵) اور جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں ۔ ؎

"قیام صلوٰۃ" کو تنظیم ذہنی تربیت اور روحانی تقویت کے سلسلہ میں بہت اونچا مقام ہے جس کو نفسیات کے ماہرین زیادہ عمدگی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں اس لئے قرآن حکیم میں اس کی بہت تاکید آئی ہے۔ معاشرہ کی اصلاح کے لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ معیشت متوازن ہو نہ اس میں حد سے زیادہ امیر ہوں اور نہ حد سے زیادہ غریب کیوں کہ معاشی عدم توازن بسا اوقات مذہب و اخلاق کے اونچے سے اونچے قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے اسی طرح مذہب و اخلاق سے بے راہ روی انسان کو معاشی حیوان بنا ڈالتی ہے اس بنا پر اگر کسی قوم و جماعت کی اخلاقی اصلاح کرنی ہے تو اس کی معاشی زندگی ٹھیک کی جائے اور معاشی زندگی کو بہتر بنانا ہے تو اس کے اخلاق درست کئے جائیں گویا یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایک کی اصلاح دوسری پر موقوف ہے آج کل کی اصلاحی و انقلابی تحریکیں بالعموم صالح معاشرہ کے قیام میں ناکام ہو رہی ہیں اس کی بنیادی وجہ ان دونوں میں کسی ایک سے غفلت ہے۔

اسی حقیقت کے پیش نظر قرآن حکیم نے زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ پر بہت زور دیا ہے اور جس طرح انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اخلاقی و سماجی اصلاح تھا اسی طرح معاشی و اقتصادی اصلاح تھا۔

مومنین کے اعمال واخلاق کی فہرست

(۶) ان کے دل میں اللہ کا خوف ہوتا ہے۔ (۷) آپس کے معاملات صلح اور صفائی کے ساتھ درست رکھتے ہیں۔ (۸) زندگی کے ہر گوشہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں سرگرمی دکھاتے ہیں ۸/۱۔ (۹) اللہ کے علاوہ اور کسی سے نہیں ڈرتے ہیں ۳/۱۷۵ (۱۰) اپنی نمازوں میں خشوع اور خضوع رکھتے ہیں۔ (۱۱) نکمی باتوں اور لغو حرکتوں سے الگ رہتے ہیں۔ (۱۲) زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم رہتے ہیں۔ (۱۳) جائز صورتوں کے علاوہ اور صورتوں میں اپنے ستروں کی ہمیشہ حفاظت کرتے ہیں۔ (۱۴) اپنی امانتوں اور عہدوں کا پاس رکھتے ہیں۔ (۱۵) اپنی نمازوں کی حفاظت میں کوتاہی نہیں کرتے ہیں ۲۳/۱۱۔ (۱۶) آخرت پر یقین رکھتے ہیں ۳۱/۴۔ (۱۷) گذشتہ لغزشوں اور غفلتوں پر نادم ہو کر اور آئندہ کے لئے عزم واستقلال کے ساتھ اللہ کے دربار میں توبہ کرتے ہیں۔ (۱۸) زندگی کے ہر گوشہ میں عابدانہ شان نمایاں ہوتی ہے۔ (۱۹) اللہ کی حمد وستائش کرتے ہیں۔ (۲۰) طلب علم معرفت حق اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ کے لئے سیر وسیاحت کرتے ہیں۔ (۲۱) اللہ کے آگے قلب وجسم اور زبان پر رکوع اور سجود کی حالت طاری رہتی ہے (۲۲) نیکی کا حکم دیتے اور برائیوں سے روکتے ہیں یعنی اپنی اصلاح کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کی فکر رکھتے ہیں اور دنیا میں حق وعدالت کے قیام کی جدوجہد کو اپنی ڈیوٹی سمجھتے ہیں۔ (۲۳) اللہ کی مقرر کی ہوئی تمام حدود (حقوق وفرائض) کی نگہداشت کرتے ہیں ۹/۱۱۲۔ (۲۴) شدت ومصیبت کے وقت صبر وتحمل سے کام لیتے ہیں۔ (۲۵) قول وعمل میں سچے اور پکے ہوتے ہیں۔ (۲۶) رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ کے حضور کھڑے ہوتے ہیں اور اس سے مغفرت طلب کرتے ہیں ۳/۱۷ (۲۷) خوشحالی وتنگ دستی ہر حال میں اللہ کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ (۲۸) غصہ کی حالت میں بے قابو نہیں ہوتے بلکہ غصہ کو پی جاتے ہیں۔ (۲۹) لوگوں کا قصور معاف کر دیتے ہیں ۳/۱۳۴۔ (۳۰) آپس

میں ایک دوسرے کے ساتھ نرم اور دشمنوں کے مقابلہ میں سخت ہوتے ہیں۔ (۳۱) اللہ کی راہ میں جان تک لڑا دیتے ہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کرتے ہیں ۵/۵۴۔ (۳۲) برائی کا مقابلہ برائی سے نہیں کرتے بلکہ اس کا مقابلہ بھلائی سے کرتے ہیں ۱۳/۲۲ یہ کردار کا اونچا درجہ ہے اگر انسان اتنا نہ کر سکے یا کرنا مناسب نہ ہو تو دونوں صورتوں میں شرعی حدود کے اندر برابر سرابر بدلہ لینے کی اجازت ہے ۲۵/۴۲۔ (۳۳) ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے ۱۳/۲۸۔ (۳۴) قول اور عمل سے جھوٹی شہادت نہیں دیتے ہیں ۲۶/۷۲۔ (۳۵) جب لغو اور نکمی باتوں پر ان کا گذر ہوتا ہے تو شریفوں کی طرح گذر جاتے ہیں ۲۶/۷۲ (۳۶) بدکاری کا ارتکاب نہیں کرتے ہیں ۲۶/۶۹۔ (۳۷) بے حیائی اور بری باتوں سے الگ رہتے ہیں ۲۵/۳۷۔ (۳۸) فتنہ و فساد نہیں پھیلاتے ہیں ۱۱/۸۵۔ (۳۹) نیکیوں اور بھلائیوں کی نشر و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں ۲۳/۶۱۔ (۴۰) ناپ اور تول میں کمی نہیں کرتے ہیں ۱۱/۸۵ (۴۱) ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں ۲۵/۳۸۔ (۴۲) زندگی کے تمام معاملات میں ایمان و اسلام کی روح سرایت کی ہوئی ہوتی ہے ۲/۲۰۸۔

قرآنی انقلاب سے دل میں تبدیلی ہوتی ہے اور دوسرے انقلاب صرف ذہنیت بدلتے ہیں

ان چند اوصاف سے مؤمنین کی ذہنی و اخلاقی اور قلبی حالت کا اندازہ لگانا آسان ہے اور یہ بات بھی معلوم ہو سکتی ہے کہ ایسے لوگ دنیا کے لئے کس قدر مفید ہوں گے؟ اور ان کے قیام و بقا کی کتنی مدت ہوگی؟ ان اوصاف میں بنیادی حیثیت سے جو شے زیادہ نمایاں ہے وہ قلب کی اصلاح و درستی ہے قرآنی انقلاب اور دوسرے انقلابوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر اعمال و اخلاق کے سرچشمہ (دل) کو پاک و صاف رکھتا ہے اور ثانی الذکر کی ساری جد و جہد قومی و جماعتی مفاد کی حد تک ذہنیت کی تبدیلی پر مرکوز ہوتی ہے اسی بنا پر پہلے کا فائدہ عالمگیر و ہمہ گیر ہوتا ہے اور دوسرے کا اثر محدود ہوتا ہے پہلے میں پائداری اور استواری زیادہ ہوتی ہے اور دوسرے میں یہ دونوں باتیں کمی کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔

(باقی آئندہ)

اسلام کا فلسفہ تاریخ

حدیث مجددین ملت کی روشنی میں

از

جناب مرزا محمد یوسف صاحب

(پروفیسر اورینٹل کالج رام پور)

اسلام ایک مکمل نظامِ حیات کا نام ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کی رشد وہدایت کے لئے بھیجا ہے اس کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ نسلِ انسانی کی تاریخ، لیکن اپنے مخصوص معنوں میں اس کا آغاز جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ہوتا ہے اور اس کا دور قیامِ قیامت تک رہے گا۔ اس تاریخ اسلام کا (خواہ آپ اسے اعم معنوں میں لیں یا اخص معنوں میں) ایک خصوصی فلسفہ ہے جسے اسلامی تعلیمات میں "تجدید دین" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے اسلام کے فلسفۂ تاریخ اور "تجدید دین" کے مسئلے کو بیان کرنے کا دعویٰ کیا ہے لیکن یہ امر مشکوک فیہ ہے کہ اُن کا پیش کردہ "فلسفۂ تاریخ اور "فلسفۂ تجدید" خود اُن کی اپنی ذاتی رائے ہے جسے اُنھوں نے (WISHFUL THINKING) کے طور پر اسلام کا ٹھپّہ لگا کر (جس کی اجارہ داری انھوں نے صرف اپنے لئے مخصوص کرلی ہے) دنیا کے سامنے پیش کیا ہے،

بہر کیف اسلام کا ایک مخصوص فلسفۂ تاریخ یا فلسفۂ تجدید ہے جسے کما حقہٗ سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کی آئیڈیالوجی، اس کے اصولی نظریات اور اُس کے بنیادی فلسفہ کو پوری طرح سمجھ لیا جائے۔ ظاہر ہے اسلام کی آئیڈیالوجی صحیح معنوں میں وہی ہوسکتی ہے جو قرآن

اور حدیث سے مستنبط ہو۔

اس آئیڈیالوجی سے اسلام کے فلسفۂ تاریخ یا فلسفۂ تجدید کے اصول مستخرج کیے جائیں اُس کے بعد دیکھا جائے کہ اسلامی سماج کی معاشرتی تاریخ ان اصولوں کی کارفرمائی کی کہاں تک شہادت دیتی ہے، پھر فہم کتاب وسنّت کے ضمن میں اگر اُن بزرگوں کے اقوال کو بھی درخورِ اعتنا سمجھا جائے جنہیں فہم قرآن وحدیث کے ہم سے زیادہ مواقع حاصل تھے اور جن کی مساعی علمیہ سے اسلامی تعلیمات کا صحیفۂ ہدایت مدون ہوا اس طرح اس سلسلے میں حسب ذیل سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں:

اوّلاً:۔۔۔ اسلام کے فلسفۂ تاریخ کے اصول کیا ہیں اور اس کے اصولی نظریات سے کس طرح مستخرخ ہوتے ہیں؟

ثانیاً:۔۔۔ تاریخ اسلام سے اس فلسفۂ تاریخ کی کہاں تک تائید ہوتی ہے؟

ثالثاً:۔۔۔ اس فلسفۂ تاریخ کے متعلق علماء ومفکرینِ اسلام کا کیا رجحان رہا ہے؟

سطورِ ذیل میں انھیں سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مسئلہ بہت اہم ہے میں صرف راستہ کی نشاندہی کر رہا ہوں اس اہم کام کو تکمیل تک پہنچانا اہلِ علم کا منصب ہے، میں نے صرف پانچویں صدی تک کی اسلامی تاریخ کے باب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ حضرات جو اس کے اہل ہیں اسے اتمام تک پہنچائیں۔

۱۔ اسلام کا فلسفۂ تاریخ

اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے جو اپنے متعارف معنوں میں تو صرف ساڑھے تیرہ سو برس سے ہے لیکن حقیقی معنوں میں ہبوطِ آدم سے دنیا کے نظم وانتظام کے لئے نافذ ہے اور تاقیامِ قیامت قائم رہے گا۔

اس فلسفۂ تاریخ کو سمجھنے کے لئے اسلام کی آئیڈیالوجی کو ذہن میں مستحضر رکھنا چاہئے۔ خلاقِ کائنات نے کائنات کو عموماً اور انسان کو خصوصاً عبث وباطل پیدا نہیں کیا بلکہ ایک بلند نصب العین

اور پاکیزہ مقصد کے حصول و تحقق کے لئے خلق فرمایا ہے یہ مقصد تخلیق قرآن کے منشا کے مطابق "تعبد الٰہی" ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے ــــــــ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ

لیکن طریق عبادت کی تفصیل نیز ایسا ماحول برقرار رکھنے کے عملی قواعد جہاں عبادت خداوندی کے لئے یا بلند مقصد تخلیق کے تحقق کے لئے ضروری مواقع میسر اور مضر موانع مرتفع ہوں، ایسی تفصیل عبادت اور منظم ضابطۂ حیات کی دریافت سے عقل انسانی قاصر ہے۔ لہذا رحمتِ خداوندی نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے بندوں کی رہنمائی کے لئے اپنے برگزیدہ بندوں کو صحیفۂ ہدایت اور پیغام اصلاح دے کر بھیجا۔ ان مقدس ہستیوں کو رسول کہتے ہیں چنانچہ قرآن پاک فرماتا ہے۔

"كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ"

دوسری جگہ ارشاد باری ہوتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ"

ان رسولوں میں آخری رسول جناب محمد مصطفٰے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں جن پر سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا پس اختتام رشد و ہدایت کے سلسلے میں دو کام کئے گئے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کے ذریعہ ایسا صحیفۂ ہدایت بھیجا جو رہتی دنیا تک سماج کے نئے پرانے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے:۔

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا"

۲۔ تقلبات دہر و مرورِ ایام سے سماج کے مزاج اور ہیئت میں جو فساد پیدا ہوتا ہے اس کی نباضی اور ازالہ کے لئے تجدید امت کا انتظام کیا گیا۔

ظاہر ہے نبوت جناب نبی کریم علیہ تحیہ و تسلیم پر ختم ہو گئی۔ اب اگر ملت اسلامیہ میں کسی بنا پر ضعف پیدا ہوتا ہے تو اس کے ازالے کے لئے کوئی نبی تو مبعوث ہوگا نہیں۔ صرف مخصوص افراد

امت ہی سے اس اہم کام کو انجام کرایا جائے گا۔ پھر اسباب ضعف و فساد صرف سیاسی ہی نہیں ہوا کرتے فکری بھی ہوتے ہیں اور اخلاقی بھی۔ جس راہ سے ضعف آتا ہے اس کا سدِ باب وقت کا اہم تقاضا ہوتا ہے۔ اسی کا نام تجدید امت ہے۔ جسے آپ چاہیں تو احیاء دین بھی کہہ لیجئے یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی زمانہ میں دو یا دو سے زیادہ طرح کے فسادات سے اسلامی سماج متاثر ہو رہا ہوتا ہے جس میں سے بعض معمولی ہوتے ہیں جو زیادہ عرصے کے بعد رنگ لاتے ہیں، بعض زیادہ خطرناک ہوتے ہیں جن سے معاشرہ کو فوری خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس صدی کے مصلح اعظم (جسے مجدد کہتے ہیں) کا فرض ہوتا ہے کہ اسی خطرے سے اسلامی معاشرہ کو خلاصی دلائے۔

یہ ہے اسلام کا فلسفۂ تاریخ جس پر مفکرین امت کا اجماع ہے (جس کی تفصیل آگے آتی ہے) کہ ہر صدی کے اختتام پر تجدید دین کے لئے ایک مجدد مبعوث ہوتا ہے۔ تجدید ملت و احیاء دین کا یہ تصور امر ثابت الاصل ہے اس کی اساس کسی مفکر کے ہفوات و ہذیانات پر قائم نہیں ہے۔ بلکہ خود شارع علیہ السلام ہی کے فرمان واجب الاذعان پر ہے کہ

ان اللہ عزّ وجلّ یبعث لھذہ الامۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا۔	اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر سو سال کے اختتام پر ایسے شخص کو بھیجے گا جو امت کے لئے اس کے دین کی تجدید کرے گا۔

یہ حدیث نبوی حدیث کی پرکھ رکھنے والوں کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتماد ہے چنانچہ ابو داؤد رح نے اپنی سنن کی کتاب الملاحم میں اور حافظ ابن عساکر الدمشقی المتوفی ۵۷۱ھ نے تبیین کذب المفتری میں (دوسرے طریق سے) اسے روایت کیا ہے۔ اس طرح یہ حدیث واجب الاحترام اور واجب الاعتصام ہے۔ معہذا اسے بنیاد بنا کر ایک معقول اور صالح فلسفۂ تاریخ تعمیر کیا جا سکتا ہے اور چوں کہ یہ صادق و مصدوق کا فرمان واجب الاذعان ہے ماخوذ تاریخ دست بستہ اس کی صحت و صداقت پر گواہی دیتی ہے یہ ایک سیدھی سادھی حقیقت ہے جس کی تبیین و تبسیط کے واسطے

لے بغیر جزوی اور کامل کی تفریق کے

ز اجتماعی نظام کی مابعد الطبیعی اساس کے لئے جاہلیت کی تثلیث کا مفروضہ گھڑنے کی ضرورت ہے اور نہ مجدد کامل و جزوی کی غیر ثابت الاصل تفریق کا افسانہ تراشنے کی۔ تاریخ سے پوچھئے وہ آپ کو بتائے گی کہ ہر صدی کے اختتام پر واقعات نے اس حقیقتِ باہرہ کی صحت و صداقت پر کس طرح مہرِ توثیق ثبت کی۔

۲۔ تاریخ کی شہادت

۱۔ پہلی صدی میں فساد کا سرچشمہ بنو امیہ کی ملوکیت تھی جس کی اگر بروقت اصلاح نہ کی جاتی تو اس کی نحوستیں پوری امتِ اسلامیہ کو لے ڈوبتیں۔ اسلام میں پہلا اختلاف سیاسی نوعیت کا تھا، پہلا فتنہ سیاسی سازشوں کا تھا اور پہلا قتال و جدال سیاسی اقتدار کے لئے ہوا تا آنکہ خلافتِ راشدہ کے ختم ہونے کے بعد اسلام کا سیاسی نظام ماؤف ہونے لگا۔ صوبوں کا پایۂ تخت شام میں تھا جو اسلامی فتوحات سے پیشتر مشرقی سلطنتِ روما (EASTERN ROMAN EMPIRE) کا مستقر رہ چکا تھا اور اس طرح اُن تمام اخلاقی و سیاسی مفاسد سے معمور تھا جو رومی قیصریت، جاگیرداری، اور مرفہ الحالی کا منطقی نتیجہ تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو صحابی تھے اور تعلیمِ نبوت کے فیضِ تاثیر سے فیض یافتہ تھے، اسلام کی للّٰہیت (جس کا سیاسی مظہر خلافتِ راشدہ کا عقبیٰ پسندی کا جذبہ تھا) اور رومی قیصریت [جو تجبر، جبایتِ خراج اور تعیّشات کی معجون مرکب تھی] کے ناگزیر تصادم میں توازن قائم رکھنے کی کوشش کی مگر یہ کام بہت سخت تھا اور اُن کی وفات کے بعد سیاسی نظام سے للّٰہیت بے دخل سی نظر آنے لگی۔

ادھر مشرق میں کسریٰ کے ممالک مفتوح ہو جانے کے بعد ایران کا "حقِ خداداد شہنشاہی" کا غیر اسلامی تخیل بھی مالِ غنیمت میں ہاتھ آیا اور اس نے بدترین تشیّع کی شکل اختیار کر لی۔ غرض شام کے ناصبی ہوں یا عراق کے شیعہ اسلام کے سیاسی نظام سے دونوں ہی نے کترا کر اپنے لئے ایک ایک سیاسی موقف متعین کرنا شروع کیا جو نسلی اختلاف کے علاوہ ہر چیز میں ایک دوسرے کے موقف کا مماثل تھا۔ اس وقت عالمِ اسلام میں سیاسی اقتدار صرف دو گروہوں کا تھا۔

ایک کا بالفعل ایک کا بالقوہ۔ تیسرا گروہ خوارج کا تھا جن کا کوئی ایجابی پروگرام نہ تھا محض ایک سلبی لائحہ عمل تھا جس کی تعمیر میں ربیعہ و نزارہ کی قدیم عداوت، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں مسیلمہ کی سیاسی رقابت، فتنۂ ارتداد میں مغلوبیت کا کینۂ مستکنہ اور اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی چھپی ہوئی خواہش نے حصہ لیا تھا۔

یہ صورتِ حال تھی جو ۷۵ھ سے ۹۹ ہجری تک باقی رہی۔ اسلام کی تعلیمات آج بھی موجود تھیں قرآن و حدیث کے پڑھنے والے اور ان سے احکامِ شرعیہ کا استنباط کرنے والے بھی موجود تھے۔ اجتماعی نظام کے دوسرے شعبوں کی طرح ملک و ملت کے سیاسی نظام کا مفصل خاکہ آج بھی تعلیماتِ دینی سے مستنبط ہو رہا تھا۔ لیکن فکر و نظر اس بات سے مایوس سے ہوتے جا رہے تھے کہ آیا اس قسم کا سیاسی نظمِ عمل میں لایا جا سکتا ہے یا وہ صرف خلافتِ راشدہ ہی تک محدود تھا۔ دن گذرتے جاتے تھے اور مایوسی بڑھتی جاتی تھی۔ امراء و نام نہاد خلفاء کا تجبر و استکبار رہی سہی امیدیں توڑ رہا تھا بنو امیہ کی اصلاح سے لوگ مایوس ہو چکے تھے۔ اگر کوئی امید تھی تو بنو ہاشم کے خروج و بغاوت سے۔ صدی ختم ہو رہی تھی اور نگاہیں بنو ہاشم کی خفیہ دعوتوں کے نتیجہ کی جانب لگی ہوئی تھیں۔ مگر امید کی کرن ایسی سمت سے آئی جہاں سے کوئی توقع نہ تھی۔

۹۹ھ میں بنو امیہ کے خاندانی تخت پر اسی خاندان کا ایک فرد متمکن ہوا جس نے اسی ماحول میں پرورش پائی تھی جس میں اور اموی جبابرہ تربیت پا چکے تھے اس شہزادے سے خیر اور اصلاح کی امید وہی رکھ سکتا تھا جو درختِ حنظل سے ثمرِ شیریں کی آس لگا سکتا ہو۔ مگر قدرت کے کام اسباب و دواعی پر موقوف نہیں ہیں۔ ایک خدا کا بندہ جس نے تنعم و ترفہ میں زندگی بسر کی تھی جو گورنری کی حالت میں بھی اموی جباریت سے سبکدوش نہیں ہوا ایک ایسی سلطنت کے تخت پر بیٹھا جو آبنائے جبل الطارق سے آبِ سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ تاریخی تجربہ اور دنیا کے عام قوانین یہی بتا رہے تھے کہ تشدد و استبداد کی مے دو آتشہ جو اس شہزادے کی گھٹی میں پڑی ہے تختِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد سہ آتشہ ہو جائے گی۔ مگر یہ قوانین دھرے کے دھرے رہ گئے۔ عام دواعی و عوامل کے نتیجہ کے برخلاف، تختِ خلافت پر بیٹھتے

بنی اُس کی کایا پلٹ ہو گئی۔ حالانکہ اس سے قبل اسی تخت پر ولید اور یزید بھی بیٹھ چکے تھے اور عیاشی و لذت کوشی اور ناعاقبت اندیشی و خدا فراموشی میں اپنی مثال قائم کر چکے تھے۔ اس تخت پر عبدالملک بیٹھ چکا تھا جس نے بیٹھتے ہی قرآن کو الوداعی سلام کیا۔ اس تخت میں کوئی خاص بات نہ تھی یہ تو صرف قدرت کا کرشمہ تھا، ایک خرقِ عادت تھا کہ اس عیش و تنعم میں پلنے والے نوجوان کی ماہیت یکایک منقلب ہو گئی جو کچھ ہوا تاریخ کے صفحات اُس سے معمور ہیں۔

ادبیات

غزل

از

(جناب آلم مظفر نگری)

ادب کرتا ہے خود ساقی مے خانہ نشیں میرا
ہے رشک ساغر جمشید جام آتشیں میرا

کسی کے سنگِ در کی عظمتیں ہیں منتظر جس کی
لئے ہے ایک وہ سجدہ ابھی فرقِ جبیں میرا

اسی کے دم سے قائم ہیں حیاتِ غم کے ہنگامے
خدا رکھے غنیمت ہے دلِ اندوہ گیں میرا

فضائے عرش سے بامِ حقیقت تک میں اڑ رہا ہوں
کہاں تک ساتھ دے گا طائرِ سدرہ نشیں میرا

نگاہوں تک مری آجائیں گے کھنچ کھنچ کے خود جلوے
سلامت ہے محبت میں اگر جذبِ یقیں میرا

ستارے ہوں کہ گل پرتو ہیں سب داغِ محبت کے
چمن زارِ وفا ہے آسماں سے تا زمیں میرا

محبت وجد میں ہے اور دانش رقص کرتی ہے
تری محفل کا ہر جلوہ ہے شعرِ دلنشیں میرا

جبھی تک گرمیاں قائم ہیں خورشیدِ قیامت کی
ہے زیرِ آستیں جب تک کہ داغِ آتشیں میرا

مآلِ انتظارِ جلوہ ہوتا ہے یہی شاید
تصور میں اب ان کے ہر تصور ہے حسیں میرا

محبت کے تو ہر وعدہ کا ان کے ہے یقیں اے دل
نہیں ہے مطمئن لیکن مذاقِ نکتہ چیں میرا

سمجھ لینا وہیں ہے ساحلِ مقصود طوفاں میں
جہاں اے ناخدا ہوگا سفینہ تہ نشیں میرا

جہاں والے جسے تعبیر کرتے ہیں جوانی سے
خدا جانے ہے کس منزل میں وہ خوابِ حسیں میرا

آلم مجھ کو تمنا کس لئے ہو ساغرِ جم کی
بفیضِ عشق کیا پہلو میں ہے کیا دل نہیں میرا

تبصرے

روحِ حیات | از جناب اختر قریشی تقطیع خورد ضخامت ۱۰۴ صفحات طباعت وکتابت بہتر قیمت عہ پتہ :- حاجی محمد سعید تاجر کتب ۲۰ ویلسلی اسٹریٹ کلکتہ ۱۶-

یہ کتاب اختر قریشی صاحب کے خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں یا بزرگوں کو لکھے ہیں یہ مجموعہ اتنا مقبول ہوا کہ اب تک اس کے تین اڈیشن چھپ کر ختم ہو چکے ہیں یہ چوتھا اڈیشن ہے ان خطوط کی خصوصیت یہ ہے کہ صاحبِ مکاتیب نے بعض سماجی اور معاشرتی، ادبی اور فنی مسائل پر آزادی و بے باکی کے ساتھ کھلی تنقید کی ہے اور چونکہ قلم میں شگفتگی اور روانی ہے اور اندازِ نگارش طنزیہ ہے اس بنا پر ان خطوط کو پڑھ کر ہنسی بھی آتی ہے اور لطف بھی آتا ہے۔ مثلاً اُن کے ایک دوست نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ نامور شعرائے اردو پر تحقیقی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کرنا چاہتے ہیں۔ اختر قریشی صاحب اپنے دوست کے اس نیک ارادہ کی داد اس طرح دیتے ہیں۔

" تمہارے اس ارادہ کو سن کر حیرت ہوئی " ورڈسورتھ کی شاعری یا " براؤننگ کی ساحری " " ملٹن کی جادو بیانی " یا براؤن کی قادر الکلامی " کیا ان میں سے کوئی شخصیت یا اور کوئی چیز تمہیں مرعوب نہ کر سکی ؟ تعجب ہے ایسے قیمتی جواہرات کو چھوڑ کر تم نے سنگریزوں کو پرکھنے کا تہیہ کیا جب دوسرے نوجوان ادیب تمہاری اس بدذوقی کو سنیں گے خیال تو کرو تمہارا کس قدر مذاق اڑایا جائے گا۔ ریسرچ کے لئے تم نے ہندوستانی شاعر یا نثّار کو تاکا اور وہ بھی غریب زبانِ اُردو کے یقیناً تمہاری نظرِ انتخاب نے تمہیں دھوکا دیا ہے کم از کم بنگال کا جادو نگار ہی تمہارا موضوع بن جاتا۔

غرض کہ سب خطوط اسی قسم کے طنز، لطیفہ و ملیح سے بھرے پڑے ہیں اور اس لیے

...یہ ہیں ہی

دلچسپ بھی ہیں اور لطف آفریں بھی۔

انوارِ حدیث از مولانا سیّد محمد ہاشم صاحب فاضل شمسی تقطیع متوسط ضخامت ۲۱۳ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت تین روپیہ :- پتہ :- المکتبہ اندرون کھٹاؤ مارکیٹ بنو نہام روڈ۔ کراچی۔

آج کل پاکستان میں انکارِ حدیث کا فتنہ جس زور شور سے برپا ہے اسی قدر اس کے توڑ کی کوششیں بھی تیز ہو گئی ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں حدیث کی اہمیت وعظمت اُس کی شرعی حیثیت اور فہمِ قرآن میں ان کی ضرورت پر گفتگو کرنے کے بعد تدوینِ حدیث کی تاریخ پر کلام کیا گیا ہے جس کے ذیل میں طبقاتِ محدثین اور مشہور ائمۂ حدیث کا تذکرہ آگیا ہے۔ اس کے بعد چند اصولِ حدیث پر روشنی ڈال کر یہ ثابت کیا ہے کہ محدثین کرام نے صحت وعدمِ صحتِ حدیث کے جو اصول مقرر کر دیئے ہیں ان کی روشنی میں حدیث کا کھرا اور کھوٹا صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ اس لئے محدثین نے جس حدیث کو صحیح کہا ہے وہ صحیح ہے اب اُس میں مزید قیل وقال کی گنجائش نہیں ہے۔ کتاب کا طرزِ بیان ایسا ہے کہ متوسط استعداد کے لوگ بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر حصہ اول و دوم از جناب افتخار احمد بلخی۔ تقطیع متوسط کتابت وطباعت بہتر ضخامت حصہ اول ۲۳۶ صفحات قیمت ہے۔ ضخامت حصہ دوم ۴۰۸ صفحات قیمت للعہ پتہ :- مکتبۂ چراغ راہ کراچی۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب بھی فتنۂ انکارِ حدیث کے سلسلہ میں ہے لیکن اس کا دائرۂ بحث بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ اس میں پہلے عہدِ خلافتِ راشدہ پر گفتگو کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ اس دورِ مبارک ومسعود میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا رواج کس شدومد کے ساتھ رہا اور اُس کے بعد جب خلافت ملکِ عضوض میں تبدیل ہو گئی تو منکرات ومحظوراتِ شرعیہ کو کس طرح معروفات پر غلبہ واستیلا ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ بنو عباس کے آخری عہد میں خیر بالکل مغلوب ہو کر

رہ گیا اور اُس کا اثر یہ ہوا کہ دین میں قطع و برید ہونے لگی اور احادیث کی حجیت معرضِ بحث میں آگئی اس کے بعد مصنف نے اپنا منظر اچانک بدل دیا ہے اور وہ ہندوستان زیرِ سایہ برطانیہ میں پہنچ گئے ہیں جہاں تجدد اور حریتِ فکر کی تاریخ کا ایک نیا باب کھلتا ہے۔ چنانچہ اس ذیل میں سرسید احمد خاں اور اُن کے رفقار کی تحریروں سے بتایا ہے کہ یہ تجدد کن کن شکلوں میں ظاہر ہوا اور اس کے اثرات دین پر کیا پڑے۔ اس کے بعد عہدِ حاضر کے علمبردارانِ تجدد اور اُن کے افکار کا تجزیہ کر کے ان کو مختلف عنوانات کے ماتحت پیش کیا ہے اور ان پر سیر حاصل تبصرہ کر کے یہ دکھایا ہے کہ آج اصلاح اور تجدیدِ دین کے نام سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اُس کی جڑیں بہت گہری ہیں اور وہ تاریخی عوامل و موثرات کا ایک طویل سلسلہ رکھتا ہے اس طرح یہ کتاب صرف منکرینِ حدیث سے متعلق نہیں بلکہ دراصل مسلمانوں کے ایک خاص طبقہ کے تجدد پرور افکار و خیالات کی ایک مبسوط تاریخ ہے اور اگرچہ مصنف کے تمام خیالات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا اور بعض بعض مقامات پر اُن کا قلم تنقید "توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ" کے دل دل میں جا پھنسا ہے۔ پھر بنو اُمیہ اور بنی عباس کے خلفار سے متعلق انھوں نے حد درجہ فسق و فجور کے جو بعض واقعات منسوب کئے ہیں وہ بھی محتاجِ ثبوت ہیں۔ تاہم اس کتاب کا فائدہ یہ ضرور ہو گا کہ اس کے پڑھنے سے جدید افکار و خیالات کا علم یک جائی طور پر ہو جائے گا اس لئے تاریخِ حریتِ فکر کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہو گا۔

بُرھان

جلد ۳۶ شمارہ ۳

مارچ ۱۹۵۶ء مطابق رجب المرجب و شعبان المعظم ۱۳۷۵ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

شاہ سعود کے بعد ہی شاہ و ملکۂ ایران کی ہند میں آمد۔ ہند اور مشرق وسطی کے ممالک کے باہمی دوستانہ تعلقات کے لئے ایک بڑی اچھی اور عمدہ فال ہے۔ ہند اور ایران ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں کہ ایک ہی باپ کی اولاد معلوم ہوتے ہیں۔ ایران کی زبان۔ کلچر۔ تہذیب کے نقوش اس ملک کے درودیوار پر نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ہند کے علوم وفنون۔ اس کے فلسفہ وشاعری اور زبان کے نمایاں اثرات ایران کی تاریخ میں ثبت ہیں۔ ہم شاہ و ملکۂ ایران کو اخلاص و محبت کے جذبات کے ساتھ خیر مقدم کہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ہند و ایران کے باہمی دوستانہ تعلقات زیادہ گہرے، پائدار اور مستقل ہوں اور اس کا فائدہ تمام ایشیا کو پہنچے۔

اگر آپ کسی سے پنجابی میں گفتگو کر رہے ہیں تو سننے والا آپ کو کیا سمجھے گا؟ یہی نا کہ آپ پنجابی ہیں۔ اسی طرح بنگالی زبان میں بولئے تو آپ بنگالی۔ مرہٹی میں تقریر کیجئے تو مہاراشٹرین۔ تامل یا ملیالم میں خطاب کیجئے تو آپ مدراسی ہی سمجھے جائیں گے یا کچھ اور؟ لیکن اگر آپ اردو میں بول رہے ہیں تو سننے والا آپ کو کیا سمجھے گا؟ عرب۔ ایرانی۔ تورانی۔ چینی۔ یوربین۔ امریکن۔ روسی؟ ہرگز نہیں! اچھا تو پھر کیا وہ یہ بتا سکے گا کہ آپ ہندوستانی ہیں یا پاکستانی ہیں اور اگر ہندوستانی ہیں تو یوپی کے رہنے والے ہیں یا بہار کے۔ پنجاب آپ کا وطن ہے یا بنگال۔ بمبئی سے آپ کا تعلق ہے یا گجرات سے! جی نہیں۔ صرف آپ کی زبان سن کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکے گا کہ آپ ہیں کس صوبہ کے رہنے والے۔ البتہ ایک بات وہ پوری قطعیت کے ساتھ کہے گا اور وہ یہ کہ آپ ہندوستانی ہیں۔ (یعنی برصغیر ہند و پاک میں سے کسی جگہ کے رہنے والے) اور یہ بالکل ٹھیک ایسا ہی ہے جیسا کہ آج کل اگر آپ کسی شخص کو انگریزی میں بولتا ہوا سنتے ہیں تو اس کے لب ولہجہ، شکل وصورت اور اس کی وضع قطع کی روشنی میں تو بیشک آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کس ملک کا باشندہ ہے۔ لیکن اس کی زبان انگریزی کی بنیاد پر اس کی قومیت اور وطنیت کا تعین نہیں کر سکتے۔ یہ کیوں؟ محض اس لئے کہ انگریزی زبان اب اس قدر عام اور ہمہ گیر ہو گئی ہے کہ ہر ملک و قوم کا آدمی اس میں

بولنے لگا ہے۔ پس جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے اس کا حال بھی یہی ہے کہ چونکہ وہ ہندوستان کے ہر صوبہ اور ہر شہر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس لئے جو شخص اس زبان میں گفتگو کر رہا ہے آپ اس کو یہ تو ضرور کہتے ہیں کہ وہ ہندوستانی ہے۔ لیکن ہندوستان کے کس صوبہ کا آدمی ہے اس کا تعین محض زبان کی بنیاد پر ہرگز نہیں کر سکتے !!

یہ ایک ایسی صاف اور کھلی حقیقت ہے کہ کوئی ایک فردِ بشر بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ملک کی تقسیم جن حالات میں ہوئی اُن کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ یہاں کی اکثریت کے دل و دماغ پر جذبات کا استیلاً ہو جائے اور جب آدمی غصہ میں ہوتا ہے تو وہ کیا کچھ نہیں کرتا۔ اور کیا کچھ نہیں کہہ گزرتا۔ لیکن غصہ۔ اور جذبۂ نفرت و عناد ہنگامی خارجی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے کبھی مستقل اور پائدار نہیں ہو سکتا۔ انسانی فطرت بہر حال ایک مستقل اور پائدار چیز ہے۔ وہ مدھم ہو سکتی ہے۔ غبار آلود ہو سکتی ہے لیکن فنا نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ظالموں اور جفا کاروں کی آنکھوں سے بھی اپنے ہی کشتگانِ ستم کی مظلومیت کو دیکھکر۔ آنسو ٹپک پڑے ہیں اور بے ساختہ منہ سے آہ نکل گئی ہے۔

چنانچہ خدا کا شکر ہے ہمارے ملک کا بھی اب وہ دور ختم ہو رہا ہے۔ اور جذباتِ غصہ و عناد کا پردہ عقل و فہم کے رخِ روشن سے اٹھتا جا رہا ہے۔ انہیں گذشتہ چند مہینوں میں دیکھئے کتنے بڑے بڑے ہندو لیڈروں نے جو اردو کے مخالف سمجھے جاتے تھے اردو کے حق میں کس قدر اچھے اور قابلِ قدر بیانات دیئے ہیں اور ہمارے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کا تو حال یہ ہے کہ اب فضا کو ساز گار پا کر اردو کے متعلق اپنے ذاتی نقطۂ نظر کو جو خود ان کی گورنمنٹ کی پالیسی بھی ہے بار بار زیادہ قوت اور زور کے ساتھ ظاہر کرنا شروع کر دیا ہے حیدر آباد کے ایک پبلک جلسہ میں۔ پھر پارلیمنٹ میں تو وہ کہہ ہی چکے تھے اب حصول آزادی کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس کے بھرے اجلاس میں اس کے پلیٹ فارم سے انھوں نے اردو کی نسبت نہایت نرم اور وقیع خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار جس زبان اور جس لب و لہجہ میں کیا گیا ہے اس میں پہلے کی بہ نسبت جوش و خروش بھی زیادہ ہے اور خلوص بھی زیادہ۔ اس سے امنگ اور ولولہ بھی مترشح ہوتا ہے اور ایک نہایت

مستحکم عزم اور ارادہ بھی، یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اردو کی نسبت ملک کی فضا سازگار ہوتی جا رہی ہے اور اب وہ بات نہیں ہے جو پہلے تھی۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ اہلِ ملک آزادی کی نعمت سے جس قدر زیادہ متمتع اور فیضیاب ہوتے جائیں گے اسی قدر ان میں آزاد اور جمہوریت پسند لوگوں کی خو بو زیادہ پیدا ہوتی جائیگی یعنی تنگ نظری کے بجائے وسعتِ خیال، تعصب اور فرقہ پروری کے بجائے رواداری اور وطن پروری کے اوصاف ترقی کرتے جائیں گے۔ اور آخر ایک دن وہ ان اوصاف کے اعتبار سے اسی مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں آج امریکہ، فرانس اور برطانیہ ہے نظاہر کہ ڈیڑھ سو برس کی غلامی کا زنگ یکایک دور نہیں ہو سکتا۔ قوموں کی ساخت اور ان کا مزاج جس آب و ہوا میں نشو و نما پاتا اور پختہ ہوتا ہے وہ آب و ہوا برسات کے بادل سے نہیں پیدا ہوتی۔ ایک مدت کے عملِ جذب و انجذاب کے بعد استوار ہوتی ہے۔

لیکن اس موقع پر ہم ایک بات نہایت صفائی سے کہہ دینا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ اُردو کو خطرہ نہ حکومت کی طرف سے ہے اور نہ برادرانِ وطن کی طرف سے! اگر خطرہ ہے تو ان مسلمانوں کی طرف سے جو اپنی گذشتہ بے اعتدالیوں کے ردِ عمل کے طور پر بری طرح احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں اور جو اپنے اس احساس کو چھپانے کے لئے "زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ بساز" کی آڑ لینے کی کوشش کرتے ہیں کل تک یہ لوگ اول درجہ کے فرقہ پرست تھے لیکن آج ان کی قوم پروری اور نیشنلزم کا عالم یہ ہے کہ اُردو چوں کہ مسلمانوں کی زبان ہے اس لئے اس کی کسی تحریک میں حصہ لینا یا اس سے دلچسپی لینا فرقہ پرستی ہے۔ کسی ایسے ادارہ، اسکول یا انسٹیٹیوشن کی مدد کرنا نیشنلزم کے خلاف ہے جس کے نام سے پہلے اسلامیہ یا مسلم کا لفظ ہو۔ وہ اپنے بچوں کو اب اردو اس لئے نہیں پڑھاتے کہ ان کے بچے نوکریوں سے محروم ہو جائیں گے۔ وہ اپنے بچوں کو اسلامیہ سکولوں میں داخل کرتے ہوئے اس لئے ڈرتے ہیں کہ یہ اسکول فرقہ پرستانہ ہیں اس لئے ان میں تعلیم پا کر اُن کی اولاد کا مستقبل روشن نہیں ہو سکتا اس قسم کے مسلمان دس بیس نہیں ہر صوبہ اور ہر شہر میں ہزاروں کی تعداد میں ہیں ان لوگوں کو سمجھنا چاہئے کہ جو شخص خود اپنا احترام نہیں کر سکتا دوسرے بھی اس کی عزت ہرگز نہیں کر سکتے۔ جو لوگ اپنی زبان، اپنا کلچر اپنی تہذیب و روایات کی متاعِ گراں اُرز کو فضا میں سیاہ بادلوں کو اٹھتا ہوا دیکھ کر امواجِ دریا کے سپرد کر دیتے ہیں خود ان کے سفینۂ حیات کا عافیت و سلامتی کے ساحل تک پہنچ جانا معلوم! یہ وہی لوگ ہیں جن کی فطرت کی عکاسی نظیری نے اس بلیغ طریقہ پر کی ہے۔

توبخو لشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری   بخدا کہ واجب آمد زتو احتراز کردن

حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط

۲۔ محاذِ عراق و عجم

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق
(استاذ ادبیات عربی ۔ دہلی یونیورسٹی)

(۹)

۸۸۔ خانقین کے مجاہدوں کے نام

حلوان جانے والی سڑک پر یہ شہر جلولار سے تقریباً بیس میل شمال مشرق میں واقع ہے یہاں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ جلولار ذوالقعدہ سنہ ۱۶ھ میں فتح ہوا۔ شکست خوردہ ایرانی فوجیں بھاگ کر خانقین میں پناہ گزیں ہوئیں ۔ یہاں ان کے ساتھ کچھ تازہ دم فوجیں بھی مل گئیں ۔ قعقاع بن عمرو ان کے تعاقب میں آئے اور ان کو شکست دے کر خانقین پر قابض ہوئے ۔

"جب تم کسی قلعہ کا محاصرہ کرو اور اہلِ قلعہ کہیں کہ ہم ہتھیار ڈالنے کو تیار ہیں بشرطیکہ خدا کی منشار کے مطابق ہمارے ساتھ معاملہ کیا جائے تو تم ان کی یہ بات نہ مانو کیوں کہ تم کو اُن کے بارے میں خدا کی منشار اور فیصلہ کا علم نہیں ہے، بلکہ وہ اسی شرط پر ہتھیار ڈالیں کہ تمہاری

صوابدید کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے، پھر جو مناسب ہو ان کے ساتھ برتاؤ کرو۔ جب تمہارا کوئی فوجی دشمن کے کسی شخص سے کہے لَا تَخَفْ یا لا تدھل[1] یا مترس تو یہ سارے لفظ امان کے مترادف ہیں، خدا سب زبانیں جانتا ہے۔"

۸۹۔ قاضی شُرَیح کے نام

شُرَیح تقریباً ساٹھ سال کوفہ کے قاضی رہے۔ طبری نے لکھا ہے کہ حضرت عمر نے ان کو ۱۸ھ میں اس منصب پر فائز کیا تھا۔ ذیل کا خط ازالۃ الخفاء میں دارمی کی سند پر وارد ہوا ہے۔ زیادہ مستند اور مشہور رائے یہ ہے کہ حضرت عمر نے خط کے مضمون سے مشابہ یہ ہدایات شریح کو زبانی دی تھیں جب وہ قاضی ہو کر کوفہ جانے والے تھے:۔

"خدا کی کتاب میں جو فیصلہ تم کو ملے تو اس کو بلا تردد اختیار کر لو، اور جب کوئی فیصلہ وہاں نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کرو، اگر وہاں بھی نہ ملے تو اپنے اجتہاد سے کام لو۔ اس کے علاوہ عدالت میں نہ کسی سے لڑو، نہ جھگڑو اور نہ کوئی چیز خریدو، نہ بیچو۔"

(دیکھئے اصابہ، استیعاب، طبقات ابن سعد، اغانی، مروج الذہب، شرح نہج البلاغۃ ابن حدید)

"اگر تمہارے پاس کوئی ایسا مسئلہ آئے جس کا حل قرآن میں ہو تو

---

[1] قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج میں (ص۲۰۵) لَا تَوْجَلْ ہے اور سنن کبریٰ بیہقی میں "لَا تَدْهَل" جس کے معنی نبطی زبان میں مت ڈرو کے ہیں۔ سنن کبریٰ مصر، ۹/۹۹

اس کے مطابق فیصلہ کرو اور کسی مجتہد کی رائے کی طرف قطعاً دھیان نہ دو، اگر مسئلہ ایسا ہو جس کا حل قرآن میں نہ ملے تو سنتِ رسول کی طرف رجوع کرو اور اگر کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو جس کا حل نہ تو قرآن میں ہو نہ سنت میں اور تم سے پہلے کسی مجتہد نے بھی ایسی رائے نہ دی ہو تو تم کو اختیار ہے خواہ اپنے اجتہاد سے کام لے کر فیصلہ کر دو یا اپنا فیصلہ محفوظ رکھو اور میرا خیال ہے تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ فیصلہ نہ دو۔[1]

(تم کو اختیار ہے خواہ تم اپنے اجتہاد سے فیصلہ کر دو خواہ مجھ سے رجوع کر لو.... روایت شعبی، سنن کبریٰ بیہقی ۱۰/۱۱۱)

۹۰۔ جُندی سابور کی فوجوں کے نام

مسلمان فوجیں رام ہرمز، ایذج، تُستر، اور سُوس فتح کر کے اہواز کے آخری اہم شہر جُندی سابُور کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں کہ ان کے ایک غلام نے چپکے سے تیر میں پروانۂ امان باندھ کر شہر پناہ کے اندر پھینکا۔ شہر کے لوگوں کو سخت پریشانی میں یہ پیغام ملا تو انھوں نے دروازے کھول دئے، اور اُن کے چوپائے باہر نکل آئے۔ مسلمان یہ حال دیکھ کر حیران ہوئے اور اہلِ شہر سے دروازے کھولنے کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے کہا: آپ نے جو پروانۂ امان تیر میں باندھ کر بھیجا تھا ہم نے اسے منظور کر لیا ہے اور جزیہ دے کر آپ کی حفاظت میں رہنے کو تیار ہیں۔ مسلمانوں نے کیمپ میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ایک غلام نے یہ اقدام کیا تھا۔ مسلمانوں نے کہا کہ یہ کام ہمارے غلام نے کیا ہے، ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اہلِ شہر بولے: ہم کیا جانیں آپ نے بھیجا ہے یا آپ کے غلام نے، اگر آپ نہیں مانتے ہیں تو ہم دروازے بند کئے لیتے ہیں۔ اس باب میں حضرت عمر

[1] دارمی ازالۃ الخفار، ۲/۸۵-۸۶

سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے لکھا :-

"

"خدا نے "وفا" کو بہت اونچا اور اہم مقام دیا ہے۔ جب تک "وفا" کے معاملہ میں تم کو ذرا بھی شک یا تذبذب رہے گا تم "باوفا" نہیں ہو سکتے (جُندَی سابُور کے باشندوں کے ساتھ جو وعدہ غلام کے پروانہ میں کیا گیا ہے) اس کو پورا کرو اور اہلِ شہر کو امان دے دو[1]"

فتوح البلدان، بلاذری مصر (ص۳۹۷) میں پروانۂ امان کا قصہ حصنِ سیراف (صوبۂ فارس کا ساحلی شہر) کے محاصرہ کے ضمن میں وارد ہوا ہے اور حضرت عمرؓ کے خط کا مضمون اس واقعہ کے راوی کے مطابق یہ ہے :-

"

"مسلمان غلام (؟) کی حیثیت دوسرے مسلمانوں کی سی ہے، اگر غلام امان دے دے تو یہ ایسا ہے گویا مسلمانوں نے امان دی ہو، لہذا اس کی امان نافذ کر دو۔"

فتوح البلدان کی ایک دوسری روایت کی رو سے جس میں قلعہ یا جگہ کا نام نہیں بتایا گیا ہے خط کا مضمون یہ تھا :-

"چوں کہ غلام سے مسلمانوں کو قوت حاصل ہوتی ہے، اس لئے اس کی امان مسلمانوں کی امان کے برابر ہے[2]"

۹۲- سعد بن ابی وقاص کے نام

جب یزدجرد شاہ ایران نے دیکھا کہ عربوں نے اہواز کا صوبہ بھی فتح کر لیا اور ان کے

---

[1] سیف بن عمر طبری ۴/۲۲۱ [2] فتوح البلدان بلاذری مصر : ص۳۹۵

حوصلے برابر بڑھتے جا رہے ہیں تو وہ غیر معمولی گرم جوشی سے عرب سیلاب روکنے کی کوشش میں لگ گیا۔ ملک کے تمام صوبہ داروں کو توبیخ و ترغیب کے خط لکھے اور فوجیں طلب کیں۔ اسکیم یہ تھی کہ عربوں کی عسکری قوت کا ایران یا عراق میں قلع قمع کر کے اور کھوئے ہوئے علاقہ پر پھر متصرف ہو کر، ان کے ملک پر چڑھائی کی جائے اور مدینہ کی حکومت ختم کر دی جائے۔ یزدجرد نے اپنی اس بھرپور اور آخری کوشش کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مختلف صوبوں سے آئی ہوئی فوجوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ تھی اور جنگ کا سامان بہت اعلیٰ اور فوجوں کے حوصلے بہت بلند تھے۔ اعثم (ص ۶۹) نے یہاں تک لکھا ہے کہ چند فوجیں حلوان، خانقین اور جلولا بھیج دی گئی تھیں اور ان کا رخ مدائن اور کوفہ کی طرف تھا۔ جس وقت یزدجرد کی عسکری حرکت اور منصوبوں کی خبر کوفہ کے گورنر سعد کو ہوئی، نعمان بن مقرن صحابی زیرین عراق کے ضلع کسکر میں تحصیلِ خراج کے عامل تھے۔ ۲۱ھ میں انھوں نے حضرت عمر کو لکھا کہ مجھے یہ کام پسند نہیں ہے، میرے دل میں جہاد کی لگن ہے۔ نعمان عراق اور اہواز کی جنگوں میں بڑی بے جگری سے لڑے تھے۔ حضرت عمر کو نہاوند کے لئے (جہاں ایرانی فوجیں جمع ہو رہی تھیں) ایک نڈر اور مخلص سالار کی ضرورت تھی اور یہ سالار ان کو نعمان میں مل گیا۔ چنانچہ انھوں نے سعد کو لکھا:۔

"نعمان نے مجھے لکھا ہے کہ تم نے انھیں تحصیلِ خراج کے کام پر لگایا ہے جو ان کو پسند نہیں ہے، وہ جہاد کے خواہش مند ہیں، لہذا تم ان کو وقت کی سب سے اہم مہم نہاوند کا سالار بنا کر بھیجو۔" (ابن اسحاق طبری ۴/۲۳۱)

۹۳۔ نعمان بن مقرن کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ عبداللہ عمر امیرالمومنین کی طرف سے نعمان

بن مُقرِن کو سلام علیک۔ میں اس معبود کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایرانیوں کی ایک بڑی فوج تم سے لڑنے نہاوند میں جمع ہوئی ہے۔ میرا خط پاکر خدا کے حکم اور مدد سے اس فوج کے ساتھ جو تمہارے پاس موجود ہے نکل کھڑے ہو۔

۲۔ مسلمانوں کو پتھریلے یا دشوار گذار راستوں سے نہ لے جاؤ۔

۳۔ نہ اُن کو کسی جائز حق سے محروم کرنہ جس کے زیر اثر وہ اسلام سے بدظن ہو جائیں۔

۴۔ نشیبی جنگلوں سے ہو کر کبھی نہ گذرنا (جہاں وہ بیماریوں میں مبتلا ہوں یا درندوں کا لقمہ بنیں) کیوں کہ مجھے ایک مسلمان کی جان ایک لاکھ دینار (تقریباً پانچ لاکھ روپئے) سے زیادہ عزیز ہے"[1]

۹۴۔ اس خط کا دوسرا نسخہ بسند اعثم کوفی ص؎

"بعد سلام کے واضح ہو کہ اہلِ کوفہ نے مجھے مطلع کیا ہے کہ فارسی لشکر بہت بڑی تعداد میں اسلام کا چراغ گل کرنے نہاوند میں جمع ہوا ہے۔ مجھے فضلِ خداوندی سے پوری امید ہے کہ مسلمانوں کو فتح ہوگی۔

۲۔ میں نے اہلِ کفر و ضلالت کے مقابلہ کے لئے ایک لشکر نام زد کیا ہے اور تم کو اس کا سالار مقرر کرتا ہوں۔

۳۔ یہ خط پاکر تم کو چاہیئے کہ اُن مسلمانوں کے ساتھ جو چلنے کو تیار ہوں مدائن کا رخ کرو اور وہاں سفید محل کے پاس کیمپ لگاؤ

---

[1] سیف بن عمر طبری ۴/ ۲۳۲۔

تاکہ بصرہ اور کوفہ سے جو فوجیں اس مہم کے لئے مقرر کی گئی ہیں تم سے آملیں۔

۴۔ جب ساری فوج یک جا ہو جائے تو تم خدا کی مدد اور نظرِ کرم پر بھروسہ کر کے نہاوند کو روانہ ہو جاؤ اور وہاں پہنچ کر جنگی کارروائی شروع کر دو۔ مجھے پکی امید ہے کہ خدا تمہاری مدد کرے گا اور دشمن سرنگوں ہوں گے۔

۵۔ سائب بن اقرع کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں، ان کو جو کام سونپا ہے تم کو زبانی بتائیں گے اور تمہارے ساتھ رہیں گے۔[1]

۶۔ تم پر لازم ہے کہ خدا کی مدد اور فضل پر بھروسہ رکھو اور اس کے وعدہ کو جو اس نے ایران و شام کی فتح کا ہم سے کیا ہے برحق سمجھو، کیوں کہ خدا اپنے وعدہ سے کبھی نہیں پھرتا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۔ جب تمھارا مقابلہ دشمن سے ہو تو تم کو چاہئے کہ ڈٹے رہو اور صبر کا دامن مضبوطی سے تھامے رہو، خدا صبر کرنے والوں کے حق میں فرماتا ہے کہ ان کو بے اندازہ انعام ملے گا۔ یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔

۹۵۔ اس خط کا تیسرا نسخہ بروایت سیف بن عمر:۔

جب حضرت عمر کو معلوم ہوا کہ یزدجرد نے اپنے قلمرو کے ہر صوبہ اور شہر سے فوجیں طلب کی ہیں اور اُن کی ڈیڑھ لاکھ کے قریب جمعیت حُلوان کی سرحد پر جمع ہو رہی ہے تو انھوں نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ آیا اس بڑے خطرہ کے مقابلہ کے لئے میں خود جاؤں یا کسی کو بھیجوں۔ طے ہوا کہ آنے والی مہم ایک ہمت ور،

---

[1] سائب کے ذمہ مال غنیمت کی نگہداشت اور تقسیم تھی۔

نڈر اور تجربہ کار سالار کے سپرد کی جائے اور حضرت عمر مرکز سے باہر نہ جائیں۔ حضرت عمر کی نظرِ انتخاب نعمان بن مُقَرّن پر پڑی جن کے دل میں جہاد کا بے پایاں جوش تھا۔ جیساکہ ہم اوپر پڑھ آئے ہیں جب ہرمزان اور یزدجرد کی فوجیں مسلمانوں کو اہواز سے نکالنے اُٹھی تھیں، اس وقت نعمان مرکز کے زیرِ ہدایت اپنے مستقر کسکر سے اہواز گئے تھے۔ اور وہاں رامہرمز، ایذج وغیرہ اہم فتوح حاصل کر کے کوفہ کے چند سالاروں کے ساتھ بصرہ میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ حلوان کی سرحد پر جنگ کے سیاہ بادل چھانے لگے۔ حضرت عمر نے یہ خط نعمان کو بھیجا اور ایلچی کو تاکید کی کہ ان کو صورتِ حال سے پوری طرح باخبر کر دے:۔

"میں نے تم کو اُس لشکر کا سالارِ اعلیٰ مقرر کیا ہے جو فارسیوں کے مقابلہ میں بھیجا جائے گا۔ تم نہاوند کی طرف روانہ ہو جاؤ اور ماہ[1] میں جاکر خیمہ لگاؤ۔ میں نے کوفہ کے حاکم (عبداللہ بن عبداللہ بن عِتبان) کو لکھا ہے کہ ایک فوج تمھارے پاس بھیجیں۔ جب یہ فوج تم سے آملے تو کل فوج کے ساتھ فیروزان (ایرانی فوجوں کا سپہ سالار) اور اُن کی فارسی وغیر فارسی فوجوں سے لڑنے نکلو۔ خدا سے فتح کی دعا مانگتے رہو اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ کا ورد رکھو۔"

۹۶۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

یہ خط شاہ ولی اللہ دہلوی نے ازالۃ الخفا میں نقل کیا ہے۔ اس کے سیاق وسباق پر

---

[1] ماہ سے مراد غالباً ماہ شہریاراں ہے جو اُس ضلع کا نام تھا جس میں طرز نامی شہر تھا جہاں بقول سیف بن عمر نعمان نے اپنا خیمہ لگایا تھا اور جہاں بصرہ اور کوفہ کی فوجیں ان سے آکر ملی تھیں۔

یاقوت مصر ۷/۲۷۶

[2] سیف بن عمر، طبری ۴/۲۳۹

روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سعد کو لکھے گئے خط کا ٹکڑا ہے :-

"اے سعد! جب خدا کسی انسان کو چاہتا ہے تو اس کو لوگوں کا چہیتا بنا دیتا ہے۔ پس اگر تم یہ معلوم کرنا چاہو کہ خدا تم کو کتنا چاہتا ہے۔ تو یہ دیکھو کہ لوگ تم کو کتنا چاہتے ہیں۔ یاد رہے کہ تم خدا کی رضا جوئی جتنی کروگے اتنا ہی خدا تمہارا خیال کرے گا۔"[1]

۹۷۔ نعمان بن مقرّن کے نام

سیف بن عمر کا بیان ہے کہ جب نعمان طَرَز نامی شہر میں مقیم تھے تو ان کو ذیل کا خط موصول ہوا۔ طرز حلوان سے تیس پینتیس میل مشرق میں خراسان کی شاہ راہ سے کوئی بیس میل ہٹ کر ایک وسیع میدان میں واقع تھا۔ کوفہ کی فوجیں اسی جگہ نعمان سے ملی تھیں، طرز سے نہاوند تقریباً ستر میل دور تھا۔ نعمان نے اسی جگہ سے طلیحہ، عمرو بن معدی کرب اور عمرو بن سلمی کی سرکردگی میں گشتی دستے ایرانی لشکر کے حالات اور گردوپیش کا جغرافیہ دریافت کرنے روانہ کئے تھے[2]

"واضح ہو کہ تمھاری فوج میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو عہدِ جاہلیت میں بڑے سورما اور صاحبِ اقتدار رہ چکے ہیں۔ اُن کو ایسے لوگوں پر سبقت دو جو علم جنگ میں اُن سے کم ہیں۔ اُن سے مشورہ کرو اور اُن کے مشورہ پر عمل کرو۔ طلیحہ، عمرو بن معدی کرب اور عمرو بن ابی سلمی

---

[1] ازالۃ الخفاء بریلی ۲/۱۸۲

[2] مقدسی، لیدن ص۳۹۳ و ۴۰۱ و یاقوت مصر ۶/۴۹ و ۴ /۴۴۰

سے جنگی معاملات میں صلاح لو مگر کوئی عہدہ ان کے سپرد نہ کرو[1]"

اس خط کا کسی قدر مختلف نسخہ ابو عبیدہ معمر مثنی کی کتاب مقاتل الفرسان کے حوالہ سے ازالۃ الخفاء (۲/۲۰۲) میں بھی بیان ہوا ہے۔

۹۸۔ عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان کے نام

جب سعد بن ابی وقاص شکایتوں کی صفائی پیش کرنے کوفہ سے مدینہ روانہ ہوئے تو انھوں نے ایک سمجھدار اور معزز عرب عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان کو اپنا جانشین مقرر کیا جن کو بعد میں حضرت عمر نے گورنری پر بحال رکھا جس وقت سرحد حلوان پر جمع ہونے والی ایرانی فوجوں سے تصادم کی تیاری ہو رہی تھی، ابن عتبان کوفہ کے گورنر تھے، حضرت عمر نے نعمان کو مذکورہ بالا خط لکھنے کے بعد یہ فرمان ابن عتبان کو بھیجا:۔

"کوفہ سے اتنی فوج نعمان بن مقرن کے پاس بھیجو۔ میں نے نعمان کو لکھا ہے کہ اہواز سے ماہ کی طرف پیش قدمی کریں۔ کوفہ کی فوج کو چاہیئے کہ ماہ میں نعمان سے جا ملیں اور اس فوج کو لے کر نعمان نہاوند کو روانہ ہوں۔ کوفہ کی فوج پر حذیفہ بن یمان کو سالار مقرر کرتا ہوں۔ کل فوج کے سالارِ اعلیٰ نعمان ہوں گے۔ میں نے نعمان کو یہ بھی لکھا ہے کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو کل فوج کے سالار حذیفہ ہوں گے اور اگر حذیفہ کو کوئی چشم زخم لگے تو فوج کے سالار نعیم بن مقرن ہوں گے[2]"

---

[1] سیف بن عمر طبری ۱/۲۴۰ [2] سیف بن عمر طبری ۴/۲۳۹

۹۹- کوفہ کے باشندوں کے نام

سنہ ۲۱ھ میں جب اہل فارس کی زبردست فوجی تیاری کی خبریں جنہوں نے بعد میں جنگِ نہاوند کی شکل اختیار کی، سارے مفتوحہ اسلامی علاقہ میں گرم ہورہی تھیں، اس وقت کوفہ کے کچھ تنگ نظر اور قبائلی ذہنیت کے لوگوں نے اپنے گورنر سعد بن ابی وقاص کی مرکز سے شکایت کی اور ان کو معزول کرانا چاہا۔ حضرت عمر نے شکایت کی تحقیق کرائی اور گو کہ اس سے کوئی وزنی بات سعد کے خلاف بہم نہ ہو سکی، پھر بھی انھوں نے اہلِ کوفہ کو خوش کرنے کے لئے ایک دوسرے شخص عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان کو گورنر مقرر کیا۔ نئے گورنر کے عہد میں نہاوند کی مشہور اور فیصلہ کن لڑائی ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد ان کو ایک عسکری مہم پر بھیجا گیا اور اُن کی جگہ زیاد بن حنظلہ گورنر مقرر ہوئے۔ زیاد کو یہ عہدہ پسند نہ آیا اور جلد ہی انھوں نے استعفا دے دیا[1]۔ اہل کوفہ کی قبائلی تنگ نظری اور فتنہ پرور رجحانات دور کرنے کے لئے حضرت عمر نے ضروری سمجھا کہ کوفہ میں تعلیم قرآن کا مناسب اور مستقل انتظام کیا جائے اور یہ انتظام براہِ راست مرکز کی زیرِ نگرانی ہو، گورنر کو دوسرے کاموں سے اتنا وقت نہ ملتا تھا کہ تعلیم و تربیت کی طرف کماحقہ توجہ کر سکتا۔ اس لئے انھوں نے گورنر کے فرائض دو حصوں میں بانٹ دیئے اور مدینہ سے دو آدمی بھیجے، ایک عمار بن یاسر جن کے سپرد امامت اور فوجی معاملات تھے اور دوسرے عبداللہ بن مسعود جن کو تعلیم اور خزانہ کی نگرانی پر مامور کیا گیا۔ ان کے ساتھ حضرت عمر نے کوفہ کے باشندوں کے نام یہ خط بھیجا :-

"واضح ہو کہ میں تمھارے پاس عمّار بن یاسر کو گورنر اور ابن مسعود کو

[1] سیف بن عمر طبری ۲۳۶/۴ و ۲۴۶

معلم اور وزیر بنا کر بھیج رہا ہوں یہ دونوں رسول اللہ کے بہترین صحابہ اور بدر کے ممتاز مجاہدوں میں سے ہیں۔ ان کا کہا مانو اور ان کے طور طریق پر عمل کرو۔ میں عبداللہ بن مسعود (جیسے عالم دین کو جن کی مجھے یہاں ضرورت ہے) ایثار کر کے تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔"

مذکورہ خط ازالۃ الخفا سے لیا گیا ہے، اس کا نسخہ طبری میں سیف بن عمر کی سند پر یہ ہے:-

"واضح ہو کہ میں نے عمار بن یاسر کو تمہارا گورنر اور عبداللہ بن مسعود کو تمہارا معلم اور وزیر مقرر کیا ہے، ان کے علاوہ حذیفہ بن یمان کو دجلہ سے سیراب ہونے والے علاقہ کا حاکم خراج مقرر کرتا ہوں۔"[۱]

فتوح البلدان میں قاسم بن سلام کی سند پر ایک روایت بیان ہوئی ہے جس کی رو سے حضرت عمر نے پیمائش اور لگان بندی کی خدمت پر حضرت عثمان بن حنیف کو مامور کیا تھا، اور ان تین افسروں کے لئے ایک بکری یومیہ راشن کی تھی اس طرح کہ نصف مع ہاتھ پیروں کے عمار کو دی جاتی اور نصف میں ابن مسعود اور عثمان شریک ہوتے۔[۲]

---

[۱] سیف بن عمر، طبری ۴/۲۴۷ [۲] فتوح البلدان، مصر، ۱۳۱۹ھ ۲۷۸

مکتوبِ نبوی اور قیصر روم کا اعتراف

از

(جناب سید محبوب صاحب رضوی)

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت روم و ایران کی حکومتیں اپنی سطوت و جبروت اور طاقت و عظمت کے لحاظ سے دنیا کی سب سے زیادہ پُرشوکت حکومتیں سمجھی جاتی تھیں، روم کی حکومت کا دار السلطنت قسطنطنیہ تھا، یورپ کے مختلف ممالک کے علاوہ ایشیا میں شام (سیریا) فلسطین اور مصر رُوم کے زیرِ اقتدار تھے، روم کا شہنشاہ "قیصر" کہلاتا تھا، بعثتِ نبوی کے زمانہ میں روم کا شہنشاہ ہرقل (ہرکل یوس) تھا، یہ جس طرح شان و شوکت میں ممتاز سمجھا جاتا تھا اسی طرح مذہبی علوم میں بھی زبردست مہارت رکھتا تھا۔

ساتویں صدی عیسوی کے شروع سے روم و ایران کے درمیان زبردست ہنگامہ آرائی چلی آ رہی تھی، پہلے چند سال تک ایران کو غلبہ حاصل رہا اور اُس نے رُوم کے تمام ایشیائی ممالک کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا، مگر ۶۱۶ء کے بعد ہوا کا رخ الیسا پلٹا کہ ایرانیوں کو شکست پر شکست ہونی شروع ہوئی اور قیصر نے وہ تمام ممالک جو ایران نے چھین لئے تھے چند ہی سال میں واپس لے لئے۔

مسلمانوں کو روم کے عیسائیوں سے (اُن کے اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے) ہمدردی تھی، اور قریش مکہ ایران کے زردشتیوں سے دل چسپی رکھتے تھے، ابتداءً جب رومیوں کو شکست ہوئی تو قریش کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا، اس موقع پر مسلمانوں کا دل شکستہ ہونا قدرتی بات تھی، قرآنِ حکیم نے اُسی وقت مسلمانوں کی دل جوئی کے لئے یہ بشارت سُنائی:-

غُلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ فِي بِضْعِ سِنِينَ — رومی ایک قریب کے موقع میں مغلوب ہو گئے، وہ اس مغلوبیت کے بعد چند ہی سال میں غالب ہو جائیں

لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ یَوْمَئِذٍ گے! فیصلہ قبل اور بعد اللہ ہی کے لئے ہے، اُس

یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ (سورۂ روم) وقت مسلمان خوش ہو جائیں گے!"

قیصرِ روم، ایران پر شاندار فتح کی خوشی میں اپنے پایۂ تخت قسطنطنیہ سے پاپیادہ زیارت کے لئے بیت المقدس آیا ہوا تھا، طمطراق اور شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ راستے میں جہاں قدم رکھتا زمین پر فرش اور فرش پر پھول بچھائے جاتے تھے[1]

ہادیِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کو جزیرہ نمائے عرب سے باہر پہنچانے میں طرح طرح کی اندرونی رکاوٹیں پیش تھیں، ۶ھ میں حُدیبیہ کے التوائے جنگ کے معاہدہ سے جب یہ رکاوٹیں دُور ہو گئیں تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمسایہ ممالک کے فرماں رواؤں کے نام نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے، اس سلسلہ میں قیصرِ روم کے نام بھی ایک مکتوبِ گرامی روانہ کیا گیا۔ حدیث و تاریخ میں اس واقعہ سے متعلق کافی تفصیلات محفوظ ہیں۔

قیصر کے سامنے جب نامہ مبارک پیش ہوا تو اُس نے حکم دیا کہ "عرب کا کوئی شخص اگر مل سکے تو لایا جائے"۔

اتفاق سے بیت المقدس کے قریب غزہ میں قریشِ مکہ کے تاجروں کا ایک قافلہ مقیم تھا، امیرِ قافلہ ابوسفیان تھے جو ابھی تک اسلام نہ لائے تھے، قیصر کے آدمی جا کر قافلہ کے لوگوں کو لے آئے۔

قیصر نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دربار منعقد کیا، اور اہلِ عرب کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ "تم میں اس مدعیِ نبوت کا رشتہ دار کون ہے؟"

ابوسفیان نے کہا "میں اُس کا رشتہ دار ہوں"

قیصر نے اُن کو تخت کے قریب بلا لیا، اور ابوسفیان کے ہمراہیوں سے کہا کہ "تم اس شخص کے پیچھے بیٹھ جاؤ، میں اِس سے کچھ سوالات کرتا ہوں اگر کسی بات میں یہ جھوٹ بولے تو تم مجھے اشارہ سے بتلا دینا"

---

[1] تاریخ طبری جلد ۳ ص ۸۵

ابو سفیان کا بیان ہے کہ اس موقع پر میں نے ارادہ کیا کہ میں قیصر کے دل میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات کو اہمیت نہ اختیار کرنے دوں، اس لئے میں نے قیصر سے کہا کہ "آپ اُس شخص کی وجہ سے کیوں خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں جو بات آپ کو اس کے متعلق معلوم ہوئی ہے اُس سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان بہت کم ہے ـــــ مگر میں نے دیکھا کہ میری اس بات کا قیصر پر کچھ اثر نہیں ہوا، بلکہ اس کے برخلاف قیصر نے کہا کہ "تم صرف اُن باتوں کا جواب دو جو میں تم سے اُس کے متعلق دریافت کروں"۔

میں نے کہا "آپ دریافت فرمائیں!"

قیصر:۔ "مدعیٔ نبوت کا خاندان کیسا ہے؟"

ابوسفیان:۔ "نہایت شریف!"

قیصر:۔ "پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندان سے ہوتے ہیں، تاکہ اُن کی اطاعت سے کسی کو عار نہ ہو، کیا اُس کے خاندان میں کسی اور نے بھی کبھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ یا اُس میں کوئی بادشا گزرا ہے؟"

ابوسفیان:۔ "کبھی نہیں!"

قیصر:۔ "اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے، اُس کو بادشاہت کی ہوس ہے اور باپ دادا کی سلطنت حاصل کرنا چاہتا ہے"۔

"جن لوگوں نے اُس کا مذہب قبول کیا ہے وہ کم زور ہیں یا صاحب اثر؟"

ابوسفیان:۔ "کم زور لوگ ہیں!"

قیصر:۔ پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔
اچھا اُس کے پیرو بڑھتے جارہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟"

ابوسفیان:۔ اُس کے پیروؤں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے"۔

قیصر:۔ ایمان کی کشش کا یہی عالم ہے، اُس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے، کیا کچھ

لوگ اُس کے دین سے بیزار ہو کر اُس کو چھوڑ بھی بیٹھے ہیں ؟"

ابوسفیان :۔ اب تک تو کسی نے ایسا نہیں کیا !"

قیصر :۔ ایمان کی خوبی یہی ہے کہ وہ جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ اپنی صداقت کے ساتھ دل نشین ہوتا ہے ، ایمان کی لذت کی یہی تاثیر ہے کہ جب وہ دل میں بیٹھ جاتی ہے ، اور روح پر اپنا اثر کر لیتی ہے تو پھر جُدا نہیں ہوتی !

اُس کے دعوئے نبوت سے پہلے تم اُسے سچا سمجھتے تھے ، یا کبھی اس کے جھوٹ کا کبھی تمہیں تجربہ ہوا ہے ؟"

ابوسفیان :۔ نہیں ! اُس نے جھوٹ کبھی نہیں بولا "

قیصر :۔ جو شخص لوگوں سے جھوٹ نہ بولے وہ خدا پر کیوں کر جھوٹ باندھ سکتا ہے !

پیغمبر نہ کبھی جھوٹ بولتے ہیں اور نہ کسی کو دھوکہ دیتے ہیں !

کیا کبھی وہ عہد و پیمان کی بھی خلاف ورزی کرتا ہے ؟"

ابوسفیان :۔ ابھی تک تو کبھی ایسا نہیں ہوا ـــــــ لیکن اب جو معاہدہ صلح ہوا ہے اُس میں دیکھنا ہے کہ وہ اپنے عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں "

قیصر :۔ پیغمبر عہد شکن نہیں ہوتے !

کبھی اُس کے ساتھ تمہاری جنگ بھی ہوئی ہے ؟"

ابوسفیان :۔ جی ہاں ! کئی مرتبہ ہو چکی ہے "

قیصر :۔ جنگ کا نتیجہ کیا رہا ؟ "

ابوسفیان :۔ کبھی وہ غالب آئے اور کبھی ہم "

قیصر :۔ خدا کے پیغمبروں کا یہی حال ہوتا ہے ـــــــ لیکن آخر کار کامیاب وہی ہوتے ہیں ، وہ تعلیم کیا دیتا ہے ؟"

ابوسفیان :۔ وہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو ، کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ ، پاک دامنی

اختیار کرو، سچ بولو، لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، باپ دادا کے مشرکانہ طریقے کو چھوڑ دو"۔

قیصر:- نبیِ موعود کی یہی علامتیں ہمیں بتلائی گئی ہیں، مجھے یقین تھا کہ عن قریب ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے، مگر میرا یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں ہوگا،

ابوسفیان!- اگر تم نے جھوٹ نہیں بولا تو ایک روز وہ اس جگہ کا جہاں میں بیٹھا ہوا ہوں ضرور مالک ہو جائے گا ——— اے کاش! میں اُن کی خدمت میں پہنچ سکتا تو اُن کے پاؤں دھوتا!"[1]

اس گفتگو کے بعد حکم دیا کہ نامۂ مبارک پڑھا جائے، فرمانِ رسالت میں لکھا تھا:-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

محمد کی جانب سے جو خدا کا بندہ اور رسول ہے ہرقل قیصرِ روم کے نام

اُس پر سلامتی ہو جس نے راہِ راست اختیار کی،

بعد ازاں میں آپ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اسلام قبول کیجیے! تمام آفات سے آپ محفوظ رہیں گے، اور اللہ تعالیٰ آپ کو دوہرا اجر عطا فرمائے گا، اور اگر آپ نے اعراض کیا تو آپ کو واضح رہنا چاہیئے کہ آپ کی رعایا کی گمراہی کی ذمہ داری بھی آپ ہی کے اوپر ہوگی!

اے اہلِ کتاب! ایک ایسی بات اختیار کرو جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، وہ یہ کہ ہم سب خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور نہ کسی کو اُس کا شریک ٹھہرائیں، اور نہ ہم اللہ کے سوا ایک دوسرے کو اپنا رب بنائیں۔

اگر تمہیں اس بات سے انکار ہے تو تمہیں معلوم رہنا چاہیئے کہ ہم بہرحال خدا کی یکتائی کا عقیدہ رکھتے ہیں! (مہر) محمد رسول اللہ

قیصر نے ابوسفیان سے جو گفتگو کی تھی اہلِ دربار اُس سے سخت مشتعل تھے، فرمانِ رسالت کے پڑھے جانے پر اور بھی برہم ہو گئے، قیصر نے یہ رنگ دیکھ کر سفیرِ رسالت حضرت دحیہؓ سے کہا کہ

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۸۷ و صحیح بخاری

"اگر مجھے اپنے لوگوں سے اپنی جان کا خوف نہ ہوتا تو میں ضرور تمہارے نبی کا اتباع کرتا، وہ بلا شبہ وہی نبی ہیں جن کے ہم منتظر تھے"[1]

ہر چند قیصر کے دل میں نورِ ایمان جلوہ افگن ہو چکا تھا، مگر تخت و تاج کی محبت میں وہ روشنی مجھ کر رہ گئی۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت دحیہؓ کو قیصر کے پاس روانہ فرمایا تھا تو ساتھ ہی روم کے پاپائے اعظم ضغاطر کے نام بھی ایک مکتوب ہدایت ارسال فرمایا تھا، اُس میں تحریر تھا:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلام اُس پر جو خدا پر ایمان لایا، میں اس عقیدے پر ہوں کہ (حضرت) عیسٰی بن مریم اللہ کی روح اور اُس کا کلمہ ہیں! خدا نے اُن کو پاک دامن مریم پر القا کیا۔

میں خدا پر اور اُس کی ان تمام کتابوں پر اور اُس کے احکام پر ایمان رکھتا ہوں جو مجھ پر نازل ہوئیں اور (حضرت) ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق اور یعقوب (علیہم السلام) اور اُن کی اولاد پر اتاری گئیں، اور اُن پر بھی میرا ایمان ہے جو (حضرت) موسیٰ و عیسٰی اور دیگر انبیاء کو اُن کے ربّ کی جانب سے دی گئیں!

ہم ایمان و اعتقاد میں کسی ایک نبی کے تسلیم کرنے میں بھی باہمی فرق نہیں کرتے، ہم مسلمان (یعنی تسلیم کرنے والے) ہیں۔

سلام اُس پر جو ہدایت کی پیروی کرے[2] (مہر) محمد رسول اللہ

پاپائے اعظم نے فرمانِ رسالت کو دیکھ کر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کی اور کہا کہ "بے شک یہ نبیٔ برحق ہیں، بعد ازاں گرجا میں جا کر ایک مجمع سے خطاب کیا کہ:

"اے پیروانِ مسیح! میرے پاس عرب کے پیغمبر احمد کا خط آیا ہے، انھوں نے ہمیں خدائے واحد کے دین کی دعوت دی ہے، میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، اور

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۸۷ [2] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲۸

احمد خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں!"[1]

پاپائے اعظم کے اس اعلانِ حق و صداقت کو سن کر رومی سخت غضب ناک ہو گئے اور اپنے اس عظیم پیشوا کو اتنا زد و کوب کیا کہ وہ بے چارہ جاں بحق ہو گیا۔"[2]

حضرت دحیہؓ نے جب واپس آکر بارگاہِ رسالت میں روم کے یہ دونوں واقعے عرض کئے تو زبانِ وحی ترجمان سے ارشاد فرمایا گیا کہ :-

"کسریٰ راہیِ عدم ہوا، اس کے بعد اب کسریٰ نہ ہوگا، اور جب قیصر کا انتقال ہوگا تو اس کے بعد قیصر نہ ہوگا!" (یعنی خسرو پرویز شہنشاہ ایران اور ہرقل قیصر روم کے اقتدار کے بعد دونوں سلطنتوں کا اقتدار زوال پذیر ہو جائے گا، اور تختِ روم و ایران پر پھر کسی کو ایسا اقتدار نصیب نہ ہوگا) اور قسم ہے اُس ذاتِ اقدس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم دونوں سلطنتوں کے خزانے اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے۔"

چنانچہ چند ہی سالوں کے بعد حضرتِ فاروقِ اعظمؓ کے عہدِ خلافت میں دنیا نے دیکھا کہ یہ دونوں عظیم الشان سلطنتیں شمعِ رسالت کے پروانوں کے قدموں کے نیچے تھیں[3]

"سیرتِ عمرؓ" میں علامہ ابن جوزیؒ نے (جو نقلِ واقعات اور روایت کی جرح و تنقید میں انتہائی محتاط اور سخت ہیں) حضرتِ دحیہؓ کی سفارتِ روم کے سلسلہ میں ذیل کا ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کیا ہے، حضرت دحیہؓ فرماتے ہیں کہ "جب قیصرِ روم نے اپنی قوم کے عمائد کا اسلام سے تنفر پایا تو مجلس برخاست کر دی، اور دوسرے روز مجھے علیحدہ ایک عالی شان محل میں بلایا، وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کمرے میں چاروں طرف تین سو تیرہ تصویریں لگی ہوئی ہیں، قیصر نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ "یہ کل تصویریں جو تم دیکھتے ہو نبیوں اور پیغمبروں کی ہیں، کیا تم بتا سکتے ہو کہ ان میں تمہارے نبی کی کون سی تصویر ہے؟"

میں نے بغور دیکھ کر ایک تصویر کی جانب اشارہ کیا کہ "یہ ہے!

---

[1] تاریخ طبری ج ۲ ص ۸۸ [2] ایضاً [3] تفصیل کے لئے دیکھیے "الفاروق" علامہ شبلی حصہ اول،

قیصر نے کہا۔ "بے شک یہی آخری نبی کی تصویر ہے۔" قیصر نے پھر دریافت کیا کہ۔ "اس تصویر کی داہنی جانب کی تصویر کو بھی پہچان سکتے ہو؟"

میں نے بتلایا کہ۔ "یہ نبی آخر الزماں کے ایک صحابی ابوبکر صدیقؓ کی تصویر ہے۔"

قیصر نے پھر پوچھا۔ "اور یہ بائیں طرف کی تصویر کس کی ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ اُن کے دوسرے صحابی عمر فاروقؓ ہیں۔"

قیصر یہ سن کر کہنے لگا کہ۔ "تورات کی پیشین گوئی کے مطابق یہی دو شخص ہیں جن کے ہاتھوں سے تمہارے دین کی ترقی اوجِ کمال کو پہنچے گی۔"

حضرت دِحیہؓ کا بیان ہے کہ۔ "میں جب سفارت کو انجام دے کر بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا تو یہ تمام واقعہ آپ کو سُنایا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ۔ "قیصر نے سچ کہا، واقعی اسلام کی ترقی ان ہی دو شخصوں کے ہاتھوں کمال کو پہنچے گی!"[1]

---

[1] سیرتِ عمر لابن جوزی صہ ۳۱

تزک بابری

از

(جناب محمد رحیم صاحب دہلوی)

(۶)

ملاقات | میں شاہرخیہ کے باہر حیدر بیگ کے بنائے ہوئے باغ میں خان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خان باغ کی چار دری میں اترے ہوئے تھے۔

میں نے اندر پہنچتے ہی تین دفعہ جھک کر سلام کئے۔ خان بھی تعظیم کے لئے اُٹھ کر کھڑے ہوئے۔ ملنے اور پچھلے پاؤں ہٹ کر ایک سلام کرنے کے بعد خان نے اپنے پاس بلایا اور پہلو میں بٹھالیا اور نہایت شفقت اور مہربانی فرمائی۔

والد کے مزار کی زیارت | دو ایک دن بعد میں کندزلا[1] درامانی کے راستے سے آخشی اور اندجان چلا۔ آخشی میں والد کے مزار کی زیارت کی۔

جمعہ کی نماز کے وقت میں آخشی سے چلا اور بند سالار کے راستے سے مغرب وعشا کے درمیان اندجان آگیا۔ بند سالار کا یہ راستہ ۲۷ میل ہے۔

جنگلیوں سے خراج لیا | اندجان کی جنگلی قوموں میں چک رکٹ[2] ایک قوم ہے۔ اس کے پانچ ہزار گھر ہیں۔ کاشغر اور فرغانہ کے بیچ میں پہاڑ ہیں یہ ان میں رہتے ہیں ان کے پاس گھوڑوں اور بھیڑوں کی بہتات ہے۔ ان پہاڑوں[3] میں معمولی بیلوں کی بجائے پہاڑی گائے پالتے ہیں۔ اس لئے پہاڑی گائیں بھی ان کے پاس کثرت سے ہوتی ہیں۔ یہ لوگ چونکہ دشوار گذار پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ اس لئے مال گذاری نہیں دیا کرتے۔

---

[1] کندزلک [2] چگ رگ [3] اس کو گاؤ قطاس کہتے ہیں۔

میں نے قاسم بیگ کو لشکر کا سردار بنا کر ان کی طرف بھیجا۔ کہ ان سے کچھ مال وصول کرے اور ہمارے لشکر کے لئے روانہ کرے۔ قاسم بیگ نے جا کر بیس ہزار بھیڑیں اور پندرہ سو گھوڑے لئے اور فوج کو بانٹے۔

میرے ایلچی کی بے عزتی

لشکر جب چک رک سے واپس آیا۔ تو اوراتیبہ جانے کا ارادہ کیا۔ وہ مدت سے عمر شیخ مرزا کے قبضہ میں تھا۔ جس سال مرزا کا انتقال ہوا۔ اسی سال وہ قبضہ سے نکل گیا۔ اب بائسنغر مرزا کی طرف سے اس کا چھوٹا بھائی سلطان علی مرزا وہاں تھا۔ اس نے میرے آنے کی خبر سنی تو بلغار[1] وسیحا[2] کی طرف چل دیا۔ اور اپنے آتکہ شیخ ذوالنون کو چھوڑ گیا۔ میں خجند سے ہوتا ہوا ادھر چلا۔ راستے میں سے خلیفہ کو بطور ایلچی شیخ ذوالنون کے پاس بھیجا۔ اس —— مردود نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ اور خلیفہ کو گرفتار کر کے قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ خدا کو بچانا منظور تھا۔ خلیفہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلا۔ اور ہزاروں تکلیفیں اٹھا کر دو تین دن بعد پیدل اور ننگے بدن اوراتیبہ کے قریب میرے پاس پہنچا۔

اوراتیبہ پر محمد حسین کا قبضہ

جاڑے کا موسم قریب آگیا اور لوگوں نے غلہ وغیرہ اٹھالیا۔ اس لئے میں چند دن کے لئے اندجان کی طرف لوٹ گیا۔ مری واپسی کے بعد خان کی فوج اوراتیبہ پر جاچڑھی۔ وہاں کے لوگ مقابلہ نہ کر سکے۔ اوراتیبہ محمد حسین گورگان کے حوالے کر دیا۔ اس دن سے سنہ ۹۰۸ھ تک وہ اسی کے قبضے میں رہا۔

سنہ ۹۰۱ھ ہجری کے واقعات

حصار پر سلطان حسین کا حملہ

سلطان حسین مرزا نے خراسان سے حصار پر فوج کشی کی۔ جاڑے میں وہ ترمذ آگیا۔ سلطان مسعود مرزا بھی اپنی فوج اکٹھی کر کے ترمذ ہی پر مقابلے میں آجما[3]۔ خسروشاہ نے قندز کو مضبوط کیا اور خود وہاں رہا۔ اپنے چھوٹے بھائی ولی کو لشکر کے ساتھ

[1] بلغار ایک شہر کا نام ہے۔ بحر ظلمات کے قریب سکندر نے اس کو آباد کیا تھا۔ بلغار کے معنی لبیبار غار ہیں۔ اس شہر کے قریب بہت سے غار ہیں۔ [2] بلغار وسیحا کی بجائے مسٹر جان لیڈی نے "دیہات مشیخا" لکھا ہے [3] ۱۴۹۵ء [4] "تاکہ اسے دریائے آمو کو پار کرنے سے روکے" مسٹر جان لیڈی نے اپنے ترجمے میں یہ فقرہ زیادہ لکھا ہے

سلطان حسین مرزا کے مقابلے کے لئے بھیجا۔

ان لشکروں نے سردیوں کا بڑا حصہ دریا کے کنارے گذارا۔ پار نہ جا سکے۔

چپکے چپکے دریا پار کر لیا | سلطان حسین مرزا تجربہ کار اور ہوشیار بادشاہ تھا۔ اس نے دشمنوں کی بے خبری میں پانچ چھ سو آدمیوں کا دستہ عبداللطیف بخشی کے تحت چپکے چپکے کلف[۱] کی طرف سے بھیجا۔

دشمنوں کو خبر ہونے سے پہلے عبداللطیف بخشی نے لشکر کو لے کر دریا پار کیا۔ اور دریا کے کنارے مضبوط کر لئے۔

مسعود مرزا کا فرار | سلطان مسعود مرزا کو جیسے ہی یہ خبر معلوم ہوئی۔ وہ بزدلی کے سبب یا باقی چغانیانی کے بہکائے سے جو ولی کا دشمن تھا۔ فوج سے مقابلہ کئے بغیر گھبرا کے فوراً حصار کی طرف بھاگا۔

حالانکہ ولی نے بہت سمجھایا کہ دریا کو پار کر لینے والے لشکر پر فوراً حملہ کرنا چاہیئے۔

جگہ جگہ حملے کی تدبیریں | سلطان حسین مرزا نے دریا پار کر کے بدیع الزماں مرزا، ابراہیم حسین، ذوالنون ارغون اور محمد ولی بیگ کو فوراً خسرو شاہ کے پاس بھیجا۔ مظفر حسین مرزا اور محمد برندق برلاس کو ختلان روانہ کیا۔ اور آپ حصار کی طرف آیا۔

مسعود کو حصار سے بھی بھاگنا پڑا | سلطان حسین مرزا کے قریب آ جانے کی خبر ملی تو سلطان مسعود مرزا نے حصار میں ٹھیرنا مناسب نہ جانا۔ اور کمرودی کے اوپر کی طرف سرہ تاق کے رستے سے اپنے چھوٹے بھائی بالسنغر مرزا کے پاس سمرقند چلا گیا۔ اور ولی ختلان کی طرف بھاگ گیا۔

حصار پر تین دوستوں کا قبضہ | باقی چغانیانی، محمود برلاس اور قوچ بیگ کے باپ سلطان احمد نے حصار کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔

مسعود کے تعاقب میں | سلطان حسین مرزا نے جیسے ہی یہ خبر سنی۔ ابوالحسن مرزا کو کچھ فوج دے کر کمرود کی گھاٹی کے اوپر کی طرف سے سلطان مسعود مرزا کے پیچھے بھیجا۔ ابوالحسن مرزا نے اس کو راستہ میں جا لیا۔ مگر وہ کچھ کر نہ سکا۔ البتہ مرزا بیگ قرن[۲] جی نے خوب مردانگی دکھائی۔

---

[۱] کلف، دریائے آمو کے قریب ترمذ کے نیچے کی طرف ہے۔ [۲] قرن جی

محمود کے نامور ساتھیوں نے ساتھ چھوڑ دیا

حمزہ سلطان اور مہدی سلطان کئی سال ہوئے شیبانی خاں کو چھوڑ کر چلے آئے تھے اور اپنے سب ازبکوں سمیت سلطان محمود مرزا کے نوکر ہو گئے تھے۔ اس لڑائی جھگڑے میں وہ اپنے ازبکوں سمیت قراتگین کی طرف بھاگ گئے۔ محمد دغلت اور سلطان دغلت بھی اپنے مغلوں سمیت جو حصار میں رہتے تھے قراتگین چلے گئے۔

حمزہ سلطان کی فتح

سلطان حسین مرزا نے حمزہ سلطان اور مغلوں کا سر توڑنے کے لئے جو قراتگین میں تھے۔ ابراہیم ترخان، یعقوب اور ایوب کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ بھیجا۔

قراتگین پر دونوں لشکروں میں لڑائی ہوئی۔ حمزہ سلطان وغیرہ نے سلطان حسین مرزا کی فوج کو شکست دی اور اس کے اکثر امراء کو قید کر کے وہاں سے چل دیئے [1]

میرے ازبکا ورمغل ملازمین میں اضافہ

اسی نتیجہ کے سبب حمزہ سلطان، مہدی سلطان، جماق سلطان،[2] (حمزہ سلطان کا بیٹا) محمد دغلت (جو بعد میں محمد حصاری مشہور ہوا) اور سلطان حسین دغلت نے رمضان[3] میں مجھے خبر بھیجی اور اس کے بعد اپنے ازبک متعلقین کے ساتھ اور اُن مغلوں سمیت جو سلطان محمود مرزا کے ملازمین میں سے حصار میں رہتے تھے میرے پاس اندجان آ گئے۔

ازبک سلاطین کی خاطر داری

تیموریہ سلاطین کے دستور کے مطابق میں ان دنوں توشک پر بیٹھتا تھا۔ حمزہ سلطان، مہدی سلطان، اور جماق سلطان آئے تو میں ان کی تعظیم کے لئے اٹھا۔ توشک سے نیچے اُترا۔ ان سے بغل گیر ہوا۔ اور انھیں تکیہ کے پاس سیدھے ہاتھ کی طرف بٹھایا۔ وہ مغل بھی جن کا سردار محمد حصاری تھا میرے ملازم ہو گئے۔

---

[1] اکثر امراء کو گھوڑوں سے اُتار کر قید کیا لیکن پھر جانے کی اجازت دے دی "مسٹر جان لیڈی کے ترجمے میں یہ فقرہ بھی شامل ہے [2] موٹی لاٹھی یا لوہے کے اس گرز کو جس کے چھ پہلو ہوں جماق کہتے ہیں۔ ترکوں میں جماق نام بھی رکھا جاتا ہے

[3] بعض نسخوں میں جماق سلطان کی بجائے مماق سلطان لکھا ہے۔

[4] مئی یا جون ۱۴۹۶ء

نقب زنی کی وارداتیں | سلطان حسین مرزا نے حصار کا محاصرہ کر لیا۔ وہ دن رات نقب لگانے۔ قلعہ لینے۔ گولے برسانے اور توپیں جمانے میں لگا رہتا۔ اور دم بھر چین سے نہ بیٹھتا۔

اس نے پانچ چار جگہ نقب لگائی۔ شہر کے دروازے کی طرف جو نقب لگائی وہ بہت آگے بڑھ گئی۔ شہر والوں نے بھی نقب لگا کر اس نقب کا حال معلوم کر لیا۔ اہلِ شہر نے اندر سے دشمنوں کی طرف دھواں چھوڑنا شروع کیا۔ محاصرہ کرنے والوں نے فوراً نقب کا منہ بند کر دیا۔ اس لئے دھواں اندر ہی کی طرف پلٹ گیا اور قلعہ میں جا گھسا۔ قلعے والے مُردوں سے بدتر ہو گئے اور بھاگ کر باہر نکل آئے۔ آخر تھیلیوں میں پانی لا لا کر نقب پر ڈالا اور دشمنوں کو نقب سے ہٹایا۔

ایک دفعہ چند لوگ یکایک باہر نکلے اور نقب کے منہ پر جو دشمن تھے ان پر حملہ کر دیا اور سب کو مار بھگایا۔

سلطان حسین کی بزدلی | ایک دفعہ شمال کی طرف جہاں خود مرزا کی قیام گاہ تھی توپ[1] کے سنگین گولے مار کر ایک برج توڑ پھوڑ دیا اور عشاء کے وقت وہ برج اڑ گیا۔ چند سپاہیوں نے جرأت کی اور لڑائی کی اجازت مانگی۔ لیکن مرزا نے کہا رات کا وقت ہے اور اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

صبح تک شہر والوں نے اس برج کو ٹھیک کر لیا۔

یہ لوگ صبح بھی مقابلہ نہ کر سکے۔

دو ڈھائی مہینے کے اس عرصہ میں دھمکاتے، ڈرانے، نقب لگانے اور گولے مارنے کے سوا کوئی لڑائی جم کر نہیں لڑی گئی۔

خسرو شاہ کا حملہ | بدیع الزماں مرزا جب اس فوج کے ساتھ جو سلطان حسین مرزا نے خسرو شاہ کی طرف بھیجی تھی قندز سے نو دس میل فاصلے پر جا اُترا۔ تو خسرو شاہ اپنے ساتھیوں کو ٹھیک

---

[1] شاید اس زمانے میں پتھر کے گولے ہوتے تھے۔

کرکے قندز سے باہر نکلا۔ اور رات گذرنے کے بعد اس نے بدیع الزماں مرزا کی فوج پر حملہ بول دیا۔

بدیع الزماں کی بزدلی یہ لوگ زبردست مرزا، سردار اور امیر تھے اور ان کے ساتھ خسرو شاہ کی فوج سے دُگنی نہیں تو ڈیڑھ گنی فوج ضرور تھی۔ پھر بھی یہ صرف اپنا بچاؤ کرتے رہے اور خندق سے باہر تک نہ نکلے۔

خسرو شاہ کے کارہائے نمایاں خسرو شاہ کے پاس اس وقت اچھے بُرے اور چھوٹے بڑے تقریباً چار پانچ ہزار آدمی ہوں گے خسرو شاہ نے اس فانی دنیا اور بے وفا نوکروں کے لئے اتنی برائی اور بدنامی سمیٹی اور اتنا ظلم و ستم توڑا اور اتنے بڑے ملک پر قابض ہو گیا اور اس قدر آدمیوں کو جمع کرلیا جن کی تعداد آخر میں بیس تیس ہزار تک پہنچ گئی۔ اور جس کا علاقہ اپنے بادشاہ اور مرزاؤں سے بڑھ گیا) عمر بھر میں کوئی کام کیا تو یہی کیا اسی وجہ سے خسرو شاہ اور اس کے ملازمین، سردار اور بہادر بنے۔ اور خندق میں چھپے رہنے والے ڈرپوک مشہور ہو گئے۔

ولی بدیع الزماں کے تعاقب میں بدیع الزماں مرزا وہاں سے اُلٹا پھرا۔ اور تھوڑی دور جاکے طالقان[۱] کے مقام پر بڑے باغ میں جا اُترا۔ خسرو شاہ قندز میں رہا۔ اور اپنے چھوٹے بھائی ولی کو بہت سی فوج کے ساتھ جس کے پاس نہایت عمدہ ساز و سامان تھا۔ اشکمش[۲]، تلول اور پہاڑوں کے دامن کی طرف بھیج دیا۔ تاکہ دشمن کو باہر سے دبائے اور تنگ کرے۔

محب علی کی دلیری ایک دفعہ محب علی قورچی[۳] نے چند ہتھیار بند اور جنگجو سپاہیوں کو ساتھ لے کر دریائے ختلان کے کنارے دشمن سے مقابلہ کیا اور انھیں ہرا دیا۔ اور چند لوگوں کو گھوڑوں سے اُتار کر اُن کے سر کاٹ لئے۔

۱؎ طالقان غ سے لکھا ہے۔ لیکن یہ اگر طالقان ہو تو یہ تالکان کا بدل ہے۔ اور مرو اور بلخ کے بیچ میں ایک شہر کا نام ہے اور اگر طالیخان یا طلیخان ہے تو یہ قندز سے تقریباً ساٹھ میل دریا سے اوپر کی طرف ہے۔

۲؎ اشکمش قندز سے اوپر کی جانب دریائے اکسیرا کے قریب ہے۔

۳؎ ہتھیار بند سپاہی۔ ہتھیار ساز۔ لوہار اور دربار شاہی کے مہتمم کو قورچی کہتے ہیں۔

بم علی اور قلی بابا گرفتاری | اس واقعہ کو دیکھ کر سید بم علی دربان، قلی بیگ (اس کا چھوٹا بھائی) بہلول اور ایوب بھی اپنے چند پرجوش سپاہیوں کو لے کر نکلے۔ اور عنبر کوہ کے دامن میں پہنچے جو خواجہ چنگال کے قریب ہے۔ اور خراسان جاتے ہوئے لشکر پر انھوں نے حملہ کیا لیکن سید بم علی اور قلی بابا اور ان کے ساتھی پکڑے گئے۔

صلح کی شرط شادی خانہ آبادی | سلطان حسین مرزا کو یہ خبر ملی۔ اس کے علاوہ حصار میں موسم بہار کی بارش کے سبب لشکر نے بہت تکلیف سہی۔ ان وجوہ سے صلح کی تدبیریں ہونے لگیں۔ اندر سے محمود برلاس آیا۔ باہر سے حاجی پیر بکاول پہنچا۔ عمائد اور گویئے وغیرہ جو مل سکے وہ جمع ہوئے اور سلطان محمود مرزا کی بڑی بیٹی سے جو خانزادہ بیگم کے بطن سے تھی حیدر مرزا کی شادی کر دی۔ وہ پائندہ سلطان بیگم کے پیٹ سے تھا۔ اور سلطان ابوسعید مرزا کا نواسہ تھا۔ سلطان حسین مرزا نے حصار کا محاصرہ اٹھالیا۔ اور وہ قندز چلا گیا۔

سلطان حسین مرزا اور خسروشاہ کی صلح | قندز پہنچنے کے بعد تھوڑی سی سیاست برتی۔ اور محاصرہ کی تجویزیں ہونے لگیں۔ آخر بدیع الزماں مرزا نے بیچ میں پڑ کر صلح کرادی دونوں طرف کے جو لوگ پکڑے گئے تھے وہ چھوڑ دیئے اور محاصرہ کرنے والے واپس چلے گئے۔

خسروشاہ کی ترقی کے اسباب | خسروشاہ جو اس قدر بڑھا چڑھا اور اپنی حد سے آگے قدم رکھنے لگا اس کی وجہ یہی تھی کہ سلطان حسین مرزا نے دو دفعہ چڑھائی کی اور اسے چھوڑ دیا۔

سلطان حسین نے بیٹوں کو شہر بانٹے | سلطان حسین مرزا بلخ پہنچا تو اس خیال سے کہ ماوراءالنہر[1] کی نگرانی بہتر طریقہ پر ہو سکے بدیع الزماں مرزا کو بلخ اور مظفر حسین مرزا کو استرآباد دیا اور دونوں کو حکم جاری ہوا کہ صبح دربار میں بلخ اور استرآباد کے عطا ہونے پر آداب بجالائیں۔ وہ آداب بجالائے۔

بعد کے فسادات کی وجہ | بدیع الزماں مرزا اس انتظام سے ڈرا۔ مدت تک جو فسادات اور بغاوتیں ہوئیں وہ اسی وجہ سے ہوئیں۔

---

[1] ماوراءالنہر فریدوں نے اپنے بیٹے کو دے دیا تھا۔ اس کے نام کی مناسبت سے اس کو توران بھی کہتے ہیں۔

بائسنغر مرزا اور سمرقندیوں میں بگاڑ | سمرقند کے اندر اسی رمضان[1] میں ترخانیوں نے فساد برپا کر دیا۔ اس کا مفصل حال یہ ہے کہ بائسنغر مرزا حصار والی فوج اور وہاں کے امراء سے جتنا میل جول رکھتا تھا۔ سمرقند والوں پر اتنا مہربان نہ تھا۔ شیخ عبداللہ وزیر اور بڑا سردار تھا اس کے بیٹے مرزا کے اتنے منہ لگے تھے کہ ان پر عاشق و معشوق کی تہمت لگائی جاتی تھی۔ ترخانی اور سمرقندی اُمراء جلتے تھے۔

بائسنغر مرزا کو سزائے موت کا حکم | آخر کار درویش محمد ترخان، بخارا سے آیا۔ اس نے سلطان علی مرزا کو قرشی[2] سے لاکر بادشاہ بنایا۔ پھر وہ نئے باغ میں آگیا۔ وہیں بائسنغر مرزا بھی تھا۔ اس کو کسی فریب سے گرفتار کر لیا اور اس کو اس کے آدمیوں سے الگ کر کے ارک میں لے گئے

قید خانے سے فرار | دونوں مرزا ایک ہی جگہ رکھے گئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ ظہر کے وقت مرزا کو سبز محل میں بھیج دیا جائے۔ بائسنغر مرزا رفع حاجت کے بہانے اس مکان میں گیا۔ جو باغ والی بارہ دری کے شمال و مشرق کے درمیان ہے۔ دروازے پر ترخانیوں کے سپاہی تعینات تھے۔ محمد قلی قوچین اور حسن شربت جی مرزا کے ساتھ اندر چلے گئے۔ اتفاق سے اس مکان کے پیچھے ایک دروازہ تھا اس میں اینٹوں کا تیغا لگا ہوا تھا۔ اس کو توڑ کر باہر جا سکتے تھے مرزا نے فوراً اس تیغے کو توڑ ڈالا۔ اور باہر نکل کر ارک سے عادقر[3] کی طرف چلا۔ فصیل سے اُدھر موری کے اندر سے نکلا اور دوہری فصیل سے کودا۔ اور خواجہ کاہ خواجہ کے گھر میں خواجہ کفشیر کے پاس جا پہنچا۔

مضبوط پناہ گاہ | دروازے پر پہرہ دینے والے تھوڑی دیر بعد اندر پہنچے۔ تو دیکھا کہ مرزا فرار ہو گیا ہے۔ دوسرے دن ترخانیوں کا مجمع خواجہ کاہ خواجہ کے مکان پر گیا۔ اور بھاگے ہوئے قیدی کو مانگا۔ خواجہ نے انکار کر دیا۔ ترخانی زبردستی نہ چھین سکے۔ خواجہ کمزور نہ تھا۔

نئے بادشاہ کی گرفتاری | ایک دو دن بعد اُمراء میں سے خواجہ ابوالمکارم اور حاجی بیگ وغیرہ اور

---

[1] مئی یا جون ۱۴۹۶ء [2] قرشی، کیش کے جنوب کی طرف ہے [3] عادقر

بہت سے سپاہی اور شہر کے باشندے جمع ہو کر خواجہ کے گھر گئے اور مرزا کو لائے۔ اور انھوں نے سلطان علی مرزا کو ترخانیوں سمیت محل میں گھیر لیا وہ ایک دن بھی محل کو نہ بچا سکے۔

محمد ترخان چور دروازے سے نکل کر بخارا بھاگا۔ سلطان علی مرزا اور درویش محمد ترخان گرفتار ہو گئے۔

درویش محمد کا قتل | بائیسنغر مرزا احمد حاجی بیگ کے گھر میں تھا۔ وہاں درویش محمد ترخان کو پکڑ لائے اس سے دو ایک سوال کئے۔ مگر وہ تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے کام ایسے نہ تھے کہ وہ جواب دے سکتا۔ مرزا نے اس کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ وہ کھر کھرا کر ستون سے چمٹ گیا[1]۔ وہ ستون کو چمٹنے سے کیا چھوڑ دیتے۔ فوراً گردن اڑا دی۔

آنکھیں پھوڑنے کی سزا | سلطان علی مرزا کے لئے حکم ہوا کہ سبز محل میں لے جا کر آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھیر دی جائیں۔

امیر تیمور نے جو شاندار عمارتیں بنائیں سبز محل اُن ہی میں سے ایک ہے۔ یہ محل سمرقند میں واقع ہے۔ اس عمارت میں عجیب خاصیت ہے۔ امیر تیمور کی اولاد میں سے جو اُبھرا اور تخت پر بیٹھا۔ وہ وہیں تخت نشین ہوا۔ اور سلطنت کا دعویٰ کرنے کے جرم میں جو مارا گیا۔ اسی مکان میں مارا گیا۔ اسی لئے یہ کنایہ مشہور ہے کہ فلاں بادشاہ کو سبز محل میں لے گئے یعنی قتل کر دیا۔

سلطان علی مرزا کو سبز محل میں لے گئے اور اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دی گئیں

سلطان علی بخارا بھاگا | جراح نے نہ جانے جان کر ایسا کیا یا اس کا اناڑی پن تھا کہ سلطان علی مرزا کی آنکھوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ مرزا اس وقت حقیقت پی گیا اور خواجہ یحییٰ کے گھر چلا گیا۔ اور دو تین دن بعد فرار ہو کر ترخانیوں کے پاس بخارا جا پہنچا۔

---

[1] ترکوں میں ستون اور خیمے کی لکڑی کو مقدس مانتے تھے اسی لئے مجرم اس سے لپٹ کر پناہ مانگتا تھا۔

ان واقعات سے خواجہ عبید اللہ کی اولاد میں دشمنی ہو گئی۔ ان کا بڑا بڑے بھائی کا طرف دار ہو گیا اور چھوٹے، نے چھوٹے بھائی کا ساتھ دیا۔

خواجہ یحییٰ بھی کچھ دن بعد بخارا چلا گیا۔

بائسنغر مرزا کی شکست بائسنغر مرزا نے لشکر جمع کر کے علی مرزا کے لئے بخارا پر چڑھائی کی۔ وہ جیسے ہی بخارا کے قریب پہنچا۔ سلطان علی مرزا اور ترخان امرا ڈٹ کر سامنے آ گئے۔ ذرا سی دیر کی لڑائی کے بعد سلطان علی مرزا کو فتح ہوئی۔ اور بائسنغر مرزا ہار گیا۔

احمد حاجی بیگ کا قتل احمد حاجی بیگ، اور اچھے اچھے سردار پکڑے گئے۔ ان میں سے اکثر کو قتل کر ڈالا۔ درویش محمد ترخان کے عزیزوں اور ملازموں نے اس کے قتل کی تہمت میں احمد حاجی بیگ کو بے عزتی سے قتل کیا۔ سلطان علی مرزا اُسی وقت بائسنغر مرزا کے تعاقب میں سمرقند روانہ ہوا۔

سمرقند پر میرا پہلا حملہ عید[1] کے چاند مجھے یہ خبر ملی۔ میں بھی اسی مہینے اپنے لشکر کے ساتھ سمرقند لینے چلا۔ سلطان حسین مرزا حصار اور قندز سے واپس جا چکا تھا اس لئے سلطان مسعود مرزا اور خسرو شاہ مطمئن تھے، سلطان مسعود مرزا بھی سمرقند کو فتح کرنے کے خیال سے شہر سبز میں آ گیا۔ خسرو شاہ نے اپنے چھوٹے بھائی ولی کو مرزا کے ساتھ بھیجا۔

سمرقند تین چار مہینے تک تین چار طرف سے گھرا رہا۔

سلطان علی سے میری ملاقات سلطان علی مرزا کے پاس سے خواجہ یحییٰ نے آ کر مجھ سے میل ملاپ کی باتیں کیں۔ اور ملاقات کی تجویز طے ہوئی۔ سمرقند سے دو تین کوس نیچے کی طرف ہٹ کر مقام سُغد[2] کی طرف سے میں اپنے لشکر کے ساتھ چلا اور سلطان علی مرزا اپنے لشکر سمیت آیا۔

وہاں سے چار پانچ آدمی علی مرزا نے ساتھ لئے ادھر سے میں بھی چار پانچ ساتھیوں کو لے کر پہنچا دریائے کوہک کے اندر ہم دونوں نے گھوڑوں پر بیٹھے بیٹھے ملاقات کی اور باہم خیریت دریافت کی۔ اس کے بعد وہ اپنی طرف چلا گیا میں اپنے ہاں چلا آیا۔

---

[1] ۱۳ رجون ۱۵۰۰ء [2] سُغد، سمرقند کے قریب ایک شہر ہے۔

عروج وزوال کے الٰہی قوانین

از

(جناب مولوی محمد تقی صاحب امینی)

(۶)

۲۔ عمل صالح

عروج وبقار کا دوسرا اصول "عملِ صالح" ہے قرآنِ حکیم میں جس حقیقت کو عملِ صالح سے تعبیر کیا گیا ہے اس سے چند ظاہری مراسم واعمال اور چند رواجی نیکیاں مراد نہیں ہیں بلکہ اس کا مفہوم اخلاقیت اور مادیت کے ہر شعبہ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے یعنی ایمانیات کو بروئے کار لانے کے لئے جن جن تدبیروں اور صلاحیتوں کی طرف داعیٔ انقلاب نے توجہ دلائی ہے اور ارتقار کے نتیجہ میں حالات وزمانہ کے تقاضے کی مناسبت سے قومی زندگی کے عروج کے لئے جن جن چیزوں کی واقعی ضرورت ہے وہ سب عدل واعتدال کے ساتھ اور مقررہ حدود وقیود کے مطابق اس کی فہرست میں داخل ہیں خواہ ان کا تعلق اخلاقیت سے ہو یا مادیت سے جسمانی طاقت سے ہو یا روحانی طاقت سے اس کی تفصیل یہ ہے۔

عمل صالح کی بنیاد روح کی تہذیب اور نورِ ایمانی پر ہے

عمل کی دو قسمیں ہیں (۱) وہ جس کا تعلق انسان کی اندرونی زندگی سے ہے اس سے انسانی سیرت کی تشکیل ہوتی ہے[عہ]۔

عہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے عمل کے اس حصہ کو نہایت بلیغ پیرایہ میں یوں ادا کیا ہے۔
کن مع الحق بلا خلق ومع الخلق بلا نفس حق کے ساتھ اس طرح کا تعلق ہو کہ اس میں مخلوق کا درمیان نہ ہو اور مخلوق کے ساتھ اس طرح کا تعلق ہو کہ اس میں نفس کا بیچ نہ ہو (اخلاق وفلسفۂ اخلاق)
یعنی سیرت کی تشکیل اتنی بلند پیمانہ پر کی جائے کہ تعلق باللہ کے مظاہرہ میں مخلوق کسی حیثیت سے (اور کسی درجہ میں) رکاوٹ نہ بن سکے اسی طرح تعلق بالخلق کے مظاہرہ میں اپنی ذات حائل نہ بننے پائے ۱۲

۲۔ وہ جس کا تعلق انسان کی خارجی زندگی سے ہے اس کے ذریعہ عالم میں تصرف حاصل ہوتا ہے اس طرح عمل کا تعلق "انفس و آفاق" دونوں سے ہے اور فلاح و کامیابی ان دونوں پر موقوف ہے اسی بنا پر قرآنِ حکیم نے دونوں پر یکساں زور دیا ہے لیکن جو تفصیلات بیان کی ہیں اس سے پہلے کی زیادہ اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قومی اور جماعتی زندگی میں "صالح انقلاب" برپا کرنے کے لئے پہلے کی حیثیت "بنیاد" کی ہے

یہ واقعہ ہے کہ جب تک اندرونی تبدیلی کے ذریعہ بلند نصب العین کے ماتحت اعلیٰ پیمانہ پر سیرت کی تشکیل نہ ہوگی اس وقت تک نہ "صالح معاشرہ" وجود میں آسکتا ہے اور نہ ہی عالمی تصرفات مفید عام اور دور رس نتائج کے حامل بن سکتے ہیں بلکہ بسا اوقات تباہی و بربادی کا سبب بنتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ بلند نصب العین کیا ہے جس پر عملِ صالح کی بُنیاد رکھ کر سیرت کی تشکیل کی جائے؟ ظاہر ہے کہ مخلوقات میں کوئی شے نصب العین بننے کے قابل نہیں کیوں کہ ساری چیزیں انسان سے فروتر اور کمتر درجہ کی ہیں، قومیت اور وطنیت بھی نہیں بن سکتی کیوں کہ ان کی حدبندیاں اور جانب داریاں انسان کی پرواز میں رخنہ ڈالتی ہیں، اس کے لئے ایسی ہستی کی ضرورت ہے جو سب سے بلند اور ماوراء الوریٰ ہو اور جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر مقامِ انسانیت کی غیر محدود ترقیوں کی شاہراہیں کھولنے والی ہو اور انسان کو زیادہ سے زیادہ بلندیوں تک کھینچنے والی ہو، یہ ہستی واجب الوجود کی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں تقریباً ہر مقام پر عمل سے پہلے ایمان باللہ کا ذکر کیا گیا ہے جس سے ایک طرف تو اعلیٰ مقصد اور بلند نصب العین کا تعین ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کے ذریعہ روح کی تہذیب اور نیت کی پاکیزگی ہوتی ہے اس لحاظ سے عملِ صالح کی اصل بُنیاد ان اعمال پر ہے جن کی بدولت انسان اپنے باطنی محرکات پر قابو پاتا ہے اور جمود و تعطل کی راہوں سے ہٹ کر تزکیۂ نفس کے ذریعہ اپنی سیرت کی تشکیل کرتا ہے اور

ان اعمال پر ہے جن کے ذریعہ وہ بلندی اور عالی حوصلگی پیدا ہوتی ہے جو مقامِ انسانیت کے لیے درکار ہے۔ اسی بنا پر حضرت معاذؓ سے منقول ہے

العمل الصالح الذی فیہ اربعۃ اشیاء العلم والنیۃ والصبر والاخلاص[1]

عمل صالح میں (بنیادی حیثیت سے) چار چیزیں ہیں علم، نیت، صبر اور اخلاص

اور قرآنِ حکیم میں ہے

قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا ۹۱/۱۰

وہ شخص کامیاب رہا جس نے اپنے کو برائیوں سے پاک و صاف کیا اور وہ ناکام رہا جس کو برائیوں نے دبا لیا۔

لفظ صالح میں موقع کی مناسبت سے صلاحیت کا مفہوم شامل ہے لغوی تحقیق یہ ہے۔

صلح ضد افسد الصالح ضد الفاسد ۔ القائم بما علیہ من الحقوق والواجبات ویقال ھو صالح لکذا ای فیہ اھلیۃ للقیام بہ والصلاحیۃ حالۃ یکون بھا الشیٔ صالحاً "صلح" (ماضی) افسد کی ضد ہے اور صالح (اسم فاعل) فاسد کی ضد ہے جو حقوق و فرائض ٹھیک ٹھیک قائم کرے وہ صالح ہے چنانچہ عربی کا محاورہ ہے "صالح لکذا" یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی شخص میں کسی کام کے قائم (انتظام) کرنے کی اہلیت ہو اور صلاحیت اس حالت کو کہتے ہیں جس کے پیدا ہونے کے بعد شی "صالح" بنتی ہے

قاموس ۔ صراح ۔ المنجد ۔ لسان العرب وغیرہ لغات کی تشریح سے تقریباً اسی کی تائید ہوتی ہے، امام راغب کہتے ہیں

"صلاح فساد کی ضد ہے یہ دونوں اکثر استعمال میں افعال کے ساتھ مخصوص ہیں قرآن حکیم میں صلاح کہیں تو فساد کے مقابل لایا گیا ہے اور کہیں سیئۃ کے، ارشاد ہے خلطوا عملا صالحا وآخر سیئا

---

[1] تفسیر مظہری ج ۱ ص ۳۸

(ملایا انھوں نے ایک نیک کام اور دوسرا بد) اور "لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا (مت خرابی ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد) اور "الذین آمنوا وعملوا الصلحت" تو بہت مقامات پر ہے۔" [1] قاضی بیضاوی کہتے ہیں "والفساد خروج الشئ من الاعتدال والصلاح ضدہ وکلاھما یعمان کل ضار ونافع" [2] فساد کی حقیقت کسی شی کا حد اعتدال سے نکل جانا اور صلاح اس کی ضد ہے یہ دونوں ہر نفع بخش اور نقصان دہ چیزوں کو عام ہیں یعنی صلاح ہر نفع بخش چیز کو شامل ہے اور فساد ہر نقصان دہ چیز کو۔"

کلام عرب کے چند محاورے یہ ہیں

(۱) صلحت حال فلان ای زال عنہ الفساد (اس سے فساد کے جراثیم زائل ہو گئے)

۲۔ ھذا یصلح لک صلاحا ای یوافقک (یہ تیری موافقت کرتا ہے)

۳۔ اصلح غیث ما افسد البرد (جس کو اولے نے خراب کر دیا تھا اس کو بارش نے دوبارہ درست کر دیا) یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص دوسرے کی بگاڑی ہوئی چیز کو درست کرتا ہے۔

۴۔ ما لا یصلح ترکہ اصلح (جو چیز درست اور موافق نہ ہو اس کا چھوڑ دینا زیادہ درست اور موافق ہے)

۵۔ اصلح نفسک یصلح لک الناس (اپنی اصلاح کر لو لوگ تمہارے موافق ہو جائیں گے)

۶۔ لہ حظ صالح من الادب ای کثیر وافر (ادب سے اس کو بہت کافی حصہ ملا ہے)

۷۔ اتتنی صالحۃ من فلان ای نعمۃ وافرۃ او حسنۃ عظیمۃ (فلاں شخص کی طرف سے ایک بڑی نعمت یا بڑی نیکی حاصل ہوئی)

یہ اور ان کو چھوڑ کر جہاں صالح اور صالحہ کا لفظ بطور کنایہ استعمال ہونے کی بنا پر اس کے اصلی معنی مقصود نہیں ہیں بقیہ اوپر کی تمام تصریحات سے یہ بات ثابت ہوتی

---

[1] لغات القرآن ج ۴ [2] بیضاوی ص ۲۹

ہے کہ کلام عرب میں صالح کا لفظ جس موقع پر جس کام کے سلسلہ میں بولا جاتا ہے وہاں اس کی مناسبت سے صلاحیت اور موافقت مراد ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم میں اس کا ثبوت ملتا ہے

قرآن حکیم کی درج ذیل آیت سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

لئن اٰتیتنا صالحا	"اے اللہ اگر آپ ہمیں ایک تندرست بچہ عطا
لنکونن من الشکرین فلما اٰتھما	فرمائیں تو ہم دونوں آپ کے شکر گذار ہوں گے پھر
صالحا جعلا لہ شرکاء فیما اٰتھما	جب اللہ نے انھیں ایک تندرست بچہ دے دیا
۱۸۹/۷	تو وہ اس میں دوسری ہستیوں کو شریک کرنے لگے

اس آیت میں اللہ رب العزت نے والدین کے جذبات کا ذکر کیا ہے کہ بچہ پیدا ہونے سے پہلے بالعموم ان کی یہ دعا اور تمنا ہوتی ہے کہ میرا بچہ صحیح و سالم اور تندرست و خوبصورت ہو، اس کے اعضاء اور جوڑ بند اور صورت شکل وغیرہ سب درست ہوں۔ والدین کے اس مفہوم کو "صالح" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ یہاں صالح کا وہی مطلب ہو سکتا ہے جو والدین کے جذبات اور بچہ کی مناسبت سے بن سکتا ہے چنانچہ مفسرین نے اس کا ترجمہ سویٌّ قد صلح بدنہ اور ولدا ذکراً وغیرہ الفاظ سے کیا ہے جس سے صلاحیتِ ظاہری یعنی بدن اور جسم کی صحت مراد لی ہے[۱]۔

ولا تفسدوا فی الارض بعد	اور زمین کی درستگی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ
اصلاحھا ۵۶/۷	

یہاں دعوتِ حق کے ظہور کو اصلاح سے تعبیر کیا گیا ہے کیوں کہ وہ لوگوں کے قلوب اور ان کے اعمال و افعال میں صلاحیت پیدا کرتی ہے۔

حدیث میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے

حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے

ایک موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تھکے ماندے اور بھوکے پیاسے

---

[۱] احکام القرآن ج ۳ ص ۶۴ جلالین ص۱۴۲ مدارک ص۶۸

اونٹ کو دیکھ کر فرمایا

اتقوا اللہ فی ھذہ البھائم المعجمۃ فارکبوھا صالحۃ واترکوھا صالحۃ[1]

ان گونگے جانوروں کے بارے میں تم اللہ سے ڈرو توی اور تندرست ہونے کی حالت میں ان پر سواری کیا کرو اور اسی حالت میں انھیں چھوڑ دیا کرو (ایسا نہ ہو کہ جب وہ تھک تھکا کر سواری و باربرداری کے قابل نہ رہ جائیں اس وقت انھیں چھوڑو)

ظاہر ہے کہ یہاں جسمانی صحت کا ذکر ہے اور اس کے لئے صالحہ کا لفظ لایا گیا ہے اسی طرح ایک مشہور حدیث میں آپ نے فرمایا۔

ان فی الجسد لمضغۃ اذا صلح صلح الجسد کلہ واذا فسد فسد الجسد کلہ الا وھی القلب (الحدیث)

انسان کے بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تو پورا بدن درست رہتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو پورا بدن خراب ہو جاتا ہے وہ لوتھڑا انسان کا دل (باطنی محرکات کا سرچشمہ) ہے

اس حدیث میں قلبی و روحانی اور پھر اعمال و افعال کی صلاحیت بیان ہوئی ہے اوپر کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ "صلح" میں صلاحیت کا مفہوم بھی شامل ہے نیز یہ بات کہ صلاحیت کی دو قسمیں ہیں (۱) مادی و جسمانی (۲) اور معنوی و روحانی جہاں جیسا موقع ہوتا ہے اس کی مناسبت سے صلاحیت کے معنی لئے جاتے ہیں۔

قومی اور جماعتی زندگی میں "صلح" سے سیرت کی تشکیل اور عالمی تصرفات دونوں مراد ہیں

چوں کہ قومی اور جماعتی زندگی میں صلاحیت کے لئے مادیت اور روحانیت دونوں ضروری ہیں ان میں کسی ایک سے بے اعتنائی خودکشی کے مرادف ہے اس لئے قرآن حکیم میں جہاں کہیں قیام

[1] مشکوٰۃ

وقار اور خلافت و نیابت کے سلسلہ میں صالح کا ذکر کیا گیا ہے وہاں مذکورہ دونوں قسم کی صلاحیتیں مراد لی گئی ہیں۔

(۱) ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصٰلحون ۲۱/۱۰۵

اور ہم نے زبور میں ذکر و نصیحت کے بعد یہ بات لکھ دی تھی کہ زمین کی وراثت (حکومت) میرے صالح بندوں کے حصہ میں آئے گی ؎

۲۔ وعد اللہ الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا ۲۴/۵۵

تم میں سے جو لوگ ایمان لاتے اور عملِ صالح کئے اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ انھیں زمین میں خلیفہ (حاکم) بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو اسی بنا پر خلیفہ بنا چکا ہے اور جس دین کو اللہ نے ان کے لئے پسند کیا ہے اسے مضبوطی کے ساتھ جمادے گا اور خوف کے بدلے انھیں امن عطا فرمائے گا۔

اس موقع پر ایمان و عملِ صالح کے نتیجہ میں تین وعدہ مذکور ہیں۔

۱۔ صالح بندوں کو حکومت ملے گی۔

۲۔ اپنے تصورات و آئینِ حیات پر آزادی اور قوت کے ساتھ عمل کر سکیں گے

۳۔ ہر طرف سے امن اور بے خوفی کا دور دورہ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کارخانہ کا مالک کسی ناقابل شخص کو کارخانہ کا انتظام نہیں سپرد کرتا ہے تو اس بات کی کیسے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ دنیا کے کارخانے کا انتظام کسی نااہل کے سپرد کیا جائے۔ جب زندگی کے ہر گوشہ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ انسان جس درجہ کی چیز کا طلبگار

؎ زبور کا جو مجموعہ آج موجود ہے اس میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے مثلاً زبور ۳۷ میں ہے بدعمل کاٹ ڈالے جائیں مگر وہ جو خداوند کی بات کی راہ دیکھتے ہیں زمین کو میراث میں لیں گے قریب ہے کہ شریر نابود ہو جائے تو اس کا ٹھکانا ڈھونڈے اور نہ پائے پر وہ جو حلیم ہیں زمین کے وارث ہوں گے اور ہر طرح کی راحتوں سے خوش دل ہوں گے (۳۷: ۹) از ترجمان القرآن جلد ثانی صفحہ ۴۹۲

ہے اس کی مناسبت سے صلاحیت پیدا کرنا ضروری ہے تو قوموں کے قیام و بقا اور حکومت و نیابت کے معاملہ میں یہ اصول کیوں کر فراموش ہوگا؟ اور اس کی تیاری کئے بغیر اہلیت و صلاحیت کی کیسے سند مل جائے گی؟

جدید دنیا نے اس صلاحیت کے لئے عالمی تصرفات پر زور دیا ہے اور تشکیلِ سیرت کے معاملہ میں ناقابلِ معافی حد تک غفلت سے کام لیا ہے اور قرآن حکیم نے دونوں پر یکساں زور دیا ہے لیکن سیرت کی تشکیل کو بنیاد قرار دیا ہے دونوں کے پیش کئے ہوئے نظریۂ بقاء اصلح میں یہی بنیادی فرق ہے۔

قرآن حکیم نے تشکیلِ سیرت پر تفصیلی بحث کی ہے اور عالمی تصرفات میں مرکز متعین کر کے عقل و تجربہ کی رہنمائی کو کافی قرار دیا ہے

چوں کہ تشکیلِ سیرت کا نظام چند ابدی حقائق اور ناقابلِ تغیر اخلاقی قوانین پر قائم ہے اس لئے اس پر ہر حیثیت سے تفصیلی بحث کی جا سکتی ہے اور قرآن حکیم نے کی ہے اور عالمی تصرفات انسان کی غیر محدود خواہشوں اور اس کی نئی نئی ضرورتوں کی بناء پر بے حد متنوع اور معاشرہ کے ارتقاء کے ساتھ بدلنے والے ہیں اس لئے اس بارے میں صرف مرکز متعین کرنے پر اکتفا کیا ہے اور حالات اور زمانہ کے تقاضنے کی مناسبت سے عقل و تجربہ کی رہنمائی کو کافی قرار دیا ہے چنانچہ بے شمار مقامات میں اس نے حقائقِ موجودات۔ محاسنِ کائنات مناظرِ قدرت مظاہرِ فطرت اور تسخیرِ کائنات کا ذکر کیا ہے اور بہت سی آیتوں میں زمین۔ پہاڑ دریا۔ نہریں۔ پھل۔ کھیت۔ سورج۔ چاند۔ ابر۔ بارش۔ آگ۔ مٹی۔ ہوا۔ پانی وغیرہ کے تذکرہ کے بعد اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ یہ ہست و بود کی ساری نیرنگیاں تمھارے (انسانوں) لئے ہیں تم ان سے فائدہ اٹھاؤ اور ان میں غور و فکر کر کے صناعِ فطرت کی گل کاریوں کا راز افشا کرو اور اس طرح دنیا کے باغ کو سجانے میں اپنے آپ کو ظاہری و باطنی ہر لحاظ سے مفید بناؤ۔

یہی وجہ ہے کہ تقریباً ہر مقام پر تعقلون۔ تفکرون۔ تدبرون۔ تذکرون۔

تنظرون وغیرہ الفاظ کے ذریعہ تامل وتفکر۔ تدبر وتذکر کی طرف رغبت دلائی گئی ہے جس سے معاشرہ کے ارتقاء کی راہیں کھلتی ہیں اور انسان اپنی عقل سے کام لے کر حقیقی معنوں میں نیابت الٰہی کا مستحق قرار پاتا ہے۔

قرآن حکیم نے عالمی تصرفات کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کو ایک مرکز کے ماتحت اور ضمیر ووجدان کے مدرسہ میں عقل کی تربیت کے ساتھ کرنے کا حکم دیا ہے کیوں کہ بے لگام عقل وہوس کی موشگافیاں اور سرمستیاں انسان کو بسا اوقات انسانیت کی بلندی سے اُتار کر حیوانیت کی پستی میں دھکیل دیتی ہیں اور پھر یہی ساری چیزیں تمدن کے لئے مفید ہونے کے بجائے اس کی دشمن ثابت ہوتی ہیں۔

دنیا کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں سب سے اہم اور مشکل کام انسانی فکر وعمل کے صحیح حدود مقرر کرنا رہا ہے اس کے بغیر نہ زندگی میں توازن قائم ہو سکا ہے اور نہ عقل وہوس کے غلو سے اجتناب کیا جا سکا ہے اس بناء پر قرآن حکیم نے پہلے مرکز متعین کر کے قلب وروح کو صاف اور بیدار کیا اور پھر عقل کو میدان میں اُترنے کا حکم دیا۔

جیسا کہ ارشاد ہے

قُلْ انما اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للہ مثنیٰ وفرادیٰ ثم تتفکروا ۳۴/۴۶

آپ کہہ دیجئے کہ میں تمھیں ایک بات سمجھاتا ہوں وہ یہ کہ تم اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ ایک ایک دو دو اور پھر تفکر وتدبر کرو

عالمی تصرفات کے سلسلہ کی چند آیتیں

عالمی تصرفات کے سلسلہ کی چند آیتیں یہ ہیں

قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبٰت من الرزق قل ھی للذین امنوا

اے پیغمبر آپ ان لوگوں سے کہئے کہ اللہ کی زینتیں[ع] (جائز لذات) جو اس نے بندوں کے برتنے کے لئے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی اچھی چیزیں کس نے

ع ابو بکر جصاص کہتے ہیں وھی خالصۃ یوم القیمۃ لھم من شوائب التنقیص والتکدیر (احکام القرآن ج ۳ ص ۲۴)

فی الحیوۃ الدنیا خالصۃ یوم القیمۃ ۷/۳۲

حرام کی ہیں؟ آپ کہئے کہ یہ نعمتیں تو اسی لئے ہیں کہ اس دنیوی زندگی میں ایمان والوں کے کام آئیں اور قیامت کے دن یہ تکدر کی آمیزش سے خالص ہوں گی عہ

اس آیت میں جس قدر غور کیجئے حقیقت کھلتی جائے گی خدا پرستی کا تقاضا ترکِ دنیا نہیں ہے بلکہ دنیا اور اس کی نعمتوں کو ٹھیک ٹھیک کام میں لانا عین خدا پرستی ہے، کھانا پینا، زینت و آسائش کی چیزوں کا استعمال کرنا اس کا نام دنیا نہیں ہے بلکہ حق تلفی کرنا، حد سے گذر جانا، غرور میں مبتلا ہو جانا، غافل ہو جانا اور بے اعتدالانہ استعمال کرنا اس کا دنیا نام ہے اور یہی صورتیں مذموم ہیں، قرآن انھیں سے روکتا ہے۔ کسی عارف نے کیا خوب کہا ہے

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد اگر دارد برائے دوست دارد

اور

گر خدا خواہد زمن سلطانِ دیں خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

۲- ولقد مکنٰکم فی الارض وجعلنا لکم فیھا معائش قلیلا ما تشکرون

ہم نے تمہیں زمین میں قدرت و طاقت و اختیار کے ساتھ بسایا اور تمہارے لئے اس میں زندگی کے سامان مہیا کئے مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم شکر گذار ہو۔

عہ علامہ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں

آدمی کے لئے مباح اور جمیل لذتیں بھی ضروری ہیں کیوں کہ وہ ان امور پر مددگار ہوتی ہیں اسی بناء پر فقہا نے فرمایا ہے کہ عدالت زینت اور دین کی درستی کا نام ہے اور زینت سے مراد ان چیزوں کا استعمال ہے جو آدمی کو جمیل اور مزین بنا دیں اور گندگی و ناپاکی سے دور رکھ کر نظافت سے موصوف کریں حضرت ابو درداؓ صحابی فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے آپ کو باطل سے بچاتا ہوں تاکہ حق پر اس سے مدد لوں خدائے حکیم و برتر نے لذات کو شہوات کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ خلق کی فلاح و بہبود یا یہ تکمیل کو پہنچ جائے .... اور شہوات میں سے وہ چیزیں حرام کر دیں جو ہمارے لئے ضرر رساں تھیں اور اس شخص کی مذمت فرمائی جو ہوائے نفس کا غلام بن جائے۔ (سیاست الٰہیہ ص۱۰۸)

۳- فَاِذَا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ $\frac{۲۸}{۱۱}$ — جب نماز پوری ہو جائے تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کی دی ہوئی روزی تلاش کرو۔

۴- وجعلنا لکم فیہا معائش ومن لستم لہ برازقین $\frac{۱۵}{۱۹}$ — اور ہم نے تمہارے لئے معیشت کا سروسامان مہیا کر دیا اور ان مخلوقات کے لئے بھی کر دیا جن کے لئے تم روزی مہیا کرنے والے نہیں ہو۔

۵- وان لیس للانسان الا ما سعیٰ $\frac{۵۳}{۱۴}$ — انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے

قرآنی زندگی کا صحیح تصور دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ہے

صحیح قرآنی زندگی کا نقشہ اس آیت میں کھینچا گیا ہے۔

۱- ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار اولٰئک لہم نصیب مما کسبوا $\frac{۲}{۲۵}$ — اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے ایسے ہی لوگ ہیں (جو اس طرح دعا مانگتے ہیں) جنہیں ان کے عمل کے مطابق دنیا اور آخرت کی فلاح میں حصہ ملتا ہے

جہاں تک قومی جدوجہد اور اس کے عمل کے نتیجہ کا تعلق ہے اس کے لئے قدرت کا ٹھہرایا ہوا یہ قانون مقرر ہے۔

۲- نوف الیہم اعمالہم $\frac{۱۱}{۱۵}$ — کوشش و عمل کے نتائج ہم پورے پورے دیتے ہیں

اس سے بحث نہیں کہ عمل کرنے والی قوم طالب دنیا ہے یا طالب دنیا و آخرت اگر کوئی قوم آخرت کی طرف سے غافل ہے اور صرف دنیوی زندگی کی خواہش مند ہے جب بھی ایسا نہ ہوگا کہ اس کی جدوجہد بے کار جائے بلکہ وہ جیسی کوشش کرے گی اس کے مطابق نتیجہ حاصل کرے گی البتہ ایسی صورت میں اس کے لئے آخرت میں کچھ نہ ملے گا۔

۳۔ اولئك الذين ليس لهم في الاخرة الا النار وحبط ما صنعوا فيها وباطل ما كانوا يعملون ۱۱/۱۶	یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت کی زندگی میں دوزخ کی آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا جو کچھ انھوں نے یہاں بنایا ہے سب اکارت جائے گا۔ اور جو کچھ کرتے رہے ہیں سب نابود ہونے والا ہے۔
۴۔ للذين احسنوا في هذه الدنيا حسنة ولدار الاخرة خير ولنعم دار المتقين ۱۴/۳۰	جن لوگوں نے اس دنیا میں اچھائی کی ان کے لئے اچھائی ہے اور یقیناً (ان کے لئے) آخرت کا گھر بھی خیر و برکت ہی کا گھر ہے۔
۵۔ فآتهم الله ثواب الدنيا وحسن ثواب الاخرة ۳/۱۴۴	اللہ نے انھیں دنیا کا ثواب دیا اور آخرت کا بہترین ثواب دیا۔

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، عزت و دولت، حکومت و سلطنت ہے جو ایمان و عملِ صالح کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔

۶۔ هو الذي خلق لكم ما في الارض جميعا ۲/۲۸	وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے واسطے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔

(باقی آئندہ)

اسلام کا فلسفۂ تاریخ

حدیث مجددین ملّت کی روشنی میں

از

جناب مرزا محمد یوسف صاحب

(پروفیسر اورنٹیل کالج رام پور)

(۲)

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے اسلام کے سیاسی نظام کی ہی اصلاح نہیں کی بلکہ انھوں نے مفکرین کی اس مایوسی کو بھی بدل دیا کہ اسلامی تعلیمات سے مستنبط سیاسی نظم صرف خلافتِ راشدہ تک ہی محدود تھا۔ اس کے برخلاف انھوں نے ثابت کر دیا کہ اسلام کا بنایا ہوا سیاسی نظام ہر زمانے کے لئے قابلِ نفاذ ہے۔ جہالت اور نفسانیت کی تاریکی بھی صبحِ امید کی کرنوں کی تابناکی کو نہیں روک سکتی۔ سیاسی نظم میں عملی طور پر اس کے بعد بھی فساد آتے رہے لیکن علمارِ اسلام کی سیاسی تفکیر کبھی مایوس نہیں ہوئی۔ اس غیر متوقع سیاسی اصلاح نے علمائے اسلام کے اندر ایک غیر معمولی رجائیت پیدا کر دی اور وہ کبھی بھی اصلاح سے مایوس نہ ہوئے۔ سیاسی نظم کے باب میں اسلام کی تعلیمات ہمیشہ ان کے لئے درخورِ اعتنار اور متمسک بہ رہیں۔ اس طرح قدرت نے اس مقدس فریضہ کو حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پورا کرایا اور اسلام کی سیاسی تفکیر کا رُخ غیر اسلامی جہت سے موڑ کر اس کو خالص اسلامی جہت میں منعطف کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ آنے والے علمار کو اسلام کی سیاسی تعلیمات کبھی ناقابلِ نفاذ معلوم نہ ہوئیں۔ حالات بدلتے رہے، صبر آزما موانع پیش آتے رہے

مگر مفکرینِ اسلام نے مملکتی نظم کے لئے غیر اسلامی مآخذ و منابع کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔
فقہ اکبر میں مملکتِ اسلامیہ کے سیاسی نظم کے لئے جو کچھ لکھا گیا متقدمین و متاخرین میں سے کسی نے
اس سے انحراف کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ تابعین و تبع تابعین نے مملکتی تنظیم کے
باب میں جو ارشاداتِ گرامی فرمائے بعد کے لوگوں نے انھیں چھوڑ کر کوئی نیا مذہب نہیں تراشا
آنے والے خلفاء نے عملاً جبر و ظلم کیا تو کیا لیکن اُن کا بیعت نامہ اور خطبۂ خلافت اسی روایتی
سیاسی نظم کے ماتحت مرتب ہوتا تھا۔ [دیکھئے ابن جریر خلفاء عباسیہ کا خلافت نامہ]
یہ ہے تحریری کارنامہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا لیکن اس سلسلہ میں تین ملحوظات کی طرف
توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ پہلے تو یہ کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی مجددیت تاریخی جبریت
(HISTORICALDETERMINISM) سے بے نیاز تھی سابق یا موجودہ معاشی و
معاشرتی عوامل کا نتیجہ نہ تھی بعض لوگوں نے اسے تاریخی عوامل کا نتیجہ سمجھ لیا۔ اُن کے نزدیک
یہ دواعی جنھوں نے عمر بن عبد العزیز کو عمر بن عبد العزیز بنا دیا تین ہیں چنانچہ یہ لوگ کہتے ہیں
"... اس لحاظ سے اُن کا ماحول اس کام سے دور کی مناسبت بھی نہ رکھتا تھا جو بعد میں
انھوں نے انجام دیا۔

(ا) لیکن اُن کی ماں حضرت عمرؓ کی پوتی تھیں۔

(ب) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو پچاس ہی برس ہوئے تھے جب وہ پیدا ہوئے
اُن کے زمانہ میں صحابہ اور تابعین بکثرت موجود تھے۔

(ج) ابتداء میں انھوں نے حدیث اور فقہ کی پوری تعلیم پائی تھی یہاں تک کہ محدثین کی
صفِ اول میں شمار ہوتے تھے اور فقہ میں اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے ..."

مگر دل، خاندان سیرتوں کے بنانے میں ممد و معاون ہو تو ہو ایک راسخ کردار میں قلب ماہیت نہیں کیا کرتا۔ محمد بن ابی بکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی سازش قتل میں شریک تھے
حالانکہ حضرت عثمانؓ حضرت ابو بکرؓ ہی کے کہنے سے ایمان لائے تھے۔ پھر خلفاء کی اولاد میں

اور بزرگ بھی تھے اگر نسل اور خاندان کا اصلاحِ سیرت یا تعمیرِ کردار میں کوئی اثر ہوتا ہے تو یہ کلیہ وہاں کیوں صادق نہیں آتا۔

(ب) عہدِ نبوت کا قرب اور صحابہ وتابعین کی صحبت کا اثر اگر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے قلبِ ماہیت کے لئے مؤثر ہوسکتا ہے تو یزید نے تاریخی عوامل کا کیا بگاڑا تھا کہ اسے اپنے فیضِ تاثیر سے محروم رکھا۔

(ج) رہی ابتدائی تعلیم اور تبحرِ علمی تو عبد الملک کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اگر وہ خلیفہ نہ ہوتا تو فقہائے حجاز میں ممتاز ہوتا۔ مگر ہائے تختِ خلافت تیری دل کشی، ادھر قاصد نے نویدِ خلافت سنائی ادھر عبد الملک نے مصحف کو الوداعی سلام کر کے بند کیا اور پھر اس تفقہ فی الدین کے باوجود کیسا جبار ثابت ہوا کہ حجاج اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے، یہ ہے تاریخی عوامل کی حیثیت اور اُن کی تاثیر کی حقیقت۔

انشار پردازی دوسری چیز ہے اور ایک معقول منطقی فکر شئی دیگر، یہ ان لوگوں کے ناپختہ افکار اور مغربیت زدہ حضرات کی تقلید میں سائنٹفک انداز پر علل و معلولات کے تاریخی جبر کی غیر شعوری پرستش کا نتیجہ ہے جو وہ اس تاریخی انخراق سے ناواقف رہے۔ حالانکہ اصل شئے وہی ہے جو انھوں نے اس سے قبل بیان فرمائی کہ "اُن کا ماحول اُس کام سے دور کی مناسبت بھی نہ رکھتا تھا جو بعد میں انھوں نے انجام دیا" اس تاریخی انخراق کی کوئی مادی و تاریخی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ عمر بن عبد العزیز جو عبد الملک بن سکتے تھے، ولید بن سکتے تھے، ہشام بن سکتے تھے لیکن تاریخ کا مؤکد فیصلہ ہے کہ وہ مجدد مائۃ اولیٰ نہیں بن سکتے تھے لیکن وہ بنے تو کیوں؟ یہ صرف اس لئے کہ اُس حقیقتِ حقہ کو متحقق ہونا تھا جسے کم و بیش نوّے (۹۰) سال پیشتر اللہ کے سچے رسول نے زبانِ وحی ترجمان سے فرمادیا تھا کہ "ان اللہ عزوجل یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا" اسلام کے فلسفۂ تاریخ کا ترتب جو اس مبارک مقولہ پر مقدر ہوچکا تھا، پورا ہوا اور آئندہ بھی پورا ہوگا۔

دوسری چیز جس کا لحاظ رہے وہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے تجدیدی کارنامہ کی کاملیت ہے اُن کی زندگی بہت کم رہی بایں ہمہ قدرت کو جو منظور تھا وہ انھوں نے پورا کر دیا، بعض لوگوں کی کوتاہ بینی ہے جو وہ یہ ریمارک لکھتے ہیں کہ

"... جس کار تجدید کو انہوں نے شروع کیا تھا اب اُس کی تکمیل میں صرف اتنی کسر باقی رہ گئی تھی .... آسان کام نہ تھا کہ ڈھائی برس کے اندر انجام پا سکتا" ان لوگوں کی نظر محسوسات ہی تک محدود ہے۔ وہ کارنامہ کی تحقیق نتائج سے کرنا چاہتے ہیں لیکن اگر یہ اصول صحیح ہو تو خلافتِ راشدہ کے کارنامہ کو بلکہ نعوذ باللہ منہ نبوت کے کارنامہ کو کیا کہا جائے گا۔ شارع علیہ السلام نے تو اصلاحِ معاشرہ میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی مگر اُن کے وصال کے بعد ہی فارق المرکز قوتوں نے اسلام کو گھیر لیا۔ خلافتِ راشدہ تو علیٰ منہاج النبوۃ تھی آخر "جاہلیت کو اُس میں در آنے کا کیوں موقعہ ملا" (جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں) اگر بالفرض حضرت عمر بن عبد العزیز ان لوگوں کی مرغوب جمہوریت کو بھی نافذ کر جاتے تو کیا ضمانت ہے کہ وہ استمراری و دوامی رہتی اور صلاح کے بعد فساد اور خیر کے بعد شر کو سر اُٹھانے کا موقعہ نہ ملتا۔ یہ تو فکر و نظر کی خیرگی اور بصارت و بصیرت کی کوتاہ بینی و کوتاہ اندیشی ہے کہ وہ صرف ظواہر محسوسات میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ امر واقعی یہ ہے کہ اُن کا کارنامہ ختم ہو چکا قدرت کو اُن سے جو کرانا منظور تھا وہ کرا دیا اُس کے بعد نہ اُنھیں کچھ کرنا تھا اور نہ اُن کی ضرورت تھی۔

(۱) ملوکیت پرستی کے ساتھ ساتھ تجہم، قدر اور ارجاء کے غیر اسلامی الاصل عقائد سے فکر میں بھی فساد پیدا ہو رہا تھا مگر یہ فساد ابھی فتنۂ خوابیدہ ہی کی حیثیت رکھتا تھا اس لئے سر دست اس کی اصلاح ایسی ضروری نہ تھی۔ زیادہ خطرناک تھی ملوکیت پرستی اور اس کی اصلاح قدرت نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے ذریعہ کرائی اور وہ بجا طور پر پہلی صدی کے مجدد ہیں۔

لیکن دوسری صدی میں بدعات کا زور بڑھنا شروع ہوا۔ اموی حکومت کے اندر داخلی انتشار پیدا ہو رہا تھا اور مشرقی ممالک میں اس کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔ ایک

ہمہ گیر وسیع تحریک خاندانی انقلاب کے لئے (امویوں کے بجائے ہاشمیوں بالخصوص عباسیوں میں خلافت منتقل کرنے کے لئے) مصروفِ عمل تھی اس کی جلو میں الحاد و زندقہ بھی بڑی سرعت سے شیوع پذیر ہونے لگا۔ سنہ ۱۳۲ھ میں انقلاب آیا۔ منصب خلافت امویوں سے عباسیوں میں منتقل ہوا اور چوں کہ عباسی ایرانیوں کی مدد سے برسرِ اقتدار آئے تھے لہذا دربارِ خلافت نے اُن کے متعلق زیادہ نرم پالیسی اختیار کی۔ بے لگام آزادیٔ فکر کی عام اجازت ہوگئی اس لئے الحاد اور زندقہ بڑی تیزی سے پھیلنے لگا اور اسلامی سماج میں اس نام نہاد حریتِ فکر نے بدعت و ہوا پرستی کی خطرناک شکل اختیار کر لی۔ قرآن تو ذو معنی ہے ہر الحاد پسند اپنی خواہشِ نفس کے مطابق اس میں سے دلائل ڈھونڈھ سکتا ہے لیکن سنت اِن تمام اجمالات کی توضیح کرنے والی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ بدعت و ہوا نے حدیث سے اعراض ہی نہیں بلکہ استخفاف برتنا شروع کر دیا یہ صورتِ حال انتہائی خطرناک تھی اور اندیشہ تھا کہ اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو دین ہی مٹ جائے گا۔ طبائع میں روشن خیالی اور آزاد خیالی بڑھتی جا رہی تھی یونان کا فلسفہ، نو فلاطونیوں کا اشراق، اور دیگر فرقوں کی عرفانیات عربی زبان میں منتقل کی گئیں اور اپنی ظاہری دل کشی اور آزادانہ تحقیق کے دعووں کی بنا پر عام دنیا پرست عقبیٰ فراموش طبیعتوں میں مقبول ہونے لگیں۔ اس کے برعکس حدیث کی تعلیم پس منظر میں پڑتی جا رہی تھی۔ طلبائے حدیث "حشویہ" کے نام سے موسوم ہونے لگے۔

لیکن پھر قدرت نے اپنا کرشمہ دکھایا۔ امام شافعیؒ جو انھیں علومِ مروجہ کے دریے تحصیل تھے اور جو وقت کے سب سے بڑے متکلم ابو الہذیل العلاف کی صحبت میں مستقلاً مروجہ علم کلام کی تحصیل میں زندگی کا بہت بڑا حصہ اور اس علم میں ممارست تامہ حاصل کر چکے تھے قدرت کے حکم سے اس صورتِ حال کے ازالہ کے لئے مامور ہوئے۔ تاریخی جبریت (DETERMINISM HISTORICAL) نے پھر دوبارہ منہ کی کھائی۔ اور وہی شخص جو سنت کو چھوڑ کر بدعت کی تلاش میں سرگرداں تھا، جو حدیث کے بجائے علم کلام کی تحصیل کو

زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتا تھا وہی شخص سنت کے احیار پر منجانب اللہ مامور ہوا۔ اس سے پہلے بھی اکابر محدثین حدیث کی نشر و اشاعت کے لئے اپنے اپنے مقدور بھر کوشش کر رہے تھے لیکن طغرائے امتیاز امام شافعیؒ کے نصیب میں مقدر ہو چکا تھا اور قدرت نے اس بڑے کام کو اُن کے ہاتھوں انجام تک پہنچوایا۔ غیر اسلامی افکار کے بجائے خالص اسلامی تعلیمات کو آخری سند بنانے کا انقلاب اُنھیں کے مبارک ہاتھوں پورا ہوا، اعتصام بالسنۃ اور عمل بالحدیث کے لئے اسلامی فکر میں اصولاً انقلاب پیدا ہوا اور ملی فکر کے دھارے کا رُخ غیر اسلامی جہت سے ہٹ کر خالص اسلامی جہت میں مُڑ گیا۔ نظام حیات کی تنظیم و تدوین کے لئے ہدایتِ نبوی کے اہم اصول کو تسلیم کر لیا گیا اور یہی اصول بعد میں ہمیشہ فکرِ اسلامی کے لئے نجم ہدایت بنا رہا۔

امام شافعیؒ کا سنہ وفات ۲۰۴ ہجری ہے اور وہ بجا طور پر دوسری صدی کے مجدد کہلاتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی میں سب سے زیادہ عجیب بات یہی ہے کہ تاریخی عوامل اُنھیں جو بنانا چاہتے تھے وہ نہ بنے اور وہ بنے جس کے بننے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ وہ ایک غیر معمولی متکلم بن سکتے تھے وہ خود ابوالہذیل بن سکتے تھے لیکن اگر نہیں بن سکتے تھے تو محدث اور پھر محدث بھی کیسے کہ جس نے اسلامی فکر میں ایک دائمی اور اصولی انقلاب برپا کر دیا باایں ہمہ وہ سرآمد محدثین رہے۔ تاریخ اس انخراق کی توجیہ سے قاصر ہے اور پھر مجبوراً اس انخراق کو بھی اُسی پیشینگوئی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تحقق سے تعبیر کیا جائے گا کہ

"ان اللہ عزوجل یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا"

اسلام کے فلسفۂ تاریخ کا ترتب اس فرمانِ واجب الاذعان پر مقدر ہو چکا تھا جو پورا ہوا اور آئندہ بھی پورا ہوگا۔

۲۔ دوسری صدی کے اسلامی سماج کی خصوصیت الحاد و زندقہ کی اشاعت اور تفلسف کی مقبولیت تھی۔ جب فلسفہ پھیلنے لگا اور مذہبی آزادی کے نام سے کینہ پرور مخالفین نے اسلام پر بے جا اعتراضات کی بوچھار کرنی شروع کی تو کچھ تو فطرتاً اور کچھ دربارِ خلافت

کی ہمت افزائی سے اس بڑھتے ہوئے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک نیا فرقہ سماج میں پیدا ہوا یہ معتزلہ تھے جو یوں تو بہت عرصے سے آزادانہ علمی تحقیق کے مدعی تھے اور جنہیں جہم بن صفوان کے تجہم، معبد و غیلان دمشقی کی قدریت، خوارج کے تشدد و تکفیر اور صدر اسلام کے دورِ فتن کی غلط تحقیق نے مل کر ایک عجیب شکل اختیار کرلی تھی جس کا نام اعتزال تھا لیکن تیسری صدی میں اُن کا فتنہ بہت خطرناک ہو گیا تھا۔ مہدی اور ہادی نے ملاحدہ زنادقہ کے فتنہ کے سدِ باب کے لئے معتزلہ کی ہمت افزائی کی اور وہ دربارِ خلافت پر چھا گئے، اساطین معتزلہ کا ظہور و نبوغ بھی دوسری صدی میں ہوا۔ لیکن عام اسلامی سماج ابھی اس وبار سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ اعتزال ابھی اسلامی سماج کی سطح ہی پر حملہ کر رہا تھا بنابریں دوسری صدی میں اس کا خطرہ زیادہ نہ تھا اس لئے اس کے تدارک کی بھی زیادہ فکر نہ تھی۔ لیکن تیسری صدی میں اس وبار نے عالمگیر شکل اختیار کرلی۔ اُن کے ورغلانے سے مامون نے فتنۂ خلق قرآن کی ہمت افزائی کی اور اس کے جانشینوں معتصم اور واثق کے عہدِ حکومت میں یہ فتنہ اسلام کا سب سے بڑا فتنہ بن گیا۔ سینکڑوں علمائے وقت کو اس کے انکار کی بنار پر قید و محن کے مصائب برداشت کرنا پڑے جن میں امام احمد بن حنبل کا نام نامی سرِ سبد ہے۔ اس طرح معتزلہ کا اثر و رسوخ پورے قلمروِ خلافت اسلامیہ پر چھا گیا۔ ۲۳۲ھ میں واثق نے وفات پائی اور متوکل اس کا جانشین ہوا۔ متوکل کو ان موشگافیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سیاسی مصالح کے پیشِ نظر اپنے پیشروؤں کی پالیسی کے خلاف پالیسی اختیار کرنا اس نے اپنی پالیسی بنایا اس طرح دربارِ خلافت میں معتزلہ کا اثر تو نہیں رہا مگر اب ان کا اثر و رسوخ اتنا بڑھ چکا تھا کہ وہ درباری مقبولیت سے بے نیاز تھے اسلامی سماج کی عروقِ حیات تک اس زہر سے مسموم ہونے لگی تھیں اور اسلامی فکر جو اسلامی نظامِ حیات کی اصل ہے اس سے ماؤف ہونے لگی تھی اس درجہ کہ متوکل باللہ کی احیارِ سنت اور استیصالِ بدعت کی سرکاری پالیسی بھی اس کا تدارک نہ کر سکی۔ معتزلہ کا زور اتنا بڑھ چکا تھا کہ وہ دربارِ خلافت کی سرپرستی سے محروم ہو کر بھی اپنے مساعیِ نامشکور کو جاری رکھ سکتے

تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلامی فکر پر اعتزال چھا گیا ہے۔ مفکرین اہلِ سنت بھی تھے مگر وہ گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔ اس وقت کا اہم تقاضا اس عالمگیر آفت کا تدارک تھا اور قدرت نے اس مقدس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کیا جو اعتزال کا سرگرم مبلغ اور سنت کا کھلم کھلا دشمن تھا۔

یہ عجیب انسان "امام ابوالحسن اشعری" تھا جس نے اعتزال کے گہوارے میں چالیس سال تک پرورش پائی تھی۔ امام اشعری ابو علی الجبائی کے شاگرد تھے۔ ان کی زندگی اعتزال کی تبلیغ و اشاعت اور تائید و تشیید میں بسر ہوئی تھی اور متعدد کتابیں اسی بدعت کی حمایت میں لکھی تھیں وہ اگر اسی کیمپ میں رہتے تو ابو علی الجبائی سے بڑھ کر ہوتے اور اپنی قوتِ کلام اور تشحیذ ذہنی کی بنا پر ابو الہذیل العلاف کے درجہ تک پہنچ سکتے تھے لیکن تیسری صدی کے سرے پر ۲۹۰ھ میں اُن کی زندگی میں اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی سماج میں انقلابِ عظیم برپا ہوا وہ محض ہدایتِ خداوندی و مشیتِ ایزدی سے اعتزال سے تائب ہوئے اور طریقِ سنت کی نصر و حمایت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا اور اس طرح اسلامی فکر میں انقلابِ عظیم کا باعث ہوئے۔ تیسری صدی میں خالص اسلامی فکر کو جس کے علمبردار محدثین تھے عموماً حشویت سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اُس کے علمبردار چند ہی تھے لیکن جب امام ابوالحسن الاشعریؒ کے مبارک ہاتھوں سے ملت کی تجدید ہوئی تو فکرِ اسلامی کے دھارے کا رخ ہی بدل گیا اور چوتھی صدی میں چہار جانب سنت ہی کا چرچا ہونے لگا۔ چنانچہ اُن اکابر مفکرین (متکلمین اشاعرہ) کی تعداد جو چوتھی صدی میں پیدا ہوئے سینکڑوں ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ اُن میں سے بعض کے نام حافظ ابن عساکر دمشقی المتوفی ۵۷۱ھ نے تبیین کذب المفتری میں صفحہ ۱۷۷ سے صفحہ ۳۳۰ تک بیان کئے ہیں اور پھر بھی انھیں عدمِ استقصار کا شکوہ ہے چنانچہ کہتے ہیں:-

ولولا خوفی من الاملال لاتممتها — اگر مجھے خوف نہ ہوتا کہ زیادہ گوئی سے قارئین اُکتا

وایثار الاقتصار لهذا الکتاب — جائیں گے اور اگر میں اس کتاب میں اختصار کو ملحوظ

لتتبعت ذكر جميع الاصحاب ...... ولكنني اكون بعد بذل الجهد مقصرا ومن تقصيري بالاخلال بذكر كثير منهم معتذرا - فكما لا يمكنني احصاء نجوم السماء كذلك لا يمكن من استقصاء جميع العلماء"

... نہ رکھتا تو سب بزرگوں کے ذکر کا تتبع کرتا ...... اور پھر بھی با ایںہمہ سعی و کوشش کوتاہ بیانی کا معترف رہتا اور بہت سوں کا ذکر نہ کر سکنے کے لئے معذرت خواہ ہوتا جس طرح میرے لئے آسمان کے تاروں کا شمار کرنا ناممکن ہے اسی طرح میں تمام علماء کے ذکر کے استقصاء سے بھی قاصر ہوں۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ امام اشعری نے اسلامی فکر میں کیا انقلاب عظیم پیدا کیا اور کس طرح تجدید ملت کے مقدس فریضہ کو ادا کیا۔ اُن کی دینی خدمات، طریق سنت کی نصرت و حمایت اور وہ مستقل اور دیرپا اثر جو انھوں نے اسلامی فکر پر چھوڑا اور جو آج بھی باوصف مرور دہور، و انقضاء سنین و شہود، اسلامی فکر کا طغرائے امتیاز اور سوادِ اعظم کے لئے مشعل راہِ ہدایت ہے بجا طور پر اُنھیں مائۃ ثالثہ کا مجدد قرار دیتے ہیں لیکن قرونِ ماضیہ کی طرح تاریخی جبریت کو پھر ایک مرتبہ منہ کی کھانی پڑی۔ تاریخ اس انقلاب ماہیت اور اس محیر العقول کایا پلٹ کی توجیہ سے قاصر ہے۔ ایک شخص جس نے اعتزال کے گہوارے میں پرورش پائی، جس نے اعتزال کی تائید و تشیید کے لئے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی، ادعائی عقلیت (DOGMATIC RATIONALISM) جس کا مُسلمہ منہاج فکر تھا اور اعتزال و تفلسف جس کا سرمایۂ حیات تھا۔ یکایک وہ اس ظلمتکدۂ جہل و سفاہت سے از خود بغیر کسی خارجی اثر کے نکل کر علم و دیانت میں داخل ہوتا ہے آخر ایسا کیوں؟ خارجی اثرات اور ماحول کے عوامل و دواعی اس کی توجیہہ سے عاجز ہیں۔

(باقی)

ادبیات

غزل

(از جناب الم مظفر نگری)

الم یہ کس کے جلوے بن کے عنوانِ نظر نکلے — چمن سے پھول اور دریا سے تابندہ گہر نکلے
نہ تھیں گنجائشیں جن کے لئے دامانِ مژگاں پر — وہ آنسو بن کے تارے چرخ پر شام و سحر نکلے
کوئی ساماں نہ تھا دل بستگی کا بزمِ گلشن میں — یہاں کانٹے بھی گل بھی تشنۂ خونِ جگر نکلے
اس آزادی سے تو صیاد بہتر تھی گرفتاری — قفس کی قید سے نکلے مگر بے بال و پر نکلے
سہارے کا کوئی امکاں نہ تھا دریائے ہستی میں — تنا ور جن کو سمجھے تھے کنارے وہ بھنور نکلے
بچشمِ غور جب دیکھا گل و لالہ کو گلشن میں — کچھ ان میں دل کے ٹکڑے اور کچھ لختِ جگر نکلے
جنوں کے خیر مقدم کو نہ اٹھی جیبِ بہارِ گل — تو صحرا سے پئے تعظیم ہم شوریدہ سر نکلے
نہیں اس بھید سے آگاہ کوئی موجِ دریا بھی — کدھر ڈوبے تھے ہم بحرِ فنا میں اور کدھر نکلے
کبھی موسیٰ کو تم نے خود سرِ ایمن نوازا تھا — مری خاطر بھی تو گنجائشِ ذوقِ نظر نکلے
خدا جانے دو عالم میں کہاں ٹھہریں وہ دیوانے — جو زندانِ جنوں سے توڑ کر دیوار و در نکلے
تری ہمدردیوں کا چارہ گر ممنون ہوں لیکن — کہاں ممکن وہ پیکاں جو ہے پیوستِ جگر نکلے
خوشی صیاد کو تاراجیِ گلشن سے کیا ہوتی — نشیمن سے فقط ٹوٹے ہوئے دو چار پر نکلے
تری محفل میں ہم آئے تھے لے کر شوقِ نظارہ — یہاں جلوے ہی سرگرمِ تماشائے نظر نکلے

شکستہ بال و پر سمجھے ہوئے تھی جن کو اک دنیا
الم وہ طائرِ سدرہ سے بھی کچھ تیز پر نکلے

غزل

(از جناب اشفاق علی خاں صاحب ایڈوکیٹ)

کسی میں حوصلہ بھی ہے کہ دورِ آسماں بدلے؟ — تمنا سب یہ کرتے ہیں فضائے گلستاں بدلے
ہوا اک تازیانہ اور میرے عزمِ محکم کو — بگڑ کر مجھ سے دنیا نے ذرا تیور جہاں بدلے

جو ہمت ہو تو پھر میرے نشیمن سے مقابل ہو — کبھو پہلو نہ یوں گھبرا کر اب برقِ تپاں بدلے
پہنچ کر جس جنوں کا ہاتھ رہ جائے گریباں تک — یہ ناممکن کہ اس کے زور سے رسمِ جہاں بدلے
اُسے کیا قدر ہوگی میری شانِ بے نیازی کی — وہ پابندِ ہوس جو آستاں پر آستاں بدلے
اسی ذوقِ عمل سے زندگی بنتی ہے انساں کی — اسی سے میری دنیا کے زمین و آسماں بدلے

وہ کیوں کر ہمنوایانِ چمن کا دل بڑھائے گا
جو خوفِ برق سے شام و سحر سو آشیاں بدلے

دعا

(از جناب برج لال صاحب جگی رعنا)

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو — بے کہے آدمی کے دل کا حال
تیری چشم و نظر سے پوشیدہ — کچھ نہیں بزم آب و گِل کا حال
یہ حجر یہ شجر یہ حیوانات — اوجِ فطرت کے مختلف زینے
آدمی کے خیال اور اعمال — سب ہیں تیری رضا کے آئینے
گلستاں میں تری رضا کے بغیر — ایک پتہ بھی ہل نہیں سکتا
تو نہ چاہے تو باوجودِ بہار — ایک غنچہ بھی کھل نہیں سکتا
ماضی و حال اور مستقبل — تری رفتار کے کرشمے ہیں
ماہ و سال اور موسموں کا ظہور — تیرے دیدار کے کرشمے ہیں
تیری قدرت کا جو بھی ہے قانون — کوئی اُس کو بدل نہیں سکتا
جس کی تقدیر میں جو لکھا ہے — وہ کسی طور ٹل نہیں سکتا
جانتا ہوں یہ سب مگر پھر بھی — دل میں چھاتی ہے جب الم کی گھٹا
دل کی بے تابیوں سے گھبرا کر — آ ہی جاتی ہے میرے لب پہ دُعا
یہ دعا یہ مری تمنّا کا — دخل بے جا تری مشیت میں
مانتا ہوں میں مانتا ہوں میں — کفر ہے کفر ہے حقیقت میں
یہ دعا یہ ضمیر کی آواز — خود فریبی کا نقش باطل ہے
زندگی کا یہ ایک طنزِ لطیف — میری ناکامیوں کا حاصل ہے

لاکھ موجِ سراب ہے یہ دُعا ÷ دل کو تسکین اس سے ملتی ہے ÷ چند لمحوں کے واسطے ہی سہی ÷ آرزو کی کلی تو کھلتی ہے

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا مکتوب گرامی

مدح و تعریف میں آئے دن دوستوں اور بزرگوں کے ازراہِ قدر شناسی خطوط آتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن اُن کا شائع کرنا تو کجا ان کا ذکر تک کرنا بھی قلم کے آئینِ غیرت و خودداری کے خلاف ہے۔ لیکن مخدومنا مولانا گیلانی وسعتِ علم و فضل، اسلامی مسائل و مباحث میں دقتِ نگاہ، تقویٰ و طہارت اور اخلاق و مکارم کے لحاظ سے جس پایہ کے بزرگ ہیں اس کے پیش نظر بحکم واما بنعمۃ ربک فحدث ایڈیٹر برہان کے نام مولانا کا یہ مکتوب شایع کیا جاتا ہے۔ (برہان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۷ فروری ۵۵ء
گیلانی

محبی و حبی الجلیل الفاضل ایدکم اللہ بروح منہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ برہان کے تازہ شمارہ میں آپ نے اپنی زیر تصنیف کتاب کے جس حصہ کو شایع فرمایا طبیعت اس کو دیکھ کر پھڑک اٹھی جزاکم اللہ عن المسلمین السنیین خیر الجزار۔ مدت کے بعد ایک عالمانہ تحقیقی مضمون کے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، سیدنا المرتضیٰ علیہ السلام کی تاخیر فی البیعت کا مسئلہ بقول آپ کے معمولی مسئلہ نہ تھا لیکن حمد اللہ کے وجود راطبی، اور صدرا کے نشاۃ بالتکریر پر لکھنے والے کیا کچھ نہیں لکھتے رہے مگر اس مسئلہ پر توجہ کا جو حق تھا کبھی نہیں ادا کیا گیا۔ دوسروں کے متعلق کیا کہوں، خود خاکسار بھی اعتراف کرتا ہے کہ عام مشہور توجیہ سے تسکین بھی نہیں ہوتی تھی، لیکن واقعہ کی صحیح نوعیت کیا ہے اس کی تحقیق کی توفیق کبھی نہیں ہوئی، کہنے والا چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ ہزار سال سے بھی زیادہ مدت گزرنے کے بعد اس عقدہ کے حل میں آپ کو کامیابی حاصل ہوئی مسئلہ اب بے غبار ہو کر صاف ہو گیا۔ کتاب زیر تصنیف کا موضوع بحث کیا ہے خدا کرے اسی قسم کی تحقیقاتِ رائقہ پر وہ مشتمل ہو، موقعہ ہو تو اپنی خیر و عافیت سے مطلع فرمائیے۔ خاکسار کی علالت کا سلسلہ دو سال سے ہنوز جاری ہے۔ لکھنے پڑھنے سے تقریباً معذور ہو چکا ہوں۔ برہان تک کی خدمت کی توفیق نہیں ہو رہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب "سوانح قاسمی" نظر مبارک سے گذری بھی یا نہیں، تیسری جلد دیکھئے لکھی بھی جاتی ہے یا نہیں۔ مگر زیادہ دھیمی رفتار سے کام ہو رہا ہے۔ فقط خاکسار
مناظر احسن

تبصرے

کلیات انجدی حصہ چہارم مرتبہ مولوی محمد حسین محوی و مولوی محمد یوسف کوکن ایم اے تقطیع کلاں ضخامت تین سو پچاس صفحات کاغذ عمدہ اور ٹائپ جلی : شائع کردہ مدراس یونیورسٹی مدراس قیمت بارہ روپے۔

افضل الدین ابراہیم خاقانی لغت گوئی میں حسان العجم کے خطاب سے معروف ہے، فارسی کا مشہور قصیدہ گو شاعر تھا۔ ۵۹۵ھ میں وفات پائی اس کا کلام دقت وندرتِ الفاظ اور جدتِ تراکیب و تشبیہات کے لئے مشہور ہے۔ جب تک کوئی شخص علوم متداولہ کی اصطلاحات سے واقف نہ ہو خاقانی کے قصائد کو پورے طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ خاقان شروانی کے دربار سے منقطع ہونے کے بعد وہ ادھر اُدھر پریشان پھرتا رہا۔ اور آخر اس نے مکہ و مدینہ کا سفر کیا۔ حج و زیارت حرمین شریفین سے بہرہ یاب ہوا اور اس سفرِ مقدس کی یادگار میں تحفۃ العراقین کے نام سے ایک مثنوی لکھی یہ اس کے خصوصیات کلام کی بہمہ وجوہ آئینہ دار ہے اس مثنوی کی شرح میر اسماعیل خان ابجدی المتوفی ۱۲۰۳ھ نے جو کرناٹک کے نواب والاجاہ محمد علی خان بہادر کے خاص درباری شاعر تھے لکھی تھی۔ مولوی محمد حسین محوی نے اس کو ۱۹۳۷ء میں اڈٹ کیا تھا۔ اب جناب محمد یوسف صاحب کوکن ایم۔ اے۔ کی نظرثانی اور چند اضافوں اور ایک عالمانہ مقدمہ کے بعد مدراس یونیورسٹی نے اس کتاب کو بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے مثنوی تحفۃ العراقین عام طور پر یونیورسٹیوں کے فارسی کے نصاب میں شامل ہے اس لئے اس مضمون کے طلبہ اور اساتذہ دونوں اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ آخر میں چودہ صفحات کی ایک اور مثنوی جو خود ابجدی کے قلم سے اردو میں حقیقت نامہ کے نام سے ہے وہ بھی شامل ہے۔ مدراس یونیورسٹی کی داد در

مطبوعہ کتابوں کا تذکرہ انھیں صفحات میں پہلے بھی آچکا ہے یہ اس سلسلہ کی تیسری ضخیم کتاب ہے، ہم نے پہلے بھی مبارک باد دی تھی اور اب پھر یونیورسٹی کو اس کی اردو نوازی پر مبارک باد دیتے ہیں، امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کرکے مدراس یونیورسٹی کو اس کا موقع دیں گے کہ وہ آئندہ بھی اردو زبان میں اسی طرح کی علمی اور ادبی کتابیں شائع کرتی رہے۔

الحسین از عمر ابو النصر | ترجمہ شیخ محمد احمد پانی پتی تقطیع متوسط ضخامت ۱۷۲ صفحات ٹائپ جلی اور خوشنما قیمت عہ/ پتہ :۔ مکتبۂ جدید انارکلی لاہور

یہ کتاب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حالات و سوانح میں اصل عربی میں تھی محمد احمد صاحب نے اس کو اردو کا جام اس خوبی سے پہنایا ہے کہ ترجمہ بالکل ترجمہ نہیں معلوم ہوتا پھر زبان اور طرز بیان بھی بہت سلجھا ہوا اور شستہ ہے۔ لائق مصنف نے پہلے خلافت کے بارہ میں جو مختلف نظریات تھے ان کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد حضرت علی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کے اوصاف و کمالات کی مختلف تصویریں دکھائی ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ امام حسین کی شہادت جن چند واقعات کے مرتب سلسلہ کا نتیجہ تھی ان کے سمجھنے میں آسانی ہو اس کے بعد امام والامقام کے چند ابتدائی واقعات زندگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آپ کے ساتھ غیر معمولی محبت و شفقت وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد شہادت کبریٰ کا واقعۂ ہائلہ پوری تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، واقعات اکثر و بیشتر مستند اور صحیح ہیں اور لب و لہجہ بھی معتدل و متوازن اور سنجیدہ ہے اس کا مطالعہ عام مسلمانوں کے لئے مفید اور عبرت آموز ہوگا

الفوز الکبیر فی اصول التفسیر (عربی) | از حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ تقطیع کلاں ضخامت ۲ صفحات ٹائپ جلی اور روشن قیمت دو روپیہ

پتہ :۔ مکتبۂ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور (مغربی پاکستان)

یہ رسالہ حضرت شاہ صاحب کی مشہور تصنیف ہے جس میں تفسیر قرآن کے اصول پر گو مختصر لیکن بڑی جامع اور بصیرت افروز بحث کی گئی ہے۔ یہ رسالہ کمیاب کیا

بلکہ نایاب ہو گیا تھا۔ مکتبہ سلفیہ لائقِ تشکر ہے کہ اس نے بڑے اہتمام سے اس کو پھر شائع کر کے افادہ کے لئے عام کر دیا ہے۔ اصل فارسی رسالے کا اُردو ترجمہ مکتبہ برہان دہلی سے پہلے ہی شائع ہو چکا ہے۔ رسالہ کے آخر میں خود حضرت شاہ صاحب اپنے قلم کے لکھے ہوئے اپنے سوانح حیات ہیں جو آٹھ صفحوں میں آئے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے علوم و فنون سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ دونوں رسالے بڑے قابلِ قدر ہیں

معجزات القرآن جلد اوّل از سید شاہ محمد شاہ صاحب القادری۔ تقطیع کلاں ضخامت ۷۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت درج نہیں پتہ:۔ جماعت قرآنیہ۔ مستعد پورہ۔ حیدر آباد دکن۔

اس کتاب کی لوح پر کتاب کا تعارف ان لفظوں سے کرایا گیا ہے "تمام دنیا کے لئے دعوتِ فکر۔ انسانی علمی و عملی ترقیاتِ موجودہ کی چودہ سو برس پہلے پیشین گوئیاں۔ اعجاز و صدقِ رسالتِ محمدی کا آسمانی قطعی ثبوت" اس کے بعد کتاب کے آغاز میں معجزات القرآن کے زیرِ عنوان یہ بتایا گیا ہے کہ آج کل کی تمام حیرت انگیز ایجادات واختراعات وہ ہیں جن کی پیش گوئی قرآن نے پہلے ہی کر دی تھی لیکن افسوس ہے کہ یورپ اس شرف کے باوجود کہ قرآن کی پیشین گوئیاں اس کے ذریعہ پوری ہو رہی ہیں خود خدا ناشناسی اور تدبّر کے عذابِ الیم میں مبتلا ہے۔ اور دوسری طرف علماء فقہا اور متکلمینِ اسلام ہیں جنہوں نے ایمان واسلام کی صرف ظاہری اور سطحی شکل وصورت کو پکڑ رکھا ہے اور حقیقی ایمان سے محروم ہیں۔ دیباچہ میں اپنے اس خیال کو پُر زور الفاظ اور درشت لب ولہجہ میں ظاہر کرنے کے بعد قرآن کی قسموں کی نئی اور عجوبہ تفسیر کر کے جدید ایجادات وانتظامات کو قرآن سے کس طرح ثابت کیا گیا ہے؟ اُس کا ایک نمونہ درجِ ذیل ہے:۔

والذاریات ذروا o فالحاملات وقرا o فالجاریات یسرا o فالمقسمات	قسم ہے ان تیز رو گاڑیوں اور سواریوں کی جو دھواں اور گرد اُڑاتی ہیں۔ پھر اُن گاڑیوں

کی جو بوجھل سامان کو اٹھا لے جاتی ہیں اور نقل
وحمل کا کام کرتی ہیں۔ پھران جہازوں کی جو نہایت
سرعت وسہولت کے ساتھ پانی اور ہوا (سمندر
وفضا) میں دوڑتے پھرتے ہیں۔ پھر اسٹیشنوں،
ڈاکخانوں۔ اور گوداموں کی قسم جو پارسلوں
سامانوں۔ تاروں۔ میلوں کو تقسیم کرتے ہیں

آیاتِ بالا میں مصنف کے نزدیک جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے ان کی متعدد صفحات میں تشریح وتوضیح اور اس سلسلے میں دین کیا ہے؟ اسلام کا اصل مقصد کیا ہے؟ توحید کی حقیقت کیا ہے؟ ان سب پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کا اصل مقصد توحید ہے لیکن توحید سے مراد "توحید الا لہٰ" (یہ اصطلاح بھی عجیب ہے) نہیں جیسا کہ فقہا اور متکلمین کہتے ہیں بلکہ اُس سے مراد تمام قوموں اور ملتوں کو ملا کر ایک کر دینا ہے۔ اب آپ سمجھ لیجئے اس کا مطلب کیا یہ نہیں کہ مغربی زبانیں، مغربی کلچر اور مغربی تہذیب وتمدن سے زیادہ اب اور کسی کو "موحد" کہلانے کا حق ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ساری دنیا ہی کو ایک کر دیا ہے غرض کہ یہ پورا رسالہ اسی قسم کی خیال آرائیوں اور جدت طرازی کے نمونوں سے بھرا ہوا ہے علاوہ اس کے کہ مصنف کی یہ تمام تفسیریں تفسیر بالرائے کے حکم میں آتی ہیں جن پر شدید وعید کی گئی ہے۔ ایک بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ اب دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے اُس کو مسلمان کرنے کے لئے یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ قرآن میں کن کن چیزوں کا ذکر آیا ہے اور کن کا نہیں آیا۔ اُس کو اگر مسلمان بنانا ہے تو صاف بتایئے کہ اُس کا نظامِ زندگی کیا ہے اور وہ ہی نظامِ دنیا کے سب نظاموں سے بہتر اور اعلیٰ ترکیوں ہے۔

خیر کثیر | خیر کثیر تقطیع متوسط ضخامت ۲۰۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت

پیسے، تین روپے آٹھ آنے   پتہ:- ابنائے مولوی محمد بن غلام رسول سعدی۔ جامع محلہ بمبئی ۳
خیر کثیر حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کا مشہور رسالہ ہے جس میں آپ نے مسائل تصوف اور بعض ماوراء الطبیعاتی مسائل کے ساتھ ساتھ اسلامی احکام و عبادات کے اسرار و رموز سے بحث کی ہے یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اس کو درحقیقت حضرت شاہ صاحب کے فلسفہ کا متن سمجھنا چاہیئے۔ مولانا عبدالرحیم صاحب پشاوری نے سہل و سلیس اور شگفتہ اُردو میں اس کا ترجمہ کرکے اُردو داں طبقہ پر بڑا احسان کیا ہے کہ اب وہ بھی اس گنجینۂ حکم سے فیض یاب ہوسکتے ہیں۔

حسرت کی سیاسی زندگی

از جناب عبدالقوی صاحب دسنوی تقطیع متوسط ضخامت ۷۲ صفحات طباعت و کتابت بہتر قیمت عہ

پتہ:- رائٹرس امپوریم لمیٹڈ۔ بیوپار بلڈنگ۔ فیروز شاہ مہتا روڈ بمبئی ۱

مولانا حسرت موہانی شاعر ہونے کے علاوہ بہت اونچے درجہ کے سیاسی لیڈر بھی تھے لیکن ان کی سیاست پر بہت سے دور آئے اور گذر گئے اور اس راہ میں کبھی اُن کو کسی ایک مقام پر رکنا اور ٹھہرنا نصیب نہیں ہوا۔ عبدالقوی صاحب نے اس مقالہ میں مولانا مرحوم کی اسی سیاسی زندگی کے مختلف پہلو دکھائے ہیں۔ اس مقالہ سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ حسرت کی شاعری اور سیاست دونوں ایک دوسرے سے بالکل بے جوڑ اور بے تعلق نہیں تھے زبان صاف اور شگفتہ ہے۔

گنج طلسم

از شاہ نعمت اللہ ولی مرتبہ و مترجمہ ڈاکٹر ایم حفیظ سید تقطیع کلاں ضخامت ۴۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ   پتہ:- سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

حضرت شاہ نعیم الدین نعمت اللہ ولی گولکنڈہ کے مشہور صاحب طریقت بزرگ ہیں جنہوں نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں گویا اب سے پونے چار سو برس

پہلے وفات پائی موصوف نے ایک طویل مثنوی لکھی تھی جس میں معرفت وطریقت کے اسرار ورموز اور اخلاقی نکات وحکم پرداد سخن گوئی دی تھی۔ اُردو زبان کے نامور فاضل اور محقق ڈاکٹر حفیظ سید جن کو تصوف کا بھی بڑا اچھا ذوق ہے انھوں نے اس مثنوی کو آڈٹ کیا اور اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ شروع میں صاحب مثنوی کے حالات پر ایک مختصر مقدمہ ہے۔ دیباچہ ڈاکٹر محی الدین زور نے لکھا ہے جس میں شاہ صاحب کے خاندان سے متعلق مفید معلومات ہیں۔ مثنوی ہر صاحب دل کے پڑھنے کے لائق ہے

البلاغ کا ملک سعود نمبر

مدیر مسئول جناب محی الدین صاحب منیری تقطیع کلاں، ضخامت ۱۲۴ صفحات کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت عہ/

پتہ :- انجمن خدام النبی صابو صدیق مسافر خانہ کرناک روڈ بمبئی ۱

البلاغ جس نے بہت قلیل مدت میں ہی اُردو کے سنجیدہ ماہناموں میں ایک وقیع حیثیت حاصل کرلی ہے اُس نے شاہ سعود کے ورودِ ہند کے موقع پر اپنا ایک خاص نمبر شائع کیا تھا۔ یہی نمبر اس وقت زیر تبصرہ ہے اس میں پہلے شروع کے بائیس صفحات میں عربی نثر ونظم کے مضامین ہیں جن میں شاہ کا خیر مقدم کیا گیا ہے شاہ کو ہندوستان کے مسلمانوں سے متعارف کرایا گیا ہے اور چند مشاہیر واعاظم ملک کے پیغامات ہیں اس کے بعد اُردو کا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں خیر مقدم اور دعا وثنا کے علاوہ بعض بڑے قابل قدر وتحسین مضامین ومقالات ہیں۔ مولانا گیلانی کا مضمون اگرچہ دعا رنامہ کے عنوان سے ہے لیکن یہ جس حرارتِ قلب وسوزِ جگر کے ساتھ لکھا گیا ہے اُس کا اندازہ اسے پڑھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ "مملکت سعودیہ اور جزیرہ نمائے عرب" مولانا عبدالرشید ندوی "آل سعود کی تاریخ" قمر مبارک پوری "مکہ اور حجاز کی قدیم یادگاریں" ابو اصلح محمد صالح "مملکت سعودیہ کے مرکزی شہر" قاضی اطہر صاحب مبارک پوری "سعودی عرب میں پیٹرول" از محی الدین صاحب منیری یہ سب مضامین بھی مفید معلومات کے حامل ہیں۔ غرض کہ یہ نمبر اپنے مقصد میں صورۃً ومعنًا بہمہ وجوہ کامیاب ہے اس کی افادیت وقتی اور ہنگامی نہیں بلکہ پائدار ومستقل ہے۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کرکے کارکنانِ البلاغ کی سعی ومحنت اور ان کے حسن ذوق کی داد دیں گے۔

برہان

جلد ۳۶ شمارہ ۴

اپریل ۱۹۵۶ء مطابق رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

گذشتہ مہینہ کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ ۲۳ مارچ کو ہمارے پڑوس میں "اسلامی جمہوریہ پاکستان" قائم ہو گیا۔ جمہوریہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہاں حکومت کسی خاص ایک طبقہ یا گروہ کی نہیں ہوگی بلکہ سب اہل ملک کی ہوگی اور ملک کے ہر باشندہ کو بلا تفریق مذہب وملت یکساں شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ کسی کو کسی پر کوئی تفوق نہ ہوگا۔ اور قانون کی نگاہ میں سب کی حیثیت یکساں اور برابر ہوگی۔ اس جمہوریہ کو "اسلامی" کی صفت سے موصوف کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ پاکستان کی گورنمنٹ اور وہاں کے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرلیا ہے اور اس بات کا اقرار کیا ہے کہ وہ اپنے ہر قول وعمل کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ اور مسئول ہیں۔ اور ان کا جو قدم بھی اٹھے گا وہ اسی تصور اور اسی یقین کے ماتحت اٹھے گا۔ ایک جمہوریہ میں حکومت عوام کی ہوتی ہے اور عوام کے لئے ہوتی ہے وہ خود اپنی صواب دید سے ایک دستور بناتے ہیں اور اس پر عمل کرنے کا عہد وپیمان کرتے ہیں۔ لیکن انسان جس طرح اپنی انفرادی زندگی میں اپنی خواہشات اور جذبات سے یکسر بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اپنی جماعتی زندگی میں بھی وہ جماعتی عصبیت سے یکسر الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اور اس بنا پر کوئی کام خواہ کتنی ہی نیک نیتی اور ایمانداری سے کیا جائے اس میں بہرحال غلطی اور نقص کا احتمال رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریتیں ایک مرتبہ اپنا دستور بنانے کے بعد اس میں وقتاً فوقتاً ترمیم وتنسیخ اور ردوبدل کرتی رہتی ہیں۔ لیکن جو خدا کا قانون ہے اس میں کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا اس کے علاوہ اپنے ہر عمل کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ سمجھنے اور یقین کرنے کا طبعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے عمل میں زیادہ خلوص جوش اور استواری پیدا ہوجاتی ہے اور زندگی کے متعلق اس کا نقطۂ نظر زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہوجاتا ہے۔ اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایک اسلامی جمہوریہ صحیح معنی میں اسلامی جمہوریہ ہو تو وہ اپنوں کے لئے بھی رحمت ہے اور پرایوں کے لئے بھی۔ اسلام کا بنیادی اصول زندگی یہ ہے کہ خود اپنے ساتھ انصاف کرو اور دوسروں کے ساتھ انصاف کرو۔ دنیا میں جب کبھی اور جہاں کہیں اس اصول پر عمل کیا گیا ہے زندگی باغ وبہار بن گئی ہے اور جب کبھی اس سے انحراف ہوا تو جس درجہ کا انحراف تھا اسی درجہ کی تباہی اور بربادی آئی ہے۔ اسلامی

تصورِ حیات کے ماتحت ایک شخص یہ عقیدہ رکھنے پر مجبور ہے کہ اگر اس نے خدا کے کسی بندہ کے ساتھ ناانصافی کی یا اس کی حق تلفی کی ہے تو اگرچہ اس کی دولت و ثروت اور طاقت و قوت کی وجہ سے یہاں کی حکومت۔ اور قانون۔ عدالت اور پولیس اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے لیکن بحکم "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ" خدائے احکم الحاکمین کو وہ کوئی جل نہ دے سکے گا اور اس کی پکڑ سے بچ کر کہیں پناہ نہ لے سکے گا۔ اسی تصورِ حیات اور اس کے پس منظر میں اسی عقیدۂ یوم آخرت کا یہ اثر تھا کہ محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق جیسے باجاہ وجلال بادشاہوں نے معمولی حیثیت کے ہندوؤں کے استغاثہ پر اپنے آپ کو بے تکلف قاضی کی عدالت میں جواب دہی کے لئے پیش کر دیا اور قاضی کا فیصلہ ایک معمولی حیثیت کے انسان کی طرح بصد رضا و رغبت سنا اور اُس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا، یہ اور یہ ایک دو نہیں تاریخ میں اس طرح کے سینکڑوں واقعات ملیں گے۔

اسلامی جمہوریہ ہونے کی بنا پر پاکستان کی اقلیتیں پاکستان گورنمنٹ اور وہاں کی اکثریت کے ہاتھوں میں اللہ کی ایک امانت ہیں، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ کے ارشاد "کلکم مسئول عن رعیتہ" کے مطابق ان کا یہ فرض ہے کہ ان اقلیتوں کے ساتھ صرف مساوات اور برابری کا نہیں بلکہ ایثار۔ فیاضی اور کشادہ دلی کا معاملہ کریں۔ اسلام میں تالیف قلب کی بڑی اہمیت ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مولفۃ القلوب کو عام مسلمانوں سے زیادہ حصہ دیا کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ غزوۂ حنین کے موقع پر انصار مدینہ کو اس پر کچھ شکایت ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت غضب ناک ہو کر ایک تقریر کی اور اس میں آپ نے فرمایا کہ اے انصار تم تو مسلمان ہو۔ اسی لئے میں نے تم کو اسلام کے حوالے کر دیا ہے۔ رہے یہ لوگ تو میں ان کی تالیف قلب (دل جوئی) کرتا ہوں۔ تم اس پر کیوں برا مانتے ہو۔ بہرحال پاکستان نے اپنے متعلق "اسلامی جمہوریہ" کا اعلان کر کے ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لی ہے آئندہ تاریخ بتائے گی کہ پاکستان نے اس اعلان کے ذریعہ اسلام کی آزمائش اور جانچ کا جو موقع دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس میں کہاں تک وہ اپنے حسن عمل و کردار سے اسلام کو نیک نام ثابت کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ ہمارا یہ پڑوسی ملک صحیح معنی میں اسلامیہ جمہوریہ ہو اور وہ اپنے عمل اور حسن اخلاق و بلند کردار کا ایسا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے جو خدا ناشناس جمہوریتوں کے لئے لائق تقلید ہو اور جس سے دنیا میں انسانیت نوازی شرافت و حریت اور امن پسندی و صلح گستری کی اعلیٰ مثال قائم ہو۔

جمعہ جمعہ ابھی اسٹالن کو مرے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ اس کی جھوٹی اور مصنوعی عظمت و بزرگی کی مردہ لاش کو خود اس کے ساتھیوں نے قبر سے اکھاڑ کر اسے برہنہ کرنا شروع کر دیا، ابھی چند روز پہلے کوئی تصور بھی کر سکتا تھا کہ خود اسٹالن کے ملک میں اس کے پرانے دوست اور رفیق گھر کے بھیدی بن کر اٹھیں گے اور دنیا کے عظیم ترین انسان کی شہرت و نیکنامی کے لنکا کو ڈھا کر رہیں گے۔ انسانیت نوازی مساوات پسندی۔ بے لوث خدمت بنی آدم

غریبوں اور مظلوموں کی دادگری، ستم رسیدگان عالم کی فریاد رسی۔ ان میں سے کوئی صفت ہے جس کا ہیرو کل تک اسٹالن کو نہیں کہا جاتا تھا ہزاروں لاکھوں نہیں کروڑوں انسان اس کے نام کی مالا جپتے تھے اور اس کی عظمت کے ترانے گاتے تھے لیکن آج یہ کیا ہو رہا ہے کہ جبر و ظلم، سفاکی و بے رحمی، خود غرضی و مطلب براری یہاں تک کہ قوم فروشی و ضمیر فراموشی ان میں سے کوئی جرم نہیں ہے جس کا مرتکب اس کو قرار نہ دیا جا رہا ہو اور کوئی الزام نہیں ہے جو اس کے سر نہ تھوپ دیا گیا ہو۔ اسٹالن خود کیا تھا اور کیسا تھا؟ اور یہ جو کچھ اب کہا اور سنا جا رہا ہے اس میں کتنی بات سچی ہے اور کتنی غلط؛ اس سے بحث نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ تاریخ کی عدالت کے فیصلے کیسے عجیب و غریب اور اٹل ہوتے ہیں۔ یہ عدالت وہ مقام ہے جہاں "زبان خنجر" ہزار چپ ہو آستین کا لہو ہر حال پکار کر رہتا ہے اور راز ہائے سربستہ بھی اسی طرح طشت از بام ہو جاتے ہیں کہ "در لب گوید کان رسید" کا مصداق بن جاتے ہیں۔

ہمارے ملک کے وہ نوجوان جن کے نزدیک کمیونزم و اسٹالنزم، کے مرادف ہے انھیں اس سے عبرت حاصل کر کے محسوس کرنا چاہئے کہ ترقی پسندی یہ نہیں ہے کہ اندھا دھند ایک شخص کو بت بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی جائے اور اس کا تہیہ کر لیا جائے کہ دنیا کی ہر چیز کو اس کے قدموں پر لا کر ڈال دیا جائے۔ بلکہ اصل ترقی پسندی یہ ہے کہ دماغ روشن ہو اور دل بیدار۔ اور حقائق پر غیر جانبداری اور بے تعصبی کے ساتھ غور کیا جائے۔ دوسروں کی باتیں بھی صبر و سکون کے ساتھ سنی جائیں اور ان پر توجہ کی جائے۔ کل تک جو باتیں اسٹالن کے دشمن کہتے تھے آج خود اس کے دوستوں اور محرمان راز کی زبان سے ان کی تصدیق ہو رہی ہے۔ پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آج آپ جن شخصیتوں پر اعتماد کرتے ہیں کل ان کا پردہ بھی اس طرح چاک نہیں ہوگا۔ اس لئے سیدھا راستہ یہی ہے کہ کسی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر اس کے افکار و عمل پر روشن دماغی کے ساتھ تنقید کی جائے اور کھرا کھوٹا الگ کر کے دکھایا جائے۔ اپنے مخالفوں کو خواہ مخواہ برا کہنا۔ ان کا منہ چڑانا۔ اور ان کا تمسخر کرنا حظ نفس کا سامان تو ہو سکتا ہے دماغ کے لئے زود ہضم اور مفید غذا نہیں بن سکتا۔

دینی تعلیم کے مرکزی بورڈ کی طرف سے بچوں اور بچیوں کے لئے غیر نصابی تعلیم کا جو خاکہ اخبارات میں چھپا ہے اور اس کے علاوہ اس کی کاپیاں مختلف علما اور ارباب تعلیم کے پاس بھی اظہار رائے کے لئے بھیجی گئی ہیں ہم نے اس کو بغور پڑھا اور اب یہ کہنے میں مسرت ہے کہ یہ خاکہ ہر وجوہ نہایت مکمل اور اعلیٰ ہے اور اس میں کوئی بات ہمارے نزدیک شریعت کے نقطہ نظر سے اعتراض کے قابل نہیں ہے۔ اگر اس خاکہ کو عملی جامہ پہنانے کا موقع مل جائے اور اس کے لئے جس ساز و سامان اور جتنے فنڈ کی ضرورت ہے وہ میسر آ جائے تو کوئی شبہ نہیں کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی بڑی اہم اسلامی خدمت ہوگی۔ غریب مسلمانوں کے بچے ابتدائی عمر میں خدائی خوار پھرتے ہیں۔ اور دولتمند مسلمان اپنے بچوں کو مشنری اسکولوں یا تربیت گاہوں میں بھیجتے ہیں اور اس کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اگر اس غیر نصابی تعلیم کے خاکہ کے مطابق جگہ جگہ بچوں کی تربیت گاہیں کھل جائیں تو اس کا فائدہ دونوں طبقوں کے مسلمانوں کو پہنچے گا اور وہ غیر اسلامی اثرات سے محفوظ رہ سکیں گے۔

پنجاب کے گیانی پرتاپ سنگھ صاحب نے ایک تحریک شروع کی ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر سوا روپے سے زیادہ خرچ نہ کیا جائے۔ یہ تحریک پنجاب میں اور وہ بھی سکھوں میں خصوصاً بہت کامیاب ہو رہی ہے اور اب تک متعدد خاندانوں میں شادیاں اسی اصول پر ہو چکی ہیں۔ یہ خبر اگر صحیح ہے ــــ اور صحیح ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے ــــ تو سب سے زیادہ عبرت مسلمانوں کو ہونی چاہیے جن کے پیغمبر نے سب سے پہلے خود اپنی لخت جگر کی انتہائی سادگی کے ساتھ شادی کر کے ایک مثال قائم کی تھی۔ اور قرآن نے "فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" کہہ کر اس مثال کی پیروی کی دعوت دی تھی، ہائے!

مجھے خندۂ گل پہ آتا ہے رونا کہ اس طرح ہنسنے کی خو تھی کسی کی
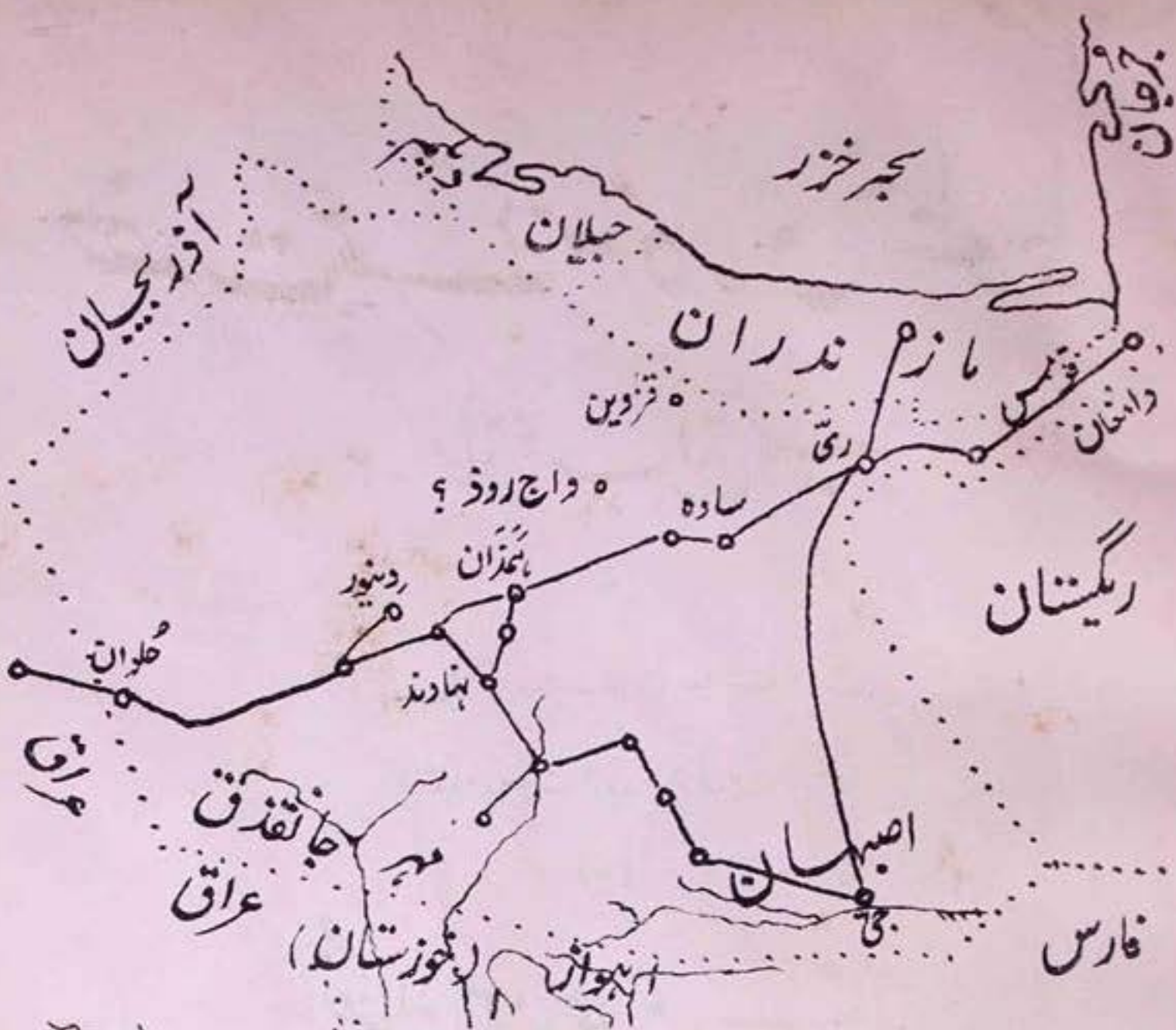
حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط

۲ - محاذِ عراق و عجم

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق)

(استاذ ادبیات عربی - دہلی یونیورسٹی)

(۱۰)

۱۰۰ نُعمان بن عدی کے نام

نُعمان بن عدی صحابی کو حضرت عمرؓ نے ضلع مَیسان (زیریں عراق) کا افسرِ خراج مقرر کیا۔ جب نُعمان مدینہ سے جانے لگے تو اُن کی بیوی وطن چھوڑ کر پردیس جانے کے لئے تیار نہ ہوئیں اور اوران کو مجبوراً اکیلا جانا پڑا۔ مَیسان کی شادابی اور آسائش نُعمان کو بہت بھائی اور انھوں نے بیوی کو بلانے کے لئے ایک شوق انگیز نظم لکھی جس کے چند اشعار یہ ہیں:-

مَنْ مُبلغُ الحَسناءَ اَنَّ حَلِیلَھا　　　بمیسانَ یُسقیٰ فی زُجاجٍ وحَنتَمِ

کوئی ہے جو میری حسین بیوی کو یہ خبر پہنچائے کہ تمہارے شوہر کو شیشے کے گلاس اور فیروزی جگ سے شراب پلائی جاتی ہے۔

اذا شِئتُ غَنَّتنِی دھاقینُ قریۃٍ　　　وصَنَّاجۃٌ یجذُو علیٰ کلِ مَنسَمِ[1]

---

[1] ازالۃ الخفاء ۲/۷۳، واستیعاب مصر، ۵/۲۴۳ ۱۹۰۷ء :- وصناجۃ تحدو علیٰ کل میسم
کنز العمال ۲/۱۷۵ :- ورقاصۃ تجثو علیٰ کل میسم
یاقوت معجم ۸/۲۲۸ :- وصناجۃ تجثو علیٰ حرف میسم

جب گانا سننے کو میرا جی چاہتا ہے تو سرراہ ناچنے والا ایک چنگ نواز اور گاؤں کے مقدم مجھے گانا سناتے ہیں۔

لعلّ امیر المؤمنین یسوءہ تنادمنا فی الجوسق المتھدّم

اگر امیر المؤمنین کو معلوم ہو جائے کہ میں ساتھیوں کے ساتھ ٹوٹے قلعہ میں بیٹھ کر شراب پیتا ہوں تو مجھے اندیشہ ہے وہ ضرور ناراض ہوں گے۔

ان اشعار کا جب مدینہ میں چرچا ہوا تو حضرت عمر نے نعمان کو معزول کر کے مدینہ بلا لیا۔ نُعمان نے کہا یہ سب شاعرانہ تفریح تھی، میں نے شراب سونگھی تک نہیں، ان اشعار سے بیوی کا اُکسانا مقصود تھا۔ حضرت عمر نے عذر قبول کیا مگر نُعمان کو پھر کبھی کوئی منصب نہیں دیا معزولی کے خط کا مضمون یہ تھا:-

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔حم تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم غافر الذنب وقابل التوب شدید العقاب ذی الطول، واضح ہو کہ تمہاری وہ نظم جس کا ایک شعر ہے:- لعل امیر المؤمنین یسوءہ تنادمنا فی الجوسق المتھدم - میں نے سُنی - بلا شبہ مجھے تمہارے یہ شعر بہت بُرے لگے اور میں تم کو معزول کرتا ہوں۔"[1]

۱۰۱ اہواز کے سالاروں کے نام

صوبۂ اہواز کی حد مشرق میں صوبۂ فارس سے ملتی تھی اور شمال میں صوبۂ جبال سے جس کے مغربی شہر نہاوند میں ایرانی فوجیں جمع ہو رہی تھیں۔ فارس سے نہاوند جانے کے کئی

---

[1] استیعاب حاشیہ اصابہ ۱۳۲۸ھ ۳/۵۴۲، ازالۃ الخفاء ۲/۷۳، کنز العمال، ۲/۱۷۵ معجم البلدان یاقوت، مصر ۸/۲۲۸، فتوح البلدان، مصر، ص۳۹۳۔

راستے اہواز سے ہو کر گذرتے تھے اور ایک بڑی شاہ راہ براہ راست جبال کے شہر جَیّ (اصفہان) سے ہو کر جاتی تھی۔ حضرت عمر نے نہاوند کی مہم کے لئے جو قدم اٹھائے ان میں ایک یہ تھا کہ انھوں نے اہواز کے سرحدی سالاروں کو مراسلے بھیجے کہ سرحد پر مسلح چوکیاں بنالیں اور فارس سے نہاوند کو کمک نہ جانے دیں۔ خطوں کا مضمون یہ تھا :-

"اہلِ فارس کو اپنے بھائیوں کے خلاف نہاوند میں مدد کرنے سے باز رکھو۔ اور اس طرح اپنی قوم اور اراضی کی حفاظت کرو۔ فارس اور اہواز کی سرحد پر ڈٹے رہو حتیٰ کہ میں نئی ہدایات بھیجوں۔" [1]

۱۰۲ عبداللہ بن مسعود کے نام

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا عبداللہ بن مسعود کے ذمہ خزانہ کی نگرانی اور اہلِ کوفہ کو تعلیم قرآن کا کام سونپا گیا تھا۔ ابن مسعود کوفہ کی جامع مسجد میں بیٹھ کر قرآن خوانی اور قرآن فہمی کا درس دیتے تھے، اس کے علاوہ جو مسئلے ان سے پوچھے جاتے ان کا جواب قرآن کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے پیش کرتے تھے، حدیث کی طرف بہت کم رجوع کرتے تھے، اُن کے حلقہ سے کئی مشہور عالم نکلے جن کے ہاتھوں بعد میں کوفہ کا "مدرسۂ اجتہاد" پروان چڑھا۔ ذیل کے خط کی شانِ نزول یہ ہے کہ حضرت عمر نے ایک شخص کو قرآن کے الفاظ ۔ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ کو لَيَسْجُنُنَّهٗ عَتّٰى حِيْنٍ ، پڑھتے سنا، دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ مجھے عبداللہ بن مسعود نے اسی طرح پڑھایا ہے۔ ابن مسعود کی پیدائش اور پرورش قبیلہ ہُذیل میں ہوئی تھی، ہُذیل اور قریش کی عربی میں جزوی اختلاف تھا، مثلاً ایک اختلاف یہ تھا کہ وہاں کے لوگ لَيَسْجُنُنَّهٗ کو لَيَسْجُنُنَّهٗ پڑھتے تھے۔ حضرت عمر کو یہ بات کھٹکی اور گو کہ رسول اللہ نے اپنی زندگی میں اس نوع کے

---

[1] سیف بن عمر طبری ۴/۲۳۹

اختلاف کو گوارا کر لیا تھا، حضرت عمر جیسا کہ خط سے ظاہر ہے اختلافِ قراءۃ کو ناپسند کرتے تھے،
اُن کی خواہش تھی کہ سب مسلمان قرآن کو اُسی طرح پڑھیں جس طرح قریش کے لوگ پڑھتے تھے،
کیوں کہ مکہ اور مدینہ کی عربی سب قبیلوں کی عربی سے زیادہ نکھری اور ستھری خیال کی جاتی تھی۔
چنانچہ انھوں نے ابن مسعود کو لکھا:۔

"سلام علیک۔ خدا نے قرآن فصیح اور صاف عربی میں نازل کیا ہے اور یہ وہ عربی ہے جو قریش کے لوگ بولتے ہیں۔ میرا خط پاکر تم لوگوں کو قریش کی فصیح عربی میں قرآن پڑھاؤ اور ہُذیل کی عربی میں قرآن نہ پڑھاؤ۔"[1]

۱۰۳ عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان کے نام

سیف بن عمر کی رائے میں اہواز کے شہر سُوس، رام ہُرمُز، تستر اور جندی سابُور پر مسلمانوں کا قبضہ ۱۷ھ میں ہوا، لیکن کچھ دوسرے مورخ کہتے ہیں کہ یہ شہر ۱۹ھ سے ۲۰ھ تک مسلمانوں کے قبضہ میں آئے اور "تاریخ کے تقابلی مطالعہ سے یہی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے جیسا کہ ہم اوپر پڑھ چکے ہیں ہُرمُزان اہواز کا حاکم تھا اور اس کے صوبہ کا جنوبی حصہ مسلمانوں نے ۱۶ھ میں فتح کر لیا تھا۔ ۱۷ھ میں اس نے تابِ مقابلہ نہ لاکر اپنے باقی علاقہ کے لئے جو تُستر، جُندی سابور، رامُہرمز، سُوس اور مہرجانقذق پر مشتمل تھا سمجھوتہ کر لیا۔ جب اس سمجھوتہ کی خبر شاہِ ایران یزدجرد کو ہوئی جو اس وقت رَیّ اور بقول بعض مرو میں جنگی منصوبے بنا رہا تھا، تو اس کو بہت صدمہ ہوا اور اس نے صوبۂ فارس کے گورنر شہرک اور وہاں کے دوسرے فوجی منصب داروں کو لکھا: معلوم ہوتا ہے تم اپنے شاندار مذہب کو خیرباد کہہ چکے ہو، تم نے عربوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ انھوں

---

[1] ازالۃ الخفاء، بریلی ۱/۱۹۷، وکنز العمال متقی برہان پوری حیدر آباد ۱/۲۸۴ [2] ناسخ التواریخ ۴/۲۱۱ عبداللہ بن عبداللہ بن اُبَیّ۔

نے سواد پر قبضہ کیا پھر مدائن پر، اور تم نے کوئی خبر نہ لی، پھر جب وہ اہواز کی طرف مائل ہوئے تب بھی تم نے ہرمزان کی مدد نہیں کی، اور اس کو مجبوراً سمجھوتہ کرنا پڑا۔ یہی نہیں اِن عربوں نے خود تمھاری زمین پر حملہ کیا (یہ علاء حضرمی کی فارس پر فوج کشی کی طرف اشارہ ہے) اور تم ایسے بے خبر رہے کہ وہ صحیح سلامت تمھارے ملک سے بچ نکلے، اب غیرت و حمیت سے کام لو اور ہرمزان کی مدد کے لئے سپاہی اور جانور بھیجو، تاکہ وہ جنگ کے لئے مستعد ہو سکے اور اہواز کو عربوں کے پنجے سے نکالے۔"

دوسرا خط ہرمزان کو لکھا جس میں تھا کہ میں نے فارس کے گورنر شہرک کو فرمان بھیجا ہے کہ ایک لشکر تمہاری مدد کو لے کر جائے۔ خاطر جمع رکھو اور جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔" (ناسخ التواریخ ۲۶۷/۴) اس کے علاوہ یزدجرد نے براہِ راست اہواز کے مفتوحہ شہروں کو خفیہ سفارتیں بھیجیں اور سارے علاقہ میں بغاوت کی رو دوڑا دی، یہاں کے کئی شہر پہلے بھی عہد شکنی کر چکے تھے۔ ۲۰ھ میں تُستَر کے نہایت مستحکم شہر کا محاصرہ ہوا، فارسیوں کی طرف سے ہرمزان خود جنگ کی قیادت کر رہا تھا۔ بڑا سخت معرکہ تھا، قلعہ بند فوجیں جب چاہتیں نکلتیں اور خون کی ہولی کھیل کر پھر قلعہ بند ہو جاتیں، اس کے علاوہ ہرمزان نے یزدجرد سے جو اس وقت نہاوند میں ہونے والی جنگ کا انتظام کر رہا تھا چالیس ہزار فوجیں بطور کمک منگوالی تھیں (اعثم ص۵۹ و ناسخ التواریخ ۲۷۰/۴) جب محاصرہ کو کئی مہینے گذر گئے اور مسلمان پڑے پڑے اُکتا گئے تو ایک فارسی کی رہبری سے قلعہ فتح ہوا۔ ہرمزان قریب کے ایک دوسرے پہاڑی قلعے میں چلا گیا اور اس شرط سے سپر ڈالنے کو تیار ہوا کہ اس کی قسمت کا فیصلہ حضرت عمر کریں۔ شرط مان لی گئی اور ایک وفد جس میں احنف بن قیس تھے، ہُرمزان اور خُمس لے کر مدینہ روانہ ہوا۔ اہواز کی کئی بغاوتوں اور ہرمزان کی دوبار عہد شکنی سے حضرت عمر کو یہ شبہ تھا کہ مسلمان عُمّال اہل معاہدہ سے بدسلوکی کرتے ہوں گے۔ چنانچہ انھوں نے وفد کے ارکان سے کہا: "مجھے ایسا محسوس ہوتا

ہے کہ مسلمان ذمیوں کے ساتھ ظلم کرتے ہیں جس سے وہ بغاوت پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔" وفد کے سربرآوردہ ارکان بولے: جہاں تک ہمیں معلوم ہے مسلمانوں کا سلوک ذمیوں کے ساتھ اچھا ہے۔" حضرت عمر: پھر یہ بغاوتیں کیوں ہوتی ہیں؟" اس سوال کے جواب دئے گئے جن سے حضرت عمر کو تشفی نہیں ہوئی، تب دانائے عرب احنف بن قیس نے کہا: امیرالمومنین آپ نے ایران میں پیش قدمی سے ہم کو باز رکھا ہے، آپ کا فرمان ہے کہ جتنا علاقہ ہمارے پاس ہے اسی پر اکتفا کریں، بات یہ ہے کہ شاہ ایران زندہ ہے، اور اپنی قوم کے درمیان موجود ہے، جب تک وہ اپنے ملک میں ہے، ایران کے باشندے برابر ہمارے ساتھ برسرپیکار رہیں گے، کیوں کہ جب کسی ملک میں دو[2] حریف بادشاہ ہوتے ہیں تو وہ ایک دوسرے سے لڑتے ہیں حتیٰ کہ ان میں سے ایک فریق دوسرے کو نکال دیتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم کو یکے بعد دیگرے جو فتوحات حاصل ہوئی ہیں وہ اپنے جارحانہ حملوں سے نہیں بلکہ ایرانیوں کے حملوں یا عہد شکنیوں کی بدولت ہوئی ہیں۔ اہل ایران کو عہد شکنی پر ابھارنے والا ان کا بادشاہ ہے اور وہ برابر ایسا کرتے رہیں گے الا یہ کہ آپ ہم کو ان کے ملک میں پیش قدمی کی اجازت دیں۔ اگر آپ نے اجازت دی تو ہم شاہ کو اس کی کشور اور اس کی قوم کی قوت وعظمت کے حصار سے باہر نکال دیں گے، پھر ایرانیوں کی امیدیں ٹوٹ جائیں گی اور ان کے دل میں ایسی مایوسی گھر کرے گی کہ آئندہ کبھی بغاوت کی جرأت نہ کریں گے۔" حضرت عمر ان پرمغز باتوں سے بہت متاثر ہوئے اور کہا: تمہارا خیال واقعی صحیح ہے؟ ابھی وہ تجویز "پیش قدمی" پر غور کر رہے تھے کہ خبر آئی کہ یزدجرد کی فوجیں نہاوند میں جمع ہو رہی ہیں اور کچھ عراق کے سرحدی شہروں کی طرف بڑھ آئی ہیں۔ حضرت عمر کی ساری توجہ اس نئے خطرہ کی طرف مرکوز ہوگئی۔ نہاوند کی انتہائی سخت جنگ سے فارغ ہونے کے بعد حضرت عمر نے محسوس کیا کہ احنف کی بتائی ہوئی پیش قدمی کی تجویز پر عمل کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اہواز میں جو بغاوتیں ہوتی رہیں ان کے علاوہ یزدجرد ۱۴ھ سے لے کر ۲۱ھ تک ہر دوسرے سال یورش کرتا رہا تھا، اور جب نہاوند کے بعد دو[2] تازہ

بغاوتیں دینور اور ہمذان کے لوگوں نے معاہدے توڑ کر کیں تو حضرت عمر نے بلا تاخیر پیش قدمی کی کارروائی شروع کر دی۔ ایران میں چار نئے محاذ مقرر کئے اور ان پر الگ الگ سالاروں کے تحت بصرہ اور کوفہ سے فوجیں بھیجیں۔ ان میں سے ایک سالار عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان تھے جن کے بارے میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ (بقول سیف بن عمر) سعد نے کوفہ سے جاتے وقت ان کو اپنا جانشین بنایا تھا اور حضرت عمر نے ان کو گورنری پر بحال رکھا تھا۔ عبداللہ ممتاز انصاری صحابی تھے اور جنگی پینتروں میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ نہاوند کی لڑائی ان کے عہد گورنری میں ہوئی، فتح نہاوند نیز دینور اور ہمذان کی بغاوت کے بعد "جارحانہ پیش قدمی" کی اسکیم پر عمل شروع ہوا تو حضرت عمر نے ان کو اصبہان کے محاذ کے لئے نامزد کیا اور زیاد بن حنظلہ کو جو سعد کے عہد میں شہر کے قاضی تھے گورنر مقرر کیا۔ ساتھ ہی انھوں نے بصرہ کے گورنر ابو موسیٰ اشعری کو لکھا کہ ایک فوج لے کر اہواز کی راہ سے اصبہان کی طرف بڑھو اور ابن عتبان کی فوجوں سے مل جاؤ۔ اصبہان وسط ایران میں ایک اہم تمدنی و تجارتی مرکز تھا جہاں سے ہو کر کئی بڑی سڑکیں ملک کے مختلف صوبوں کو جاتی تھیں۔ ابن عتبان کو حضرت عمر نے جو خط لکھا اس کا مضمون سیف بن عمر نے یہ بیان کیا ہے :-

"کوفہ سے مدائن کا رخ کرو اور وہاں پہنچ کر مسلمانوں کو جنگ پر جانے کی دعوت دو۔ جو لوگ برضا و رغبت تمھارے ساتھ جانے کو تیار ہوں ان کو ساتھ لے لو اور مجھے صورتِ حال سے مطلع کرو۔"

۱۰۴ عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان کے نام

ابن عتبان نے اس فرمان کے مطابق عمل کیا اور مدائن جا کر لوگوں کو جنگ کے لئے چلنے کی دعوت دی۔ جن لوگوں نے ان کی دعوت پر لبیک کہا ان میں قبائلی لیڈر عبداللہ بن ورقاء

ریاحی اور عبداللہ بن حارث بن ورقاء اسدی بھی تھے۔ عبداللہ نے مدائن پہنچکر صورت حال سے مرکز کو مطلع کیا تو یہ خط موصول ہوا:۔

"مدائن سے اصبہان کا رُخ کرو، تمھارے مقدمہ کے لیڈر عبداللہ بن ورقاء ریاحی ہوں اور میمنہ و میسرہ کی قیادت عبداللہ بن ورقاء اَسدی اور عصمۃ بن عبداللہ کے ہاتھ میں ہو۔"

۱۰۵ عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان کے نام

ابن عتبان مدائن سے نہاوند پہنچے اور وہاں کی حفاظتی فوج سے جو لوگ ان کی ہمراہی کو تیار ہوئے ان کو لے کر اصبہان روانہ ہوئے۔ اصبہان کے مضافاتی شہروں اور قصبوں نے معمولی مقابلہ کے بعد سمجھوتے کرلئے، پھر اصبہان کے دارالحکومت جَیّ[1] کا محاصرہ ہوا اور یہاں بھی کسی بڑی جنگ کے بغیر سمجھوتہ ہوگیا۔ ابوموسیٰ اشعری حسب ابن عتبان سے ملے تو اس وقت جیؔ اور اس کا مضافاتی علاقہ فتح ہوچکا تھا۔ ابن عتبان نے مرکز کو فتح کی خبر دی تو یہ فرمان آیا:۔

"اب تم کرمان کا رُخ کرو اور سُہَیل بن عَدِیّ سے جا ملو جن کو کِرمان کے محاذ پر بھیجا گیا ہے۔ جَیّ میں ایک محافظتی فوج چھوڑ دو اور اصبہان پر سائب بن اقرع کو محصِّلِ خراج مقرر کرو۔"[2]

---

[1] اسلامی فتوحات کے وقت اصبہان ایک صوبہ تھا جس کی لمبائی یاقوت نے دو سو چالیس میل (؟) اور اسی قدر چوڑائی بتائی ہے۔ اس میں سولہ رستاق (قصبے) تھے اور ہر رستاق تین سو گاؤں پر مشتمل تھا۔ جَیّ اس کا دارالحکومت تھا اور ایک مستحکم فصیل اس کے گرد تھی۔ معجم البلدان یاقوت مصر ۱/۲۷۰-۲۷۲

[2] سیف بن عمر طبری ۴/۲۴۸

۱۰۶ نُعَیم بن مُقرّن کے نام

یہ نُعمان بن مُقرّن کے بھائی ہیں جو نہاوند کی فوجوں کے سالار اعلیٰ تھے۔ جنگ نہاوند کے بعد شکست خوردہ ایرانیوں کے تعاقب میں نُعیم بن مقرن اور قعقاع بن عمر کو بھیجا گیا۔ ان کا گذر ہمذان کے ضلع سے ہوا تو وہاں کے حاکم نے ایک سمجھوتہ کر لیا۔ جب یہ دونوں افسر نہاوند واپس آئے تو ہمذان کے حاکم نے سمجھوتہ توڑ دیا۔ اسی زمانہ میں حضرت عمر نے "پیش قدمی" کی مہم شروع کی اور مدینہ سے بصرہ اور کوفہ کے سالاروں کو ایران کے مختلف محاذوں کے لئے جھنڈے بھیجے تو ایک جھنڈا نعیم بن مقرن کو بھی دیا گیا ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ ہمذان کو واگذار کر کے شمال مغرب کے شہروں پر چڑھائی کریں۔ سیف بن عمر نے حضرت عمر کا یہ خط بلفظہٖ خط نعیم کے نام نقل کیا ہے:۔

"نہاوند سے یلغار کر کے ہمذان پہنچو، تمہارے مقدمۃ الجیش کی کمان سُوید بن مقرن (نُعیم کے بھائی) کے ہاتھ میں ہو اور میمنہ و میسرہ کے سالار علی الترتیب رِبعی بن عامر تمیمی اور مُہلہل بن زید طائی ہوں۔"[1]

۱۰۷ نُعیم بن مُقرّن کے نام

سنہ ۲۲ھ میں جب ہمذان اور اس کا مضافاتی علاقہ مسخر کر کے نُعیم انتظامی معاملات میں مصروف تھے، دَیلم (گیلان) اور آذربیجان کے حاکموں نے مشترکہ خطرہ کے مقابلہ کے لئے ایک سمجھوتہ کیا اور رواج روذ کے مقام پر فوجیں لے کر جمع ہوئے۔ نعیم اپنا ایک جانشین ہمذان

[1] سیف بن عمر طبری ۴/ ۲۵۱

میں چھوڑ کر واج رود[1] پہنچے۔ وہاں دونوں فریقوں میں سخت جنگ ہوئی جو بقول سیف نہاوند کے معرکہ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ آخر میں نُعیم فتح یاب ہوئے۔ جب فتح کی خبر حضرت عمر کو ہوئی تو انھوں نے نُعیم کو یہ خط لکھا :۔

"ہمذان پر اپنا ایک نائب مقرر کرو اور سماک بن خرشہ کی قیادت میں بُکیر بن عبداللہ کو کمک بھیجو (یہ "پیش قدمی" کے منصوبہ کے تحت آذربیجان کے محاذ پر بھیجے گئے تھے)۔ تم خود ری کی طرف یلغار کرو اور جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد وہیں قیام کرو کیوں کہ ری (شمالی ایران) میں ایک مرکزی جگہ ہے اور وہاں ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں۔"[2]

۱۰۸۔ اس خط کا دوسرا نسخہ :۔

"اپنی صوابدید سے کسی کو ہمذان میں اپنا نائب مقرر کرو اور خود ری کی طرف روانہ ہو۔ سماک بن خرشہ کو ایک فوج دے کر آذربیجان فتح کرنے بھیجو۔"[3]

۱۰۹ نُعیم بن مُقرّن کے نام

ری کا حاکم بہرام چوبین کا پوتا سیاوخش تھا۔ عربوں سے صف آرا ہونے کے لئے اس نے دُنباوند، طبرستان، قومس اور جرجان سے مدد طلب کی۔ کمانڈر ان چیف زینبی ابو فرخان کو سیاوخش سے چھپی عداوت تھی۔ وہ نعیم سے آملا۔ ری کے باہر پہاڑ کے دامن میں دونوں فوجیں اُتریں۔ زینبی کی ایک چال سے مسلمانوں کو آسانی سے فتح نصیب ہوئی۔ اس تعاون کے صلہ میں نُعیم نے ری کی منصب داری زینبی کو دے دی۔ ری کی فتح کا حال جب حضرت عمر کو معلوم

---

[1] ہمذان اور قزوین کے وسط میں ایک جگہ کا نام تھا۔ یاقوت ۸/ ۳۷۰ [2] سیف بن عمر، طبری، ۴/ ۲۵۲

ہوا تو انھوں نے نعیم کو یہ خط لکھا :-

"سوید بن مُقرّن کو ایک فوج دے کر قومس تسخیر کرنے بھیجو، اُن کے مقدمۃ الجیش کے لیڈر سماک بن مخرمہ اور میمنہ اور میسرہ کے سالار علی الترتیب عتیبہ بن نہاس اور ہند بن عمرو جملی ہوں۔"[1]

۱۱۰- اس خط کا دوسرا نسخہ :-

"چوں کہ بھاگی ہوئی فارسی فوجوں کا کوئی سالار نہیں ہے، اس لیے ان کا قصہ پاک کرنا بہت آسان ہے تم خود رَیّ میں مقیم رہو اور اپنے بھائی سُوید بن مُقرّن کو دامغان بھیجو اور اُن کو تاکید کرو کہ جب قومس فتح ہو جائے تو بھاگی ہوئی عجمی فوجوں کا جہاں تک تعاقب ممکن ہو کریں۔"

یہاں بھاگی ہوئی عجمی فوجوں، کے اشارہ کی وضاحت ضروری ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر پڑھا زینبی نے ایک چال چلی تھی اور وہ یہ کہ اس نے نعیم بن مقرن سے کہا کہ سیاوخش کی فوجیں آپ کے مقابلہ میں اتنی زیادہ ہیں کہ کھلے میدان میں ان سے مقابل ہونا آداب دانش کے خلاف ہے میری رائے ہے کہ آپ دس ہزار فوج مجھے دیں اور باقی سے سیاوخش کے ساتھ رزم آرا ہوں، میں ایک چھپے راستہ سے جا کر شہر پر قبضہ کر لوں گا۔ جب جنگ کی آگ خوب بھڑک گئی تو زینبی ایک پہاڑی راستہ سے شہر میں اُترا اور پیچھے پیچھے اس کی فوج تھی۔ شہر میں آکر فوج نے تلواریں سونت لیں۔ ایک قیامت برپا ہو گئی، لوگ بھاگ کر سیاوخش کے پاس گئے اور حالات سے مطلع کیا۔ اس کی فوج بال بچوں کو بچانے بدحواس ہو کر شہر کی طرف بھاگی تو سامنے زینبی کی فوج اور پیچھے نعیم کے رسالے تھے اس نرغہ میں پھنس کر بہت سے فوجی مارے گئے اور ان کی ایک خاصی تعداد بھاگ کر قومس کے صدر مقام دامغان میں پناہ گیر ہوئی، اس بھاگی ہوئی فوج کے لیڈر سارے کے سارے کھیت رہے تھے اور یہ قیادت سے محروم ہو کر کچھ ایسے حیران و پریشان تھے جیسے بے نگہبان کا گلہ۔ یہ تفصیلات ناسخ التواریخ میں بیان ہوئی ہیں۔[2]

[1] سیف بن عمر طبری ۴/۲۵۴ [2] ناسخ التواریخ ۴/۱۶ام - ۱۷ام

تصحیح

"حضرت عمر کے سرکاری خطوط" کی اشاعت ماہ مارچ ۵۶ء میں صـ۱۲۲ پر آٹھویں سطر کے بعد یہ عبارت کتابت ہونے سے رہ گئی ہے

"اور عثمان بن حنیف کو فرات سے الخ"

کتبہ مارگلہ[1]

از

(جناب لیفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب جہلم، پاکستان)

شاہراہِ سوری (اصلی) (G. T. ROAD) کا کچھ حصہ ابھی تک دیکھنے میں آتا ہے۔ یوں تو تمام ہی سڑک کلکتہ سے پشاور تک شاہراہِ سوری کہی جاتی ہے مگر اس کی اصل ساخت جو مغلوں کے وقت تک تھی صرف ایک ہی مقام پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اور یہ جگہ جہاں اصل سڑک آج تک موجود ہے نکلسن کی یادگار کے عقب میں ہے۔ NICHOLSON'S MONUMENT درۂ مارگلہ پر واقع ہے اور دور سے نظر آتا ہے، یہ ایک لاٹھ کی مانند ہے جو جنرل نکلسن کی یادگار میں بنائی گئی۔ اس کے عقب میں جنوب مغرب کی طرف، موجودہ جی ٹی روڈ سے ہٹ کر پرانی سڑک کا ایک ٹکڑہ پہاڑوں کے دامن کی طرف نکل جاتا ہے اور کچھ بلندی سے ہوتا ہوا پہاڑ کا چکر کاٹتا ہوا موجودہ سڑک کی طرف جاتا نظر آتا ہے، اس مقام پر اصل شاہ راہِ سوری کا رُخ یہی تھا۔ موجودہ سڑک اس علاقے میں انگریزوں نے پہاڑ کاٹ کر بنائی تھی۔ یہ حصہ سڑک مختصر

---

[1] راولپنڈی سے ٹیکسلا جاتے ہوئے ۱۶ میل کے فاصلے پر دو پہاڑوں کے درمیان ایک درّہ ہے جس کو زمانۂ قدیم سے مارگلہ کہا جاتا ہے۔ ہمارے ابتدائی مورخوں نے (غلطی) اسے معاقِل لکھا ہے۔ یہ لفظ یونانی الاصل معلوم ہوتا ہے۔ بصرہ (اعراق) کی بندرگاہ کے قریب ہی جہاں آج کل ان کے بحری دفاتر ہیں، اس نام کا ایک علاقہ ہے جس کو مارگِل کہا جاتا ہے اور عرب اسے معقِل کہتے ہیں۔ یہ درّہ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اسے تاریخ یمینی میں حصینۃ المعاقِل کہا گیا ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ یہ علاقہ بھی اسکندرِ اعظم کے حملوں کے وقت اس نام سے پکارا گیا۔ اور ممکن ہے کہ معقِل کا مقام جو بصرہ میں ہے اور یہ معاقل ہم عصر نام ہوں۔ عربوں یا مسلمانوں نے بعد میں ان کو معاقل اور معقل بنا دیا ہو۔ یہ لفظ دفاعی اصطلاح ہے اور اس کا مطلب رکاوٹ کے مترادف ہے۔

ہوا تو انھوں نے نعیم کو یہ خط لکھا :-

"سُوید بن مُقرّن کو ایک فوج دے کر قُومس تسخیر کرنے بھیجو، اُن کے مقدمۃ الجیش کے لیڈر سماک بن مخرمہ اور میمنہ اور میسرہ کے سالار علی الترتیب عتیبہ بن نہاس اور ہند بن عمرو جملی ہوں"[1]

۱۱۰- اس خط کا دوسرا نسخہ :-

"چوں کہ بھاگی ہوئی فارسی فوجوں کا کوئی سالار نہیں ہے، اس لیے ان کا قصہ پاک کرنا بہت آسان ہے تم خود رَیّ میں مقیم رہو اور اپنے بھائی سُوید بن مُقرّن کو دامغان بھیجو اور اُن کو تاکید کرو کہ جب قُومس فتح ہو جائے تو بھاگی ہوئی عجمی فوجوں کا جہاں تک تعاقب ممکن ہو کریں"

یہاں بھاگی ہوئی عجمی فوجوں، کے اشارہ کی وضاحت ضروری ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر پڑھا زینبی نے ایک چال چلی تھی اور وہ یہ کہ اس نے نعیم بن مقرن سے کہا کہ سیاوخش کی فوجیں آپ کے مقابلہ میں اتنی زیادہ ہیں کہ کھلے میدان میں ان سے مقابل ہونا آداب دانش کے خلاف ہے میری رائے ہے کہ آپ دس ہزار فوج مجھے دیں اور باقی سے سیاوخش کے ساتھ رزم آرا ہوں، میں ایک چھپے راستہ سے جا کر شہر پر قبضہ کر لوں گا۔ جب جنگ کی آگ خوب بھڑک گئی تو زینبی ایک پہاڑی راستہ سے شہر میں اترا اور پیچھے پیچھے اس کی فوج تھی۔ شہر میں آکر فوج نے تلواریں سونت لیں۔ ایک قیامت برپا ہو گئی، لوگ بھاگ کر سیاوخش کے پاس گئے اور حالات سے مطلع کیا۔ اس کی فوج بال بچوں کو بچانے بدحواس ہو کر شہر کی طرف بھاگی تو سامنے زینبی کی فوج اور پیچھے نعیم کے رسالے تھے اس نرغہ میں پھنس کر بہت سے فوجی مارے گئے اور ان کی ایک خاصی تعداد بھاگ کر قومس کے صدر مقام دامغان میں پناہ گیر ہوئی، اس بھاگی ہوئی فوج کے لیڈر سارے کے سارے کھیت رہے تھے اور یہ قیادت سے محروم ہو کر کچھ ایسے حیران و پریشان تھے جیسے بے نگہبان کا گلہ۔ یہ تفصیلات ناسخ التواریخ میں بیان ہوئی ہیں۔[2]

---

[1] سیف بن عمر طبری ۴/۲۵۴ [2] ناسخ التواریخ ۴/۱۶ا - ۱۷ا

تصحیح

"حضرت عمر کے سرکاری خطوط" کی اشاعت ماہ مارچ ۵۶ء میں صفحہ ۱۴۲ پر آٹھویں سطر کے بعد یہ عبارت کتابت ہونے سے رہ گئی ہے

"اور عثمان بن حنیف کو فرات سے الخ"

کتبہ مارگلہ[1]

از

(جناب لیفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب جہلم، پاکستان)

شاہراہِ سوری (اصلی) (G. T. ROAD) کا کچھ حصّہ ابھی تک دیکھنے میں آتا ہے۔
یوں تو تمام ہی سڑک کلکتہ سے پشاور تک شاہراہِ سوری کہی جاتی ہے مگر اس کی اصل ساخت جو مغلوں کے وقت تک تھی صرف ایک ہی مقام پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اور یہ جگہ جہاں اصل سڑک آج تک موجود ہے نکلسن کی یادگار کے عقب میں ہے NICHOLSON'S MONUMENT -
درۂ مارگلہ پر واقع ہے اور دور سے نظر آتا ہے یہ ایک لاٹھ کی مانند ہے جو جنرل نکلسن کی یادگار میں بنائی گئی۔ اس کے عقب میں جنوب مغرب کی طرف، موجودہ جی ٹی روڈ سے ہٹ کر پرانی سڑک کا ایک ٹکڑہ پہاڑوں کے دامن کی طرف نکل جاتا ہے اور کچھ بلندی سے ہوتا ہوا پہاڑ کا چکر کاٹتا ہوا موجودہ سڑک کی طرف جاتا نظر آتا ہے، اس مقام پر اصل شاہ راہِ سوری کا رُخ یہی تھا۔ موجودہ سڑک اس علاقے میں انگریزوں نے پہاڑ کاٹ کر بنائی تھی۔ یہ حصّۂ سڑک مختصر

---

[1] راولپنڈی سے ٹیکسلا جاتے ہوئے ۲۰ میل کے فاصلے پر دو پہاڑوں کے درمیان ایک درّہ ہے جس کو زمانۂ قدیم سے مارگلہ کہا جاتا ہے۔ ہمارے ابتدائی مورخوں نے (عتبی) اسے معاقل لکھا ہے۔ یہ لفظ یونانی الاصل معلوم ہوتا ہے۔ بصرہ (اعراق) کی بندرگاہ کے قریب ہی جہاں آج کل ان کے بحری دفاتر ہیں، اس نام کا ایک علاقہ ہے جس کو مارگل کہا جاتا ہے اور عرب اسے معقل کہتے ہیں۔ یہ درّہ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اسے تاریخ یمینی میں حصینۃ المعاقل کہا گیا ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ یہ علاقہ بھی اسکندر اعظم کے حملوں کے وقت اس نام سے پکارا گیا۔ اور ممکن ہے کہ معقل کا مقام جو بصرہ میں ہے اور یہ معاقل ہم عصر نام ہوں۔ عربوں یا مسلمانوں نے بعد میں ان کو معاقل اور معقل بنا دیا ہو۔ یہ لفظ دفاعی اصطلاح ہے اور اس کا مطلب روکاوٹ کے مترادف ہے۔

ہے مگر اس زمانے کی حالت بخوبی بیان کرتا ہے - جہاں سے یہ سڑک شروع ہوتی ہے وہاں دو مخروطی ستون جو چار فٹ بلند ہوں گے سڑک کے دونوں طرف موجود ہیں ، سڑک پہاڑ کو کاٹتی ہوئی قدرے بلندی سے ہو کر گذرتی ہے - سڑک کی سطح پر بڑے بڑے پتھر بڑی خوش سلوبی سے لگائے گئے ہیں - گویا سڑک کی سطح نہ صرف ہموار ہے بلکہ بڑی پختہ بھی ہے - سڑک کے اس حصہ کے دونوں طرف چار چار فٹ اونچی دیواریں بھی ہیں جن پر پتھر لگے ہیں ، یہ پتھر بھی مزید مضبوطی کے لئے لگائے گئے ہوں کہ اردگرد سے مٹی یا پتھر گر گر کر نیچے سڑک پر نہ آجائیں -

سڑک کے اس حصہ کے وسط میں جہاں یہ بلندی پر ہے ، دائیں جانب سڑک سے کوئی پندرہ[15] فٹ اوپر ایک چٹان میں ایک کتبہ فارسی زبان میں لگا ہوا ہے - یہ کتبہ جس پتھر پر کندہ ہے وہ ظِلنٹ کا (FLINT) ہے ، الفاظ اُبھرے ہوئے ہیں پتھر کے اندر کاٹ کر نہیں بنائے گئے ، یہ پتھر اس وقت لگایا گیا تھا جب کہ شاہ راہ سوری کی مرمت آخری مرتبہ مغلوں نے کی تھی - اس پر سالِ مرمت ۱۰۸۳ھ (؟) ہجری لکھا ہوا ہے -

اس کتبہ کو حل کرنے کی کوشش تین مرتبہ کی جا چکی ہے - سب سے پہلے گذشتہ صدی میں بلوخمین (BLOCHMANN) نے اسے ۱۸۷۱ء میں حل کیا اس کے بعد ۱۸۷۴ء میں ریہاٹسک (REHITSEK) نے ایک حل پیش کیا - اور اخیراً اس صدی میں یزدانی (YAZDANI) نے اپنا حل ۱۹۳۳ء میں پیش کیا - ان مستشرقین کا حاصلِ تحقیق مندرجہ ذیل رسائل میں شائع ہو چکا ہے

۱ - رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال جلد چالیس حصہ اول ص ۲۵۹

۲ - انڈین اینٹیکوٹیس جلد سوئم ص ۲۰۵

اور ۳ - ببلیوگرافیکا انڈو مسلیمکا ۳۴/۱۹۳۳ ص ۲۱[5]

ص ۱ 1- JASB VOL XL Part I Page 259
2- INDIAN ATIQVITIES VOL III Page 205
3- BIBLIOGRAPHICA INDO- MUSLIMCA 1933/34 Page 21

اِن اصحاب نے اپنا اپنا حل کاغذی عکس کی مدد سے کیا ہے (PAPER IMPRESSION) فوٹوگراف کی مدد سے نہیں کیا۔ کاغذی عکس کے لینے کا طریقہ یہ ہے کہ گیلا کاغذ کتبہ پر رکھ کر اُسے چسپاں کر دیا جاتا ہے اور باہر کی طرف کالی سیاہی لگادی جاتی ہے اس عمل سے حروف کاغذ پر منتقل ہو جاتے ہیں۔ ایسے عکس میں یہ نقص ہوتا ہے کہ بعینہٖ وہی چیز کاغذ پر منتقل ہوتی ہے جو پتھر پر نظر آتی ہے۔ اگر کوئی چیز جو بخوبی پتھر پر پڑھی نہیں جاسکتی وہ اس عکس پر بھی ظاہر نہیں ہوتی اور لبسا اوقات متعدد حروف اوران کی ساخت، خاص طور پر ایسے حروف جو مکمل نہ ہوں اور ٹوٹے ہوئے ہوں، وہ ظاہر نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس ایک فوٹوگراف کتبہ کے حل کے لئے بہت بہتر ثابت ہوتی ہے۔ اکثر اسے بڑا کرکے (ENLARGE) بہت کچھ زائد دیکھا جاسکتا ہے اور حروف کی ساخت بھی مکمل طور پر نظر آجاتی ہے۔

ہم نے ایک ایسا ہی فوٹوگراف اکتوبر ۱۹۵۲ء میں اُتارا تھا جس پر کام کرتے متواتر ڈیڑھ برس گذر چکا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہم نے چند ایک نتائج نکالے ہیں جن کا اس وقت قارئین کے سامنے پیش کرنا مقصود ہے۔ اس کتبے کی تاریخ میں یہ پہلا فوٹو ہے جو ہم نے لیا ہے، اس سے پیشتر کوئی حل بھی اس کتبے کا فوٹو کی مدد سے پیش نہیں گیا۔ اگرچہ ہم اپنی تحقیق کو مکمل نہیں کہہ سکتے تاہم اس میں کچھ اہم پہلو اُجاگر ہو گئے ہیں جو پہلے منظرِ عام پر نہ تھے۔ اس فوٹو سے کتبہ کے حروف و الفاظ عموماً بہتر پڑھے جاتے ہیں۔ اور چند ایک باتیں جو کاغذی عکس پر ظاہر نہ ہوئی تھیں اس میں مکمل طور پر ظاہر ہو گئی ہیں۔ پیشتر کہ ہم اپنا حل پیش کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ مستشرقین کے تمام حل یہاں لکھ دئے جائیں تاکہ قارئین ان سب کا مقابلہ کرکے دیکھ سکیں کہ جو نکات ہم نے تجویز کئے ہیں وہ کہاں تک وزن دار ہیں اور ان کی کتنی اہمیت ہے، ذیل میں جو حل پیش کئے جائیں گے وہ مندرجہ بالا حوالوں سے لئے گئے ہیں جو ہمیں محترم فضل قادر صاحب کے توسط سے حاصل ہوئے ہیں، فضل قادر صاحب محکمہ آثارِ قدیمہ پاکستان کے ایک بڑے افسر ہیں اور ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا ہے کہ جب بھی کبھی ہم نے ان سے کوئی حوالہ دریافت کیا

انھوں نے بڑی عجلت سے اسے فراہم کر دیا۔ آج کل کے زمانے میں کتابوں کا فراہم کر لینا بڑا مشکل ہے۔ کام یوں ہی چل سکتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس لائبریریاں ہوں وہ محققین کی مدد حوالے بہم پہنچا کر کرتے رہیں۔ یہ حتمی ہے کہ اگر یہ حوالے ہمیں نہ ملتے تو یہ مقالہ مکمل نہیں ہو سکتا تھا اب مختلف حل ملاحظہ فرمائیے :۔

(۱)　BLOCHMANN　(۱۸۷۱)　بلوخمین

مارگلہ

خان قوی پنجۂ مہابت شکوہ

شیر ز سر پنجۂ او ناتوان

گفت مغل رومی تاریخ شان

ناصیہ ہوش ہندوستان

باہتمام میرزا احمد داروغہ د . . . .

احمد معمار د استاد جوگیداس و دیبی داس

تحویلدار ۱۰۸۳ سنہ ہجری

(۲)　REHATSEK　(۱۸۷۴)　ریہاٹسک

ھو القادر

خان قوی پنجۂ مہابت شکوہ

شیر ز سر پنجۂ او ناتوان

در کتل مارگلہ آنکہ بود

باکرہ چرخ برین تو امان

ساخت چنان را روئے شرف
یومیہ دید چرخ ز در زمان
گفت مثل ازپی تاریخ سال
ناصیہ مہوش ہندوستان
باہام مرزا محمد داود داستان . . . .
حمد معمار و جوگیداس و شرف و دیالداس
تحویلدار ۱۰۸۱ھ مرمت شد

(۳) YAZDANI (۱۹۳۳) یزدانی

ہوالقادر

خان قوی پنجۂ مہابت شکوہ
شیر ز سر پنجۂ او ناتوان
در کتل مارگلہ آنکہ بود
باکرہ چرخ بریں تو امان
ساخت چنان شاہراہی شرف
. . . چرخ . . . بو زمان
گفت مغل درپیٔ تاریخ سال
ناصیہ مہوش ہندوستان
باہتمام میرزا محمد . . . داروغہ . . . .
احمد معمار و جوگیداس . . . شرف و دیالداس
تحویلدار ۱۰۸۳ھ مرتب شد

اس کتبہ کے تینوں حلقوں کا مقابلہ کرنے سے چند ایک باتیں سمجھ میں آتی ہیں

اوّلاً پہلے شعر سے پتہ چلتا ہے کہ مہابت خان کو اس کام پر مامور کیا گیا تھا کہ یہ مرمت کا کام اس کی زیرِ نگرانی تکمیل پائے۔

ثانیاً دوسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام مارگلہ میں مکمل ہوا۔

ثالثاً تیسرا شعر بتاتا ہے کہ یہ مرمت کا کام بحسن و خوبی سرانجام پایا۔

رابعاً آخری شعر میں کام کی تکمیل کی تاریخ ۱۰۸۳ھ (؟) نکالی گئی ہے جو کتبہ میں صاف نہیں۔

اور خاص طور پر قطعہ تاریخ کے نیچے تفصیلات میں چند لوگوں کے نام دئے گئے ہیں ان میں احمدؐ معمار، مرزا محمدؐ داروغہ، جوگی داس اور دیالداس قابلِ ذکر ہیں۔

ان میں احمدؐ معمار جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، تاج محل والا مشہور و معروف انجنیر ہے۔ جوگی داس اور دیالداس غالباً دو تحویلدار تھے جن کے ذمّے اس کام کی دیکھ بھال اور لوازمات مرمت کا بہم پہنچانا تھا، تحویلدار درحقیقت خزانچی کو کہتے ہیں۔ پہلے زمانے میں ٹھیکیداری کا کام بھی یہی لوگ کیا کرتے تھے، اور اپنی جیب سے خرچ کر کے سرکاری خزانے سے بعد میں اخراجات بل پیش کر کے وصول کرتے تھے۔ یہ تمام تفصیلات جن کا بالا میں ذکر کر دیا گیا ہے ہمیں اس قطعۂ تاریخ کے کتبے سے حاصل ہوئی ہیں۔ اس میں کچھ تفصیلات غور طلب ہیں۔ کیوں کہ جب ہم مآثرِ عالمگیری کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر حسن ابدال میں دوئم ربیع الاول ۱۰۸۵ھ ہجری کو وارد ہوتا ہے۔ حسن ابدال جیسا کہ معلوم ہے دّرہ مارگلہ سے دس میل پر واقع ہے، اور یقینی بات ہے، کہ اورنگ زیب کو حسن ابدال مقام پر پہنچنے کے لئے اس دّرہ مارگلہ ہی سے گذر کر جانا پڑا ہوگا، ممکن ہے کہ جاتے وقت اس نے اس جگہ پر سڑک کی حالت دگرگوں دیکھی ہو اور اس کی مرمت کا حکم دے دیا ہو۔ ہم اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ شاہی کیمپ میں چند ایک اور شخصیتیں بھی دیکھتے ہیں جن کا ذکر مصنف مآثرِ عالمگیری نے کیا ہے یہ مندرجہ ذیل لوگ تھے:-

(۱) مہابت خاں ستائیس ۲۷ رجب ۱۰۸۴ھ ہجری کو شاہی کیمپ میں شامل ہوتا ہے۔
(۲) تہل داس (۳) داروغہ شیخ عبدالعزیز اور (۴) لطف اللہ۔

اورنگ زیب عالمگیر کے ادھر آنے کا مقصد تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ افغانوں کی سرکوبی کے لئے آیا تھا جنھوں نے شجاعت علی خاں کو درۂ خیبر میں شکست دے کر پنجاب کے میدانوں کی طرف دھکیل دیا تھا اور جب اورنگ زیب افغانوں کو سبق سکھانے کی غرض سے شمال کی طرف بڑھتا ہے تو حسن ابدال میں آکر کیمپ کرتا ہے اور اس وقت اس کے ساتھ مندرجہ بالا اشخاص علاوہ دیگر لوگوں کے شامل ہوتے ہیں۔ لہذا حتمی بات ہے کہ ہمیں اس تاریخ کو قبول کرنے میں تردد ہو جو مستشرقین نے کتبہ سے حل کی ہے یعنی ۱۰۸۳ھ ہجری۔

آیئے ذرا ان شکوک کی روشنی میں اس تاریخی مادے پر ایک مرتبہ پھر غور کریں۔ اور دیکھیں کہ ہم اس تاریخ مرمت کا تطابق مآثر عالمگیری کے بیان کے ساتھ کس طرح کر سکتے ہیں۔ اگر کتبہ کے آخری مصرعہ تاریخ کو ہم بغور دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ اس مصرع "ناصیہ مہوش ہندوستان" میں "مہوش" کا لفظ مٹا ہوا ہے لیکن م اور ش کے حروف صاف پڑھے جاتے ہیں، میرے فوٹو سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ "مہوش" نہیں بلکہ "ماہ وش" ہے اور گذشتہ محققین کو پڑھنے میں اشتباہ ہوا ہے۔ قطعہ کے نیچے جو تفصیلات مندرج ہیں ان میں تاریخ کے ہندسے بھی پورے نہیں چنانچہ خود محققین میں سے کسی نے ۱۰۸۳ھ لکھا ہے اور کسی نے ۱۰۸۱ھ اگر ہم لفظ "مہوش" کو "ماہ وش" پڑھیں تو یہ بات پایۂ تصدیق کو پہنچ جاتی ہے کہ اصل مادۂ تاریخ یوں ہو گا ——— ناصیہ ماہ وش ہندوستان ——— جس کے اعداد پورے ۱۰۸۴ھ بنتے ہیں جو وہی سال ہے جب اورنگ زیب عالمگیر حسن ابدال میں وارد ہوا لفظ مہوش کو ماہ وش لکھنے سے مصرع کا وزن بدستور قائم رہتا ہے اور معانی میں بھی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ حرف الف کے اضافے سے اعدادِ تاریخ بھی پورے ہو جاتے ہیں جن میں ایک کی کمی پڑ رہی تھی۔

ہمارے والے فوٹوگراف سے چند ایک اور باتوں کا پتہ چلتا ہے اور وہ یہ ہیں کہ قطعہ کی سطریں

دو طرف پتھر کے کتبے کے کناروں تک چلی جاتی ہیں۔ مگر قطعے کے نیچے جو تفصیلات ہیں ان کی سطریں کناروں تک نہیں پہنچتیں بلکہ کناروں سے دور ہی بکھر جاتی ہیں اور اپنا فاصلہ بھی قائم نہیں رکھتیں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ کچھ الفاظ زمانے کی نامساعدت کی وجہ سے گر گئے ہیں۔ قطعہ کی آخری سطر جہاں مادۂ تاریخ دیا گیا ہے اور پہلی تفصیلات کی سطر کے درمیان فاصلہ زیادہ ہو گیا ہے اور اس میں کچھ سفید سے نشانات پائے جاتے ہیں جو حروف اور الفاظ کی مانند ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ایک پوری سطر گر چکی ہے۔ یہ باتیں کاغذی عکس پر نہیں منتقل کی جا سکتی تھیں اس لئے مستشرقین کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔ اب جو ہم نے اپنے فوٹو گراف پر غور کیا ہے تو یہ باتیں ہماری نگاہ میں آئی ہیں اس حقیقت پر ہم ابھی مفصل بحث کریں گے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس وقت جو کتبہ ہمارے پیشِ نظر ہے وہ مکمل حالت میں نہیں ہے۔ بہت سے الفاظ اور ایک مکمل سطر غائب ہو چکی ہے۔

قطعہ کے نیچے تفصیلات کی پہلی سطر کے اواخر میں لفظ داروغہ کے بعد (سے) اس قسم کی ایک شکل نظر آرہی ہے جو کہ ہماری نگاہ میں لفظ "شیخ" کا بالائی حصہ ہوگا۔ باقی لفظ گر چکا ہے۔ مآثرِ عالمگیری سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ داروغہ شیخ عبدالعزیز اورنگ زیب کے ہمراہ حسن ابدال میں آیا تھا اور ۱۰۸۵ھ میں حسن ابدال میں موجود تھا۔ ہماری نگاہ میں یہ بات ممکن معلوم ہوتی ہے کہ کتبہ میں نام اسی داروغہ شیخ عبدالعزیز کا ہو۔

ایک اور بات جو بڑی دلچسپ اس کتبے میں نظر آتی ہے وہ احمد معمار کا نام ہے جو اس تعمیر کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے احمد معمار نے ۱۰۵۹ھ ہجری میں وفات پائی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک بصیرت افروز مقالہ میں جو ادارہ معارف اسلامیہ کی ۱۹۳۳ء کی روداد میں شائع ہوا، لکھا ہے کہ ان کی وفات ۱۰۵۹ھ ہجری میں ہو گئی تھی اور اس کے ثبوت میں انھوں نے دو مصرعے تاریخ دیے ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) شد بفردوس احمدؐ معمار
۱۰۵۹ ہجری

محمود العاقبت شد احمد

۱۰۵۹ھ ہجری

اب تعجب کی بات یہ ہے کہ جب احمدؐ معمار کا انتقال ۱۰۵۹ھ ہجری میں ہو چکا تھا تو وہ ۱۰۸۴ھ میں مار گلہ کس طرح پہنچ گیا؟ ہمارے ذہن نے اس کا حل یوں پیش کیا ہے۔ مآثر عالمگیری سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب کے کیمپ میں ایک شخص لطف اللہ نامی بھی ۱۰۸۰ھ ہجری میں موجود تھا یا اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا سوائے لطف اللہ پسر احمدؐ معمار جن کے دو صاحبزادے اور بھی تھے بنام عطاء اللہ اور نور اللہ۔ استاد احمدؐ معمار کے تینوں صاحبزادے مہندس ہونے کے علاوہ علم ہیئت اور شعر و شاعری میں بھی بلند مقام رکھتے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ کام مار گلہ میں سڑک کی مرمت کا لطف اللہ نے ہی سر انجام دیا ہو۔ کتبہ میں احمدؐ معمار کے لفظ سے پہلے کچھ جگہ خالی پڑی ہے جس میں گرے ہوئے الفاظ کے نشانات موجود ہیں اور یہ ہمارے والے فوٹو سے بخوبی ظاہر ہے اس خلاء میں ہماری دانست کے مطابق دو اور الفاظ موجود تھے اور وہ یہ تھے

"پور استاد"

لطف اللہ کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے کو بسا اوقات پور استا احمدؐ معمار لکھتا تھا اور کبھی ابن استا احمدؐ معمار بھی لکھ دیتا تھا۔ چنانچہ اپنی ایک رباعی میں لطف اللہ لکھتا ہے: ع

منکہ ہستم فقیر لطف اللہ بمہندس شہیر در افواہ
خاکپائے ہنروران کبار پور استاد احمدؐ معمار

ہوشنگ غوری کا مقبرہ جو مانڈو میں ہے اس پر ایک کتبہ میں لطف اللہ نے اپنے آپ کو ابن استاد احمدؐ معمار لکھا ہے (ملاحظہ ہو سید سلیمان مرحوم کا محولہ بالا مقالہ)

اس لئے ہماری دانست میں لفظ احمدؐ معمار سے پہلے جو جگہ خالی ہے اس میں دو اور الفاظ پور استاد یا ابن استاد کا اضافہ ہونا چاہئے تاکہ ایک تو خالی جگہ پُر ہو جائے اور دوسرے تاریخ تعمیر کے ساتھ لطف اللہ کی موجودگی کا نطابق ہو جائے۔ ہم مکمل عبارت اپنے حل میں پیش کریں گے۔ یہ

بات نگاہ میں رکھنی چاہیئے کہ لطف اللہ سنہ ۱۰۸۴ھ میں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ حسن ابدال آیا اور مآثر عالمگیری اس کا ذکر کرتی ہے۔

اب اخیر میں ہم اپنا حل پیش کرتے ہیں جو ہم نے اپنے فوٹو گراف کی مدد سے نکالا ہے، خط کشیدہ الفاظ ہمارا اضافہ ہیں جو گذشتہ مستشرقین نے بیان نہیں کئے :۔

RASHID (۱۹۵۶) رشید

ھو القادر

خان قوی پنجہ جہابت شکوہ

شیر ز سر پنجہ او ناتواں

در کتل مارگلہ آنکہ بود

باکرہ چرخ بریں تو اماں

ساخت چناں راہ بروی شرف

کہ سر برد چرخ بر صد زماں

گشت مغل در پی تاریخ سال

ناصیہ ماہ وشس ہندوستان

(خالی سطر جہاں سے الفاظ گر چکے ہیں)

. . . .

باہتمام مولانا محمدؐ میاں و داروغہ شیخ [عبد العزیز]

[و پور استاد] احمدؐ معمار و جوگی داس . . . . .

. . . . و دیالداس تحویلدار سنہ ۱۰۸۴ھ

مرمت شد

۲۶

تزک بابری

از

(جناب محمد رحیم صاحب دہلوی)

(۷)

ملا بنائی اور محمد صالح سے ملاقات — ملا بنائی اور محمد صالح کو میں نے وہیں خواجہ کے ہمراہ دیکھا - محمد صالح سے تو میں وہیں ایک دفعہ ملا ہوں لیکن ملا بنائی بعد میں مرے ہاں بہت عرصہ رہا -

سمرقند سے ناکام واپسی — سلطان علی مرزا سے جو ملاقات ہوئی - اس کے بعد سردیاں شروع ہو گئیں - اس کے ساتھ ساتھ سمرقند والے بھی کیل کانٹے سے درست بیٹھے تھے - اس لئے میں اندجان واپس آگیا اور سلطان علی مرزا بخارا چلا گیا -

سمرقند کی بجائے دولھن مل گئی — سلطان مسعود مرزا عرصہ سے شیخ عبد اللہ برلاس کی لڑکی پر شیدا تھا - ان دونوں کی شادی ہوگئی - اور وہ سمرقند کا خیال چھوڑ چھاڑ حصار چلا گیا - دراصل مسعود مرزا کے آنے کی غرض یہی تھی -

مہدی اور حمزہ نے میرا ساتھ چھوڑ دیا — مہدی سلطان شیراز اور کنبائی کے نواح سے بھاگ کر سمرقند گیا اور حمزہ سلطان نے رامین[1] کے مقام پر اجازت لی اور سمرقند چل دیا -

۹۰۲ھ[2] کے حالات

سمرقند پر سلطان علی کی فوج کا حملہ — ان ہی سردیوں میں بائسنغر مرزا کے حالات اچھی خاصی ترقی پر تھے - سلطان علی مرزا کی طرف سے جب عبدالکریم اشرت[3] اس نواح[4] کو جھپٹنے آیا - تو مہدی سلطان ، بائسنغر مرزا کی

[1] رامین لکھا ہے لیکن اگر یہ رامیتن ہے تو وہ بخارا کے قریب ایک گاؤں ہے [2] ستمبر ۱۴۹۶ء
[3] اشرب [4] یعنی توفین اور اس کی نواح -

عمدہ فوج کو لے کر اسی وقت سمرقند سے نکلا اور فوراً اس کے سر پر جا دھمکا۔

مہدی سلطان نے میدان مارا عبد الکریم اشرت اور مہدی سلطان کا آمنا سامنا ہوا۔ دونوں میں تلوار چلی۔ شمشیر زنی شروع ہوتے ہی عبد الکریم کا گھوڑا اسے لے کر گرا۔ اس نے اٹھنا چاہا۔ لیکن مہدی سلطان نے تلوار کا ایک ایسا ہاتھ مارا۔ کہ عبد الکریم کا پہنچا کٹ گیا۔ مہدی سلطان نے اسے پکڑ لیا۔ اور اس کی فوج کو زبردست شکست دی۔

مہدی اور حمزہ وغیرہ نے شیبانی کی نوکری کرلی ان سلاطین نے محسوس کیا کہ سمرقند کے حالات بگڑتے جا رہے ہیں اور مرزاؤں کی سرکاریں ڈگمگا رہی ہیں۔ اس لئے انھوں نے دور اندیشی کی اور سب شیبانی خاں کے پاس چلے گئے۔

سلطان علی اور بائسنغر میدان جنگ میں سمرقند والوں کو جو ذرا سی کامیابی ہوئی تو وہ سلطان علی مرزا پر حملے کی تیاریاں کرنے لگے۔ بائسنغر مرزا سرپل کے مقام پر پہنچا۔ اور سلطان علی مرزا خواجہ کارزون پہنچ گیا۔

ابو المکارم وغیرہ کا بخارا پر حملہ یہی موقعہ تھا کہ خواجہ ابو المکارم اور اندجان کے امرا میں سے ویس لاغری، محمد باقر، میر قاسم دولدائی اور بائسنغر مرزا کے خاص ملازمین میں سے ایک جماعت خواجہ مراد شتی کے کھڑکانے سے بخارا پر چڑھ دوڑی۔

وہ سب شہر کے قریب پہنچے تو بخارا والوں کو خبر ہو گئی اور یہ ناکام و نامراد واپس آئے۔

میں پھر سمرقند کی طرف چلا میں اور سلطان علی مرزا جب آپس میں ملے تھے اس وقت یہ طے ہوا تھا کہ گرمی میں وہ بخارا سے اور میں اندجان سے پہنچوں گا اور ہم دونوں سمرقند کو گھیر لیں گے۔

اس وعدے کے سبب میں رمضان میں اندجان سے چلا۔ ٹھنڈے پہاڑوں کے قریب پہنچا تو خبر ملی کہ دونوں مرزا آمنے سامنے مقابلے پر پڑے ہیں۔ میں نے دو تین سو قزاق فوجیوں کے ساتھ تولون خواجہ مغل کو وہاں دھاوا بولنے بھیجا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچے۔ بائسنغر مرزا میرے آنے

ط شیبنی ـ مئی ۱۴۹۶ء ـ یار یلاق

کی خبر سن کر بڑی پریشانی اور بے سرو سامانی کی حالت میں واپس چلا گیا۔

شیراز کی فتح — میری وہ فوج اسی رات کو ندلان سے چلی۔ بہت سے مخالفین کو تیروں سے چھیدا۔ بہت سے گرفتار کرلئے اور لوٹ کا بہت سامال لے کر واپس آئی۔ میں ایک دو دن بعد شیراز کے قلعہ پر پہنچا۔ قاسم دول دائی شیراز پر قابض تھا۔ شیراز کا داروغہ اسے بچا نہ سکا اور میرے حوالے کر دیا۔ میں نے شیراز ابراہیم سارو کو دے دیا۔

تنبل وغیرہ میرے ملازم ہوگئے — دوسرے دن میں عید کی نماز پڑھ کر سمرقند روانہ ہوا۔ اور میدان میں خیمے ڈیرے ڈال کر جا اُترا۔ اسی دن قاسم دول دائی، ویس لاغری، حسن نبیرہ، سلطان محمد تنبل اور سلطان محمد ویس نے تین چار سو آدمیوں کے ساتھ آکر ملازمت حاصل کی۔ کہنے لگے بائسنغر مرزا کے فرار ہوتے ہی ہم اس سے الگ ہو کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔

لیکن معلوم یہ ہوا کہ یہ لوگ شیراز کو بچانے کا دعویٰ کر کے سلطان بائسنغر مرزا سے جدا ہوئے تھے۔ جب شیراز کا یہ حشر دیکھا تو عاجز ہونے کے بعد یہاں آگئے۔

مغلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا — میں جس وقت میدان میں جا اُترا۔ اس وقت ان مغلوں کو پکڑ لائے جنہوں نے خود سری سے ان بعض دیہات کو لوٹ لیا تھا جو رستے میں پڑے تھے۔ قاسم بیگ نے انتظام کے طور پر حکم دیا کہ ان میں سے دو تین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو۔

بعد میں قاسم بیگ کی جدائی کی وجہ — چار پانچ سال بعد جب مصیبت اور بے وطنی کا دور آیا اور میں مسیحا کے مقام سے خان کے پاس جانے لگا تو اسی واقعہ کے سبب قاسم بیگ کو مجھ سے جدا ہو کر حصار جانا پڑا۔

میرے صدر منصف کا انتقال — میدان سے چلے اور دریا سے اُتر کر یام کے قریب پہنچے۔

آج ہی بعض امراء بائسنغر مرزا کی فوج سے خیابان پر جا بھڑے۔ سلطان احمد تنبل کی گردن میں برچھا لگا۔ وہ بچ گیا۔ مگر خواجگی صدر منصف (خواجہ کلاں کے بڑے بھائی) کی گردن میں تیر لگا۔ وہ اسی وقت مر گیا۔

وہ بہت اچھا جوان تھا۔ میرے والد نے لطف و عنایت سے اس کو مہر دار کر دیا تھا۔ وہ صاحب علم

عمدہ فوج کو لے کر اسی وقت سمرقند سے نکلا اور فوراً اس کے سر پر جا دھمکا۔

مہدی سلطان نے میدان مارا

عبد الکریم اشرت اور مہدی سلطان کا آمنا سامنا ہوا۔ دونوں میں تلوار چلی۔ شمشیر زنی شروع ہوتے ہی عبد الکریم کا گھوڑا اسے لے کر گرا۔ اس نے اٹھنا چاہا۔ لیکن مہدی سلطان نے تلوار کا ایک ایسا ہاتھ مارا۔ کہ عبد الکریم کا پہنچا کٹ گیا۔ مہدی سلطان نے اسے پکڑ لیا۔ اور اس کی فوج کو زبردست شکست دی۔

مہدی اور حمزہ وغیرہ نے شیبانی کی نوکری کرلی

ان سلاطین نے محسوس کیا کہ سمرقند کے حالات بگڑتے جا رہے ہیں اور مرزاؤں کی سرکاریں ڈگمگا رہی ہیں۔ اس لئے انھوں نے دوراندیشی کی اور سب شیبانی خاں کے پاس چلے گئے۔

سلطان علی اور بائسنغر میدان جنگ میں

سمرقند والوں کو جو ذرا سی کامیابی ہوئی تو وہ سلطان علی مرزا پر حملے کی تیاریاں کرنے لگے، بائسنغر مرزا سرپل کے مقام پر پہنچا۔ اور سلطان علی مرزا خواجہ کارزون پہنچ گیا۔

ابوالمکارم وغیرہ کا بخارا پر حملہ

یہی موقعہ تھا کہ خواجہ ابوالمکارم اور اندجان کے امرا میں سے ویس لاغری، محمد باقر، میر قاسم دولدائی اور بائسنغر مرزا کے خاص ملازمین میں سے ایک جماعت خواجہ مراد شئی کے کہنے سے بخارا پر چڑھ دوڑی۔

وہ سب شہر کے قریب پہنچے تو بخارا والوں کو خبر ہوگئی اور یہ ناکام و نامراد واپس آئے۔

میں پھر سمرقند کی طرف چلا

میں اور سلطان علی مرزا جب آپس میں ملے تھے اس وقت یہ طے ہوا تھا کہ گرمی میں وہ بخارا سے اور میں اندجان سے پہنچوں گا اور ہم دونوں سمرقند کو گھیر لیں گے۔

اس وعدے کے سبب میں رمضان[1] میں اندجان سے چلا۔ ٹھنڈے پہاڑوں[2] کے قریب پہنچا تو خبر ملی کہ دونوں مرزا آمنے سامنے مقابلے پر پڑے ہیں۔ میں نے دو تین سو قزاق فوجیوں کے ساتھ تولون خواجہ مغل کو وہاں دھاوا بولنے بھیجا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچے۔ بائسنغر مرزا میرے آنے

---

[1] شیئنی [2] مئی ۱۴۹۶ء [3] یار ییلاق

کی خبر سن کر بڑی پریشانی اور بے سروسامانی کی حالت میں واپس چلا گیا۔

شیراز کی فتح

میری وہ فوج اسی رات کو ندلان سے چلی۔ بہت سے مخالفین کو تیروں سے چھیدا۔ بہت سے گرفتار کرلئے اور لوٹ کا بہت سامال لے کر واپس آئی۔ میں ایک دو دن بعد شیراز کے قلعہ پر پہنچا۔ قاسم دول دائی شیراز پر قابض تھا۔ شیراز کا داروغہ اسے بچانہ سکا اور میرے حوالے کر دیا۔ میں نے شیراز ابراہیم سارو کو دے دیا۔

تنبل وغیرہ میرے ملازم ہوگئے

دوسرے دن میں عید کی نماز پڑھ کر سمرقند روانہ ہوا۔ اور میدان میں خیمے ڈیرے ڈال کر جا اُترا۔ اسی دن قاسم دول دائی، ویس لاغری، حسن نبیرہ، سلطان محمد تنبل اور سلطان محمد ویس نے تین چار سو آدمیوں کے ساتھ آکر ملازمت حاصل کی۔ کہنے لگے بائسنغر مرزا کے فرار ہوتے ہی ہم اس سے الگ ہوکر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔

لیکن معلوم یہ ہوا کہ یہ لوگ شیراز کو بچانے کا دعویٰ کر کے سلطان بائسنغر مرزا سے جدا ہوئے تھے۔ جب شیراز کا یہ حشر دیکھا تو عاجز ہونے کے بعد یہاں آگئے۔

مغلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کروا ڈالا

میں جس وقت میدان میں جا اُترا۔ اس وقت ان مغلوں کو پکڑ لائے جنہوں نے خودسری سے ان بعض دیہات کو لوٹ لیا تھا جو رستے میں پڑے تھے قاسم بیگ نے انتظام کے طور پر حکم دیا کہ ان میں سے دو تین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو۔

بعد میں قاسم بیگ کی جدائی کی وجہ

چار پانچ سال بعد جب مصیبت اور بے وطنی کا دور آیا اور میں مسیحا کے مقام سے خان کے پاس جانے لگا تو اسی واقعہ کے سبب قاسم بیگ کو مجھ سے جدا ہو کر حصار جانا پڑا۔

میرے صدر منصف کا انتقال

میدان سے چلے اور دریا سے اُتر کر بام کے قریب پہنچے۔

آج ہی بعض امراء بائسنغر مرزا کی فوج سے خیابان پر جا بھڑے۔ سلطان احمد تنبل کی گردن میں برچھا لگا۔ وہ بچ گیا۔ مگر خواجگی صدر منصف (خواجہ کلاں کے بڑے بھائی) کی گردن میں تیر لگا۔ وہ اسی وقت مر گیا۔

وہ بہت اچھا جوان تھا۔ میرے والد نے لطف و عنایت سے اس کو مہردار کر دیا تھا وہ صاحب علم

آدمی تھا۔ لغت خوب جانتا تھا، اچھا انشاء پرداز اور اچھا میر شکار تھا۔

میں نے لوٹا ہوا مال واپس دلایا ہم جب بام کے نواح میں تھے۔ تو شہر کے بہت سے دوکاندار اور ان کے ساتھ ساتھ اور بہت سے لوگ لشکر کے بازار میں آکر سودا سلف فروخت کرنے لگے۔ ایک روز ظہر کے وقت ایکا ایکی شور و غل مچا اور وہ سب مسلمان لٹ گئے۔

میرے لشکر کا انتظام ایسا عمدہ تھا کہ میں نے جو حکم دیا کہ کوئی بھی ان لوگوں کا مال واسباب اپنے پاس نہ رکھے سب واپس دے دیا جائے تو دوسرے ہی روز پہر دن چڑھنے سے پہلے دھاگے کا ٹکڑا اور ٹوٹی ہوئی سوئی تک لشکر والوں کے پاس نہ رہی۔ سارا مال مالکوں کو مل گیا۔

من جلوں کے معرکے وہاں سے چل کر ہم سمرقند کے مشرق کی طرف یورت خان[1] میں جا اترے سمرقند سے اس جگہ کا فاصلہ تقریباً تین کوس ہے۔ وہاں ہم ڈیڑھ پونے دو مہینے ٹھیرے۔ اتنے عرصے میں اندر باہر کی فوج کے من چلوں میں خیاباں کے مقام پر خوب لڑائیاں ہوئیں۔

چہرہ پر تلوار کا گھاؤ خیاباں میں ایک دفعہ ابراہیم بیگ چک نے حملہ کیا۔ اس کے چہرہ پر تلوار کا زخم لگا۔ اس کے بعد ہی سے اس کو ابراہیم چاپق[2] کہنے لگے۔

آدھی گردن کٹ گئی دوسری دفعہ وہیں پل مغاک[3] پر ابوالقاسم کوہ بر[4] جا لڑا اور اس نے پیازی کے خوب ہاتھ نکالے۔

پھر ایک مرتبہ وہیں برناؤ[5] کے قریب مختصر سی لڑائی ہوئی۔ میر شاہ توچین نے پیازی کے ہاتھ نکالے۔ میر شاہ توچین کے ایسی تلوار لگی کہ آدھی گردن کٹ گئی۔ لیکن شہ رگ بچ گئی۔

ہمیں فریب دیا گیا اسی دوران میں جب کہ ہم یورت خان میں تھے۔ سمرقند والوں نے ایک آدمی بھیجا۔ اور دھوکہ دینے کے لئے درخواست کی کہ غارِ عاشقاں کی طرف آیئے تو ہم قلعہ حوالہ کردیں۔

رات کو اسی وجہ سے ہم لوگ پل مغاک پر پہنچے۔ چیدہ سواروں کا ایک دستہ اور تھوڑے سے

---

[1] خان کا مکان یا خان کی چوکی [2] چاپق یعنی چرا ہوا چہرہ [3] پل مغاک، دریائے مغاک کے قریب ایک گاؤں کا نام ہے۔ وہ دریا سمرقند کے مشرق کی طرف بہتا ہے [4] کوہ بر [5] ترناؤ۔

پیدل غارِ عاشقاں پر بھیجے گئے۔ سمر قند والوں نے پانچ چار پیدلوں ہی کو پکڑا تھا کہ لوگ ہوشیار ہو گئے۔ یہ بہت بہادر سپاہی تھے۔ ان میں سے ایک کا نام حاجی تھا۔ وہ میرے بچپن سے میرے پاس رہتا تھا۔ دوسرا محمود کوہ بر سنگ تھا۔ ان سب کو مار ڈالا۔

میرے لشکر میں سمر قند کی جھلک

جس زمانے میں ہم اسی چوکی میں تھے۔ سمر قند سے وہاں کے باشندے اور تاجر اس قدر آتے کہ لشکر شہر دکھائی دیتا۔ شہر سے جو چیز لینی ہو وہ لشکر میں لے لو۔

میرے ساتھیوں کی تعداد میں اضافہ

اسی دوران میں سمر قند کے علاوہ اور قلعوں، پہاڑوں اور جنگلوں کے رہنے والے ہمارے پاس آ گئے۔ پہاڑ کے دامن میں ارکت والوں نے اپنے قلعہ کو بہت مضبوط کر لیا۔ ہم اپنی چوکی سے ارکت پر قبضہ کرنے گئے۔ وہ لوگ ہم سے مقابلہ نہ کر سکے۔ خواجہ قاضی کی معرفت حاضر ہوئے۔ میں نے ان کی خطا معاف کی پھر سمر قند گھیرنے چلا آیا۔

سنہ ۹۰۳ھ کے حالات

پھر سمر قند کی طرف

باغ میدان کے پیچھے قلبہ کے سبزہ زار میں جا کر اُترے۔ سمر قندیوں میں سے بہت سے سپاہی اور شہریوں نے محمد حبیب کے پل کے قریب جمع ہو کر ہم پر حملہ کیا۔ ہماری فوج تیار نہ تھی اس کے درست ہوتے ہوتے وہ سلطان علی اور بابا قلی کو پکڑ کر قلعے میں لے گئے۔

یوسف بیگ کی حاضری

چند دن بعد ہم وہاں سے ہٹ کر قلبہ کے قریب کوہک پہاڑ پر جا ٹھیرے اسی روز سید یوسف بیگ سمر قند سے نکل کر آیا اور وہیں میری ملازمت میں حاضر ہوا۔

دشمن کی یورش

میں جو اُس پڑاؤ سے اس پڑاؤ پر آیا تو سمر قند والوں نے سوچا کہ میں واپس چلا گیا۔ تمام سپاہی اور شہری مرزا کے پل تک اور شیخ زادہ دروازے سے محمد حبیب کے پل تک آن چڑھے۔

دشمن کی شکست

میں نے حکم دیا کہ جتنی فوج موجود ہے وہ تیار ہو جائے۔ اسی فوج نے مرزا کے پل اور محمد حبیب کے پل پر دو طرف سے حملہ کیا۔ خدا نے مری تجویز کو پروان چڑھایا۔ دشمن کو ہار ہوئی، اس کے اچھے اچھے سردار اور سپاہی پکڑے گئے ان میں محمد مسکین، حافظ دولدائی جس کی کلمے کی انگلی تلوار سے کٹ گئی تھی۔ اور محمد قاسم نبیر (حسین نبیر کا چھوٹا بھائی) تھا۔

ادنیٰ لوگوں میں دیوانہ جامہ باف اور کل قاشق (جو پتھروں سے لڑنے والوں کے سرغنہ اور زبردست غنڈے تھے) پکڑے گئے۔ ان میں ایسے بہت سے سپاہی اور شہری بھی تھے جو جانے پہچانے تھے۔

سمرقندیوں کو یہ ایسی زبردست شکست ہوئی کہ شہر سے ان کا نکلنا بند ہوگیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہمارے آدمی خندق تک جانے لگے اور بہت سے لونڈی غلام پکڑ کر لانے لگے۔

سردی کا خیر مقدم | آفتاب برج میزان میں آیا۔ اور سردیاں شروع ہوگئیں۔ امراء اور مشیر جو تھے ان کی صلاح سے یہ تجویز طے ہوئی کہ شہری عاجز آ چکے ہیں۔ خدا نے چاہا تو آج ہی کل میں ہم شہر پر قبضہ کرلیں گے۔ لیکن سردیوں میں تکلیف نہ ہو اس لئے شہر کے قریب سے ہٹ کر کسی قلعے میں ٹھہرنا چاہیئے۔ تاکہ سردی کا موسم وہاں گذارا جاسکے۔ ہمیں واپس بھی جانا ہوگا تو وہاں سے بے فکر چلے جائیں گے۔

سردیاں گذارنے کے لئے خواجہ دیدار کا قلعہ مناسب معلوم ہوا۔ یہاں سے ہٹ کر خواجہ دیدار کے قلعے کے سامنے سبزہ زار میں جا ٹھیرے۔ قلعے میں مکانات کی تعمیر کے لئے جگہیں تجویز ہوئیں، راج مزدور اور منتظم مقرر کئے اور ہم چھاؤنی میں آگئے۔ قلعے میں مکانات بننے تک ہمارا پڑاؤ سبزہ زار ہی میں رہا۔

شیبانی خاں کی آمد | اسی دوران میں بائسنغر مرزا نے شیبانی خاں کے پاس ترکستان آدمی پر آدمی بھیجے اور اپنی مدد کے لئے اس کو بلایا۔ قلعے کے مکانات کی تعمیر مکمل ہوئی تھی اور ان میں گئے ہی تھے کہ دوسرے روز صبح کے وقت شیبانی خاں مارا مار ترکستان سے آیا۔ اور ہمارے پڑاؤ میں آن اُترا۔

ہمارا لشکر تتر بتر تھا۔ جاڑا گذارنے کے لئے کچھ لوگ رباط خواجہ میں کچھ کاندا ور میں اور کچھ شیراز گئے ہوئے تھے۔ جتنی فوج موجود تھی اسی کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ شیبانی خاں ہمارا مقابلہ نہ کرسکا سمرقند چلا گیا۔ اور شہر کے قریب جا اُترا۔

بائسنغر مرزا کا مقصد پورا نہ ہوا۔ اس لئے اس میں اور شیبانی خاں میں گاڑھی نہ چھن سکی شیبانی خاں چند دن ٹھیرا بھی مگر کوئی کام نہ بنا۔ اس لئے مایوس ہوکر ترکستان چلا گیا۔

بائسنغر کا فرار | بائسنغر مرزا نے سات مہینے محاصرے کی تکلیف اٹھائی۔ اس کو صرف شیبانی خاں

کی امداد کی آس تھی۔ اس سے مایوسی ہوئی تو مجبوراً دو تین سو ننگے بھوکے آدمیوں کے ساتھ خسرو شاہ کے پاس قندز چلا گیا۔

حسین اکبر کا حملہ | وہ جب ترمذ کے قریب دریائے آموں[1] سے گذرا تو سید حسین اکبر کو خبر ملی۔ وہ مسعود مرزا کا داماد اور اس کے بھروسے کا آدمی تھا۔ اور ترمذ کا والی تھا۔ وہ اسی وقت بائسنغر مرزا کے سر پر جا دھمکا۔ مرزا دریا کے پار جا چکا تھا۔ تھوڑے سے آدمی اور تھوڑا سا اسباب رہ گیا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ لگا۔

یرم ترخان وہیں دریا میں ڈوبا اور بائسنغر مرزا کا غلام محمد طاہر پکڑا گیا۔

خسرو شاہ بائسنغر مرزا سے اچھی طرح پیش آیا۔

باپ بیٹے میں فوج کشی | اسی سال سلطان حسین مرزا اور بدیع الزماں مرزا کے اختلافات کا حال معلوم ہوا۔ ان جھگڑوں کا انجام یہ ہوا کہ باپ بیٹوں میں ٹھن گئی اس کا مفصل حال یہ ہے کہ پچھلے سال سلطان حسین مرزا نے بدیع الزماں مرزا اور مظفر حسین مرزا کو بلخ اور استرآباد دے دیئے تھے۔ اور اس وقت اس فیصلے پر ان دونوں کی رضامندی بھی حاصل کر لی تھی۔ یہ واقعہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس وقت سے اب تک بہت سے ایلچی آئے اور گئے۔ علی شیر بھی سفیر ہو کر آیا۔ اور اس نے بہت کوشش کی۔ لیکن بدیع الزماں مرزا اپنے چھوٹے بھائی کو استرآباد دینے پر راضی نہ ہوا۔ کورا جواب دے دیا۔ اور کہا کہ جب میرے بیٹے مومن مرزا کے ختنے ہوئے تو یہ شہر اس کو عنایت کیا گیا تھا۔

ایک دن پھر مرزا اور علی شیر بیگ کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت جو بات چیت ہوئی۔ اس سے مرزا کی ترش روئی اور علی شیر بیگ کی نرمی ٹپکتی ہے۔ علی شیر بیگ نے بدیع الزماں مرزا کے کان میں بہت چپکے سے چند پوشیدہ راز بیان کئے اور کہا ان باتوں کو یاد رکھنا۔

مرزا اسی وقت بولا۔ کون سی باتیں؟

---

[1] دریائے آموں ایران اور توران کے بیچ میں بہتا ہے۔

علی شیر بیگ نے صورت دیکھی اور رو دیا۔

آخر باپ بیٹوں میں بات اتنی بڑھی کہ باپ نے باپ پر اور بیٹے نے بیٹے پر استر آباد اور بلخ میں فوج کشی کی۔[1]

مظفر حسین مرزا اور مومن مرزا کا جھگڑا اتنا بڑھا۔ کہ مظفر حسین مرزا کے باپ سلطان حسین مرزا نے محمد مومن مرزا کے باپ بدیع الزماں مرزا پر بلخ میں چڑھائی کر دی۔

اور سلطان حسین مرزا کے بیٹے مظفر حسین مرزا نے بدیع الزماں مرزا کے بیٹے مومن مرزا پر استر آباد میں حملہ کر دیا۔

کوردان کے نیچے بیگ چراغ کے سبزہ زار میں سلطان حسین مرزا نیچے کی طرف سے اور بدیع الزماں مرزا اوپر کی طرف سے آیا۔ اور دونوں مقابل ہوئے۔

ابوالحسن کا حملہ | رمضان کی پہلی تاریخ بدھ کے دن سلطان حسین مرزا کے سرداروں میں سے ابوالحسن مرزا چند سرداروں اور فوج کے ایک دستہ کو لے کر ایکا ایکی سامنے آگیا۔ معمولی سی لڑائی ہوئی تھی کہ بدیع الزماں مرزا کو شکست ہوئی اور اس کے اچھے اچھے سپاہی پکڑے گئے۔ سلطان حسین مرزا نے ان سب کو مروا ڈالا۔

دشمن کا قتل عام | صرف اسی موقعہ پر نہیں بلکہ ہر اس موقعہ پر جب کہ اس کے کسی بیٹے نے سرکشی کی اس نے اس کو شکست دی اور اس کے نوکروں میں سے جو بھی ہاتھ آیا اس کو مروا ڈالا۔

سلطان حسین مرزا اس کے سوا کیا کرتا۔ وہ حق پر تھا۔

بیٹوں کی عیش پرستی | مرزا اس قدر عیش و عشرت اور بدکاری میں مبتلا تھے کہ ان کے باپ کو جو نہایت ہوشیار اور تجربہ کار بادشاہ تھا۔ اتنی دور سے آنا پڑا۔

عیش و نشاط کا نتیجہ | رمضان جیسا متبرک مہینہ اور ایک رات کا فیصلہ باقی۔ لیکن اس نے نہ باپ کا لحاظ کیا اور نہ اسے خدا کا خوف ہوا۔ اس نے شراب پیے، جلسے کرنے اور مزے اڑانے

---

[1] ایک نسخہ میں یہ بھی ہے کہ باپ نے بیٹے پر اور بیٹے نے باپ پر چڑھائی کر دی۔

سے کام رکھا۔

یہ بندھا ٹکا اصول ہے کہ ایسے آدمی کو ایسی ہی ہار ہونی چاہئے۔ جو لوگ عیش و نشاط کے بندے بن جاتے ہیں۔ ان پر ہر ایک قابو پا جاتا ہے۔

پریشانی اور بے سر سامانی استرآباد کی چند سال کی حکومت میں بدیع الزماں مرزا کے حاشیہ نشین اور ملازمین خوب زرق برق بن گئے تھے مرزا کے ہاں سونے چاندی کا سامان بے تعداد تھا۔ ہمہ قسم کے عمدہ عمدہ کپڑے اور سدھائے ہوئے چنندہ گھوڑے موجود تھے۔ بھاگتے وقت ساری کائنات وہیں چھوڑی۔ اور پہاڑ کے ناہموار راستوں سے ایک خطرناک گھاٹی میں گھس گیا اور وہاں سے بڑی مشکل سے نکلا۔ اس جگہ اس کے بہت سے آدمی تلف ہوئے

بلخ بھی چھین لیا سلطان حسین مرزا اپنے بیٹے کو شکست دے کر بلخ گیا۔ وہاں بدیع الزماں مرزا کی طرف سے شیخ علی طغائی حاکم تھا۔ اس سے کچھ نہ بن سکا اس نے بلخ حوالے کر دیا۔

ابراہیم حسین بلخ کے تخت پر سلطان حسین مرزا نے ابراہیم حسین مرزا کو بلخ دے دیا۔ اور محمد ولی بیگ اور شاہ حسین چہرہ کو اس کے ساتھ چھوڑا۔ اور خود خراسان چلا گیا۔

خسرو کی عنایاتِ خسروانہ بدیع الزماں مرزا اس شکست کے بعد لٹ لٹا کر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ خسرو شاہ کے پاس قندز پہنچا۔

خسرو شاہ نے بڑی خاطر و مدارات کی۔ مرزا اور اس کے ساتھیوں کو اونٹ گھوڑے ڈیرے خیمے۔ اور فوجی ساز و سامان اتنا کچھ دیا کہ دیکھنے والے کہتے ہیں۔ کہ ان چیزوں میں اور پچھلے سامان میں کوئی فرق نہ تھا۔ اور فرق ہو تو شاید سونے چاندی کے ساز و سامان میں ہو۔

مسعود کی بے اعتدالی اور خسرو کا اقتدار سلطان مسعود مرزا اور خسرو شاہ میں مرزا کی بے اعتدالیوں اور خسرو شاہ کے اقتدار کی وجہ سے ان بن ہو گئی۔ اس نے ولی اور باقی کو ساتھ کیا۔ اور بدیع الزماں مرزا کو سلطان مسعود مرزا کا مقابلہ کرنے کے لئے حصار بھیج دیا۔

میل ملاپ کا فریب یہ لوگ قلعے تک نہیں پہنچ سکے لیکن قرب و جوار میں دو ایک دفعہ طرفین

میں تھوڑی سی تلوار چلی۔

ایک دفعہ حصار کے شمال میں توش خانے کے مقام پر محب علی قورچی فوج سے نکل کر آیا اور خوب لڑا۔

دشمنوں نے جب اس کو گھوڑے سے گرا کر پکڑنا چاہا تو اس کے ساتھیوں نے دوسری طرف سے حملہ کر دیا اور اسے چھڑا لیا۔

کچھ دن بعد مرزا وغیرہ ظاہرا میل ملاپ کی باتیں کر کے واپس چلے آئے۔

بدیع الزماں کا شاندار خیر مقدم | چند دن بعد بدیع الزماں مرزا پہاڑ کے رستے سے ذوالنون ارغون اور اس کے بیٹے شاہ شجاع ارغون کے پاس قندہار اور زمین داور[1] چلا گیا۔ ذوالنون یوں تو بخیل اور کنجوس آدمی تھا۔ لیکن اس نے مرزا کی خاطر و مدارات بہت کی۔ چالیس ہزار بکریاں تو ایک ہی دفعہ پیش کیں۔

چار شنبہ کا لطیفہ | عجیب اتفاق ہوا کہ جس چار شنبہ کو سلطان حسین مرزا نے بدیع الزماں مرزا کو شکست دی اسی چار شنبہ کو استرآباد میں مظفر حسین مرزا نے محمد مومن مرزا کو شکست دی اور اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جو شخص محمد مومن مرزا کو پکڑ کر لایا۔ اس کا نام بھی چار شنبہ تھا۔

سمرقند کی فتح | بائسنغر مرزا جیسے ہی فرار ہوا۔ ہمیں خبر مل گئی۔ ہم فوراً خواجہ دیدار سے سمرقند چلے، راستے میں اکابر، امرا اور سپاہی اوپر تلے استقبال کے لئے آتے رہے۔ ہم قلعے میں پہنچ کر بُستان سرائے میں جا اُترے۔ خدا کے فضل سے ربیع الاول کے آخر میں سمرقند اور اس کے ملحقہ علاقے فتح ہو گئے۔

بلدہ محفوظ سمرقند | سمرقند کے برابر دنیا میں کوئی شہر لطیف نہیں ہے۔ وہ اقلیم پنجم میں ہے۔ اس کا طول بلد نوے درجے کچھ دقیقے اور عرض بلد چالیس درجے کچھ دقیقے ہے۔ شہر کا نام سمرقند ہے۔ اس میں جو علاقہ شامل ہیں انھیں ماوراء النہر کہتے ہیں۔ اور چوں کہ کوئی دشمن اس پر غالب نہ ہو سکا۔ اس لئے اس کو بلدہ محفوظ بھی کہتے ہیں۔

---

[1] زمین داور، ہلمند کے مغرب کی طرف پہاڑ کے نیچے دریائے ہلمند کے دائیں طرف ہے ۔ ع محمد ۱۳۵۲ء

عروج وزوال کے الٰہی قوانین

از

(جناب مولوی محمد تقی صاحب امینی)

(۷)

غور وفکر اور عقل وخرد سے کام لینے کی چند آیتیں

غور وفکر اور عقل وخرد سے کام لینے کے سلسلہ کی چند آیتیں یہ ہیں

ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنہار لاٰیٰت لاولی الالباب ۳/۱۹۰

بلاشبہ آسمان اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے اختلاف میں ارباب دانش کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا ۳/۱۹۱

وہ ارباب دانش آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں (جس سے ان پر معرفت حق کا دروازہ کھل جاتا ہے اور وہ پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے پروردگار یہ سب کچھ آپ نے عبث اور بے کار نہیں پیدا کیا ہے۔

اولم ینظروا فی ملکوت السموات والارض وما خلق اللہ من شیٔ ۹/۱۸۵

کیا یہ لوگ آسمان اور زمین کی بادشاہت اور جو کچھ خدا نے پیدا کیا ہے اس میں نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے

واختلاف اللیل والنہار وما انزل اللہ من السماء من رزق فاحیا بہ الارض بعد موتھا وتصریف الریح اٰیٰت لقوم یعقلون ۴۵/۵

اور رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آتے رہنے میں اور سرمایۂ رزق (پانی) میں جس کو اللہ آسمان سے اتارتا ہے اور اس کے ذریعہ پردۂ زمین میں زندگی پیدا کرتا ہے اور ہواؤں کے رد وبدل میں ان لوگوں

کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔

وسخر لکم ما فی السموات وما فی	اللہ نے آسمان اور زمین کی ساری چیزیں تمہارے
الارض جمیعا منہ ان فی ذلک	تابع فرمان کر دیا بے شک اس میں غور وفکر کرنے والی
لآیت لقوم یتفکرون ۴۵/۱۲	قوم کے لئے نشانیاں ہیں۔

اسی طرح فرمایا گیا ہے جانور تمہارے لئے ہیں والانعام خلقھا لکم ۱۶/۱۲ بارش اور اس سے اُگنے والی سبزیاں اور درخت تمہارے لئے ہیں۔ ھو الذی انزل من السماء ماء لکم ۱۶/۱ ینبت لکم بہ الزرع الی اخرہ الایۃ ۱۶/۱ ومنہ شجر فیہ تسیمون ۱۶/۱۱ دریا اور اس کی روانی تمہارے لئے ہے وھو الذی سخر البحر ۱۶/۱۴ وغیر ذلک

ان آیتوں میں ایک طرف تو ان کے قدرتی فائدوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو ہر دور میں یکسانیت کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور دوسری طرف ان فائدوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو انسانی غور وفکر اور جد وجہد کے نتیجہ میں حاصل ہوتے رہتے ہیں اور معاشرہ کے ارتقار کے ساتھ ان میں تنوع پیدا ہوتا جاتا ہے جس کی بنا پر ان کی افادیت بڑھتی جاتی ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو "سخر" کا لفظ اور "ہر شی کے انسانوں کے لئے پیدا کئے جانے کا نظریہ" خود مذکورہ حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے باہر سے کسی دلیل کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں باقی رہتی ہے۔

اس موقع پر ایک اور قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اس قسم کی تقریباً تمام آیتوں میں اظہارِ قدرت کے لئے یا شکر کے مطالبہ کے لئے یا اور کسی غرض کے ماتحت کسی نہ کسی طرح اللہ کا ذکر ضرور آگیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ تحقیق وجستجو کی ہر دوڑ اور غور وفکر کے ہر میدان میں اللہ کی مرکزیت اور اس کی ماتحتی مُسلَّم ہونی چاہیئے ورنہ عملی دنیا میں اس کے نتائج کہیں سے کہیں پہنچ سکتے ہیں جیسا کہ آج کل پہنچ رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں علمائے اسلام کی شہادتیں امام ابوبکر جصاص رح مذکورہ کئی آیتوں کے نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں

یحتج بجمیع ذلک فی ان الاشیاء علی الاباحۃ مما لا یحظرہ العقل فلا یحرم شیئ الا ما قام دلیلہ[1]	ان تمام آیتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جن چیزوں سے عقل نہ روکے وہ سب مباح ہیں البتہ جن کی حرمت پر دلیل قائم ہو وہ اس سے مستثنیٰ ہوں گی

امام غزالیؒ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کس کے تابع ہیں فرمایا معقولات میں عقل کا تابع ہوں اور منقولات میں قرآن کا۔[2]

ایک موقع پر یہی امام غزالی فرماتے ہیں

ظن من یظن ان العلوم العقلیۃ مناقضۃ للعلوم الشرعیۃ وان الجمع بینھما غیر ممکن ھو ظن صادر عن عمی فی عین البصیرۃ[3]	جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ عقلی علوم شرعی علوم کے مخالف ہیں اور دونوں کا جمع کرنا ناممکن ہے ان کی بصیرت کی آنکھیں اندھی ہیں۔

امام فخرالدین رازیؒ غور و فکر سے متعلق آیتیں نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں

وکل ذلک یدل علی وجوب النظر والاستدلال والتفکر وذم التقلید فمن دعی الی النظر والاستدلال کان علی وفق القرآن ودین الانبیاء ومن دعی التقلید کان علی خلاف القرآن وعلی وفاق دین الکفار	ان سب آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ نظر و فکر اور استدلال واجب ہے اور اندھی تقلید بری شے ہے جو شخص نظر و فکر کی دعوت دیتا ہے وہ قرآن اور طریقہ انبیاء کے موافق ہے اور جو اندھی تقلید کی طرف بلاتا ہے وہ قرآن کے مخالف اور کافروں کے مذہب کے موافق ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں

امام ابن تیمیہ کا قول کہ دین کی تکمیل قوت حرب، جہاد اور مال کے بغیر نہیں ہو سکتی

اس وقت ہمارے سامنے دو فاسد راستے ہیں ایک ان لوگوں کا جو دین کی طرف منسوب ہیں لیکن قوت حرب جہاد اور مال سے جن کا دین خداوندی محتاج ہے دین کی تکمیل نہیں کرتے دوسرا راستہ ان والیان حکومت

[1] احکام القرآن ج ۱ ص ۳۰ [2] از اجتہاد ۲۹ [3] ایضاً

کا ہے جو مال، حربی قوت اور جہاد سے کام لیتے ہیں لیکن اس سے ان کا مقصد اقامتِ دین نہیں ہے، یہ دونوں ان لوگوں کے راستہ ہیں جن پر غضب نازل ہوا یا گمراہ ہیں[۱]

پھر آگے چل کر کہتے ہیں

پس دین کا قوام کتاب ہادی اور حدید ناصری (تلوار) "یعنی سیرت کی تشکیل اور عالمی تصرفات" کے بغیر ممکن نہیں جیسا کہ رب قدیر نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے اس لئے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی رضاجوئی کے لئے قرآن اور تلوار دونوں کو باہم مجتمع کرنے کی جد و جہد کرے اور اس کوشش میں خدا سے مدد مانگے اس کے بعد معلوم ہو کہ دنیا دین کی خدمت گار اور چاکر ہے۔"[۲]

ایک اور موقع پر کہتے ہیں

"دین کو قائم رکھنے والی دو چیزیں ہیں قرآن اور تلوار حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس تلوار سے اس کی خبر لیں جو قرآن سے روگردانی کرتا ہے۔"[۳]

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تشکیلِ سیرت اور عالمی تصرفات دونوں کے آمیزہ پر نہایت شاندار بحث کی ہے اور ایسے انداز میں کی ہے کہ اُسے دیکھ کر ایمان میں تازگی اور دل میں سرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔[۴]

بہر حال ان تصریحات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صالح معاشرہ کے قیام و بقا کے لئے سیرت کی تشکیل اور عالمی تصورات دونوں ضروری ہیں اور قومی و جماعتی زندگی کے عملِ صالح کی فہرست میں یہ سب داخل ہیں۔[۵]

---

[۱] سیاست الٰہیہ صفحہ ۲۲ [۲] حوالہ بالا صفحہ ۲۲۲ [۳] حوالہ بالا صفحہ ۱۷ [۴] ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ باب الارتفاقات

[۵] اس سلسلہ میں مفسرین کی تصریحات درج ذیل ہیں جن سے عمل صالح کی عمومیت ثابت ہوتی ہے۔

تفسیر مدارک میں ہے

والصلحات کل ما استقام من الاعمال بدلیل العقل والکتاب والسنۃ (مدارک صفحہ ۱۲۷)

(قرآن حکیم) میں صالحات سے مراد ہر وہ عمل ہے جو صحیح اور درست ہو خواہ اس کی صحت کتاب و سنت سے ثابت ہو یا عقل سے۔

چنانچہ قرآن حکیم میں جن قوموں کے احوال و واقعات بیان ہوئے ہیں ان کی تاریخ پر غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے عروج و بقا اسی وقت حاصل کیا جب کہ عالمی تعمیرات کے ساتھ سیرت کی تشکیل کی اور زوال و پستی سے انھیں اسی وقت دوچار ہونا پڑا جب کہ دونوں میں کسی ایک سے کنارہ کشی اختیار کی۔

انسان کی ابتدائی سرگذشت اور اس سے عمل صالح پر استدلال اس کی صورت ابتدار تاریخ قرآنی سے یہ ہوئی کہ اس دنیا میں انسان کے آباد ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی کے باپ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے واسطے سے تمام انسانوں کو بنیادی حیثیت سے چند باتوں کی ہدایت کر دی تھی جن کا تعلق یہاں کی مادی و روحانی دونوں زندگیوں سے تھا۔ جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب نئے شخص کو کسی نئے مقام پر اہم ڈیوٹی سپرد کرنی ہوتی ہے تو صلاحیت کے امتحان میں کامیاب ہو جانے کے باوجود اسے باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی ہے، وہاں کی کیفیات و حالات سے آگاہ کیا جاتا ہے، کام کی نوعیت اور نشیب و

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بیضاوی میں ہے

وھی من الاعمال ما سوغہ الشرع وحسنہ	تمام وہ کام جن کو شریعت نے جائز رکھا اور جن کی تحسین کی ہے۔

(بیضاوی ص۳۴)

تفسیر عزیزی میں ہے

وعملوا الصالحٰت یعنی و عملہائے شائستہ کردہ اند و عمل شائستہ ہماں است کہ ایں کتاب بآں فرمودہ باشد یا یکی از فروع ثلثہ ایں کتاب کہ سنت پیغمبر و اجماع مجتہداں است و قیاس جلی براں دلالت نمودہ۔ (تفسیر عزیزی ص۹۲)

حدیث میں سمت حسن اور ہدی صالح کا ذکر ہے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں

"و ہمچنیں در قوتِ عاملہ او مددے مید ہد کہ بسبب آں سمت صالح نصیب او گردد و رعایات آداب عادات و تدبیر منزل و سیاست مدنیہ بطورے کہ ازاں خوب تر نشود اہتمام فرماید و خلق و شجاعت و سیاست و عدالت و کفایت و شناختن مصلحت بر وقتے او را اعطا می کند و بسوئے ایں اشارت واقع شدہ در حدیث السمت الصالح جزء من اجزاء النبوۃ (قرۃ العینین ص۱۴۴ از ترجمان السنہ ج ۲ ص۲۰۹)

اللہ تعالیٰ جس طرح نبی کی قوتِ عاقلہ میں زیادتی عطا فرماتا ہے اسی طرح اس کی قوتِ عاملہ میں بھی زیادتی مرحمت فرماتا ہے اور اسی وجہ سے سمتِ صالح اس کے حصہ میں آجاتی ہے پھر وہ سیاستِ مدنیہ، تدبیر منزل اور جملہ آدابِ عادات کی رعایت اس طور پر کرنے لگتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی کے خیال میں نہیں آسکتی اس کو اخلاق بہادری اور سیاست، عدالت اور ہر وقت و محل کے مناسب مناسب مصلحتوں کی معرفت بھی بخش دیتا ہے اسی جزء کی طرف حدیث "السمت الصالح" میں

فرائض سے واقف کرایا جاتا ہے پھر ان تمام مرحلوں سے گذارنے کے بعد اس کو عہدہ دے کر بھیجا جاتا ہے یہی صورت بعینہٖ اس مقام پر سمجھنا چاہیئے۔ تفصیل یہ ہے۔

(۱) انسان کے اندر صلاحیتیں اول ہی دن سے ودیعت کردی گئی تھیں جن کے ظہور کے لئے بتدریج ارتقائی منزلوں سے گذرنا ضروری تھا۔ وعلم آدم الاسماء کلھا ۲/۲۹

(۲) انسان مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہوگیا تھا قال یادم انبئھم باسمائھم فلما انبأھم باسمائھم ۲/۳۱

اسماء کے بارے میں متقدمین کی رائے یہ ہے

ابن عباسؓ اور مجاہدؒ کہتے ہیں۔

علمہ اسماء جمیع الاشیاء[۱] اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیے تھے۔

ابوبکر جصاصؒ کہتے ہیں

اعنی الاجناس بمعانیھا لعموم اللفظ[۲] مراد ساری جنسیں مع ان کے معانی کے ہیں کیونکہ اسماء کا لفظ عام ہے

متاخرین میں قاضی ثناء اللہؒ کے نقل کردہ بہت سے اقوال میں سے دو یہ ہیں

قیل اسم ماکان ومایکون[۳] بعضوں نے کہا کہ گذشتہ اور آئندہ سب چیزوں کو بتا دیا گیا تھا

قیل صفۃ کل شیٔ[۴] بعضوں نے کہا کہ ہر شے کی صفت بتائی گئی تھی

علم سے اس موقع پر اجمالی علم مراد ہے جس کا مطلب "صلاحیت" ہے نہ کہ تفصیلی علماً اجمالیا ولیس المراد العلم التفصیلی[۵]

(۳) جنت میں ٹریننگ کے لئے ایک عرصہ تک رکھا گیا تھا تاکہ وہاں کے نظام کو اور تعمیر و ترقی کی اسکیموں کو اچھی طرح سمجھ لے[۶] چنانچہ قرآن حکیم میں بار بار جنت کا تذکرہ منجملہ اور فائدوں

---

[۱] احکام القرآن ص ۳۳ [۲] حوالہ بالا [۳] تفسیر مظہری ص ۵ [۴] حوالہ بالا [۵] حوالہ بالا ص ۵
[۶] تفسیر عزیزی سورہ بقرہ ص ۲۲۵

کے ایک یہ فائدہ پہنچاتا ہے کہ دنیا کی تعمیر و ترقی میں جنت کا نقشہ سامنے رہے۔

(۴) ان مرحلوں سے گذارنے کے بعد جب مقررہ عہدہ (نیابت و خلافت) پر بھیجنے کا وقت آیا تو درج ذیل باتوں کی ہدایت کی گئی تھی۔

انسان کے دنیا میں آباد ہونے کے وقت کی چند بنیادی ہدایتیں اور اس میں عالمی تصرفات اور تشکیل سیرت دونوں کا ذکر

(الف) دو مخالف طاقتوں (انسان اور شیطان) میں باہمی دشمنی اور رسہ کشی جاری رہے گی جس کا مظاہرہ جنت میں بھی ہو چکا ہے اس سے ہوشیار رہنا اور دامن بچا کر کام کرتے رہنا بعضکم لبعض عدو ۲/۳۶

(ب) جہاں جا رہے ہو وہاں تمہیں ہمیشہ نہیں رہنا ہے بلکہ ایک مقررہ وقت تک رہنا ہے اور اس عرصہ میں وہاں کی چیزوں سے فائدہ اٹھانا (عالمی تصرفات) لیکن اپنی حیثیت کو کبھی نہ بھول جانا ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین ۲/۳۶

(ج) تشکیلِ سیرت کے بارے میں چند بنیادی باتیں بتا دی تھیں جس میں دعاء و استغفار وغیرہ کے کلمے بھی شامل تھے اس کے بعد جنت کی گذشتہ لغزش کو معاف کر کے نیابت و خلافت کے عہدہ پر مامور کیا گیا تھا فتلقی آدم من ربہ کلمٰت عـــہ فتاب علیہ ۲/۳۷

(د) یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً میرے پیغمبر آتے رہیں گے اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ تمہارے اندر ودیعت کی ہوئی صلاحیت کو بروئے کار لائیں گے اور تمہاری سیرت کی تشکیل کریں گے۔

(س) جنہوں نے ان کا کہنا مانا اور اپنی حالت درست رکھی تو ان کے لئے دنیا میں کسی

عـــہ میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں "کلمٰت" کا مفہوم عام رکھنے میں کسی اصول کلیہ پر زد نہیں پڑتی ہے جب کہ بہت سے مفسرین نے اس کی تفسیر مروجہ دعائیہ الفاظ "ربنا ظلمنا انفسنا الخ سے ہٹ کر "من کلمات الدعاء والاستغفار والتضرع" کی ہے۔

رہ گیا "فتاب علیہ" کا محل تو اس صورت میں اس کا مفہوم اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے یعنی اللہ نے آدم پر توجہ فرمائی" یعنی لغزش کو معاف کر کے عہدہ پر بھیج دیا"

ارباب فکر کی خدمت میں مؤدبانہ گذارش ہے کہ تفسیر بالرائے کا الزام لگانے سے پہلے اپنے نیک مشوروں سے [illegible]

قسم کا خوف اور غم نہ ہوگا اور یہ سمجھا جائے گا کہ انھوں نے اپنے اندر جنت (جو دنیا سے کہیں عالی مقام ہے) میں مستقل سکونت اختیار کرنے کی صلاحیت پیدا کرلی ہے؎ اور جنھوں نے ایسا نہ کیا بلکہ شیطان کی دشمنی کے شکار ہوگئے تو وہ دوزخ میں جائیں گے جہاں انھیں غفلت شعاری اور عافیت کوشی کی سزا ملے گی۔ فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف عَلَیْهِمْ ولاھم یحزنون والذین کفروا وکذبوا بایتنا اولئک اصحب النار ھم فیھا خلدون ۲/۳۹

تمام پیغمبروں نے قومی زندگی میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی اسی بنا پر ان کی تعلیم میں اختلاف نظر آتا ہے ورنہ سب کی تعلیم یکساں تھی اور سب نے قوم کو عمل صالح کی طرف بلایا

الغرض اس قدر اہتمام و انتظام کے بعد یہ حضرت انسان دنیا میں اپنے عہدہ پر مامور ہوئے۔ کچھ دنوں تک مذکورہ ہدایتوں پر قائم رہے پھر ان میں تبدیلیاں شروع ہوئیں تبدیلیوں کی بنیاد وہی شیطان دشمنی تھی جس سے پہلے آگاہ کیا جا چکا تھا حسب وعدہ اللہ نے اپنے رسولوں اور ہدایتوں کے بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا تاکہ یہ لوگ تعلیم کے ذریعہ اس کا اصلی مقام واپس دلائیں اور مخالف طاقتوں کے غلبہ کی وجہ سے جو صلاحیت کو زنگ لگ گیا ہے تربیت کے ذریعہ اس کو دور کریں۔

یہ مقدس ہستیاں مختلف وقتوں میں مختلف مقامات پر مذکورہ غرض کے ماتحت آتی رہیں اور زندگی کے جس پہلو میں کمزوری زیادہ سرایت کی ہوئی تھی اسی کو اپنی تعلیم و تربیت میں زیادہ نمایاں مقام دیتی رہیں، مثال کے طور پر کوئی قوم دنیاداری میں حد سے زیادہ ڈوب کر عیش و عشرت میں مبتلا ہوگئی تھی تو اعتدال کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے دنیا کی بے ثباتی کی طرف زیادہ توجہ دلائی، کوئی قوم تشدد اور سختی کی طرف زیادہ مائل تھی تو نرمی پر زیادہ زور دیا وغیرہ۔

نفسیات کے ماہرین اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ سماجی زندگی کی اصلاح کے سلسلہ میں کہاں کس طرح اور کس حد تک زیادہ زور ڈالنے کی ضرورت ہے کہ اس میں اعتدال کی

؎ تفسیر عزیزی مقدمہ سورۃ انفطار

کیفیت پیدا ہو۔ دراصل یہی اعتدالی کیفیت عملِ صالح کی روح رواں ہے۔[1]

رسول اللہ تعلیم و تربیت کا جامع نظام لے کر تشریف لائے جس میں حالات کے لحاظ سے مختلف طریقے اور مختلف تدبیریں ہیں۔

یہاں تک کہ اللہ نے داعیِ انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا آخری رسول بنا کر بھیجا اور تعلیم و تربیت کا جامع نظام آپ کے سپرد کیا جس میں موقع و محل اور زمانہ کے لحاظ سے سماجی زندگی کی اصلاح کے لئے مختلف طریقے اور مختلف تدبیریں مذکور ہیں چنانچہ جن لوگوں نے قرآن اور سیرت کا مطالعہ سماج کی اصلاح اور اس کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح

---

[1] اسی اعتدال کی کیفیت پیدا کرنے کی بنا پر موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں بعض احکام سخت ملتے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں بظاہر رہبانیت کا شبہ ہوتا ہے مثلاً عیسیٰ علیہ السلام نے دنیا اور دولت سے بے رغبتی کی سخت تاکید فرمائی اور یہودیوں کی انتہائی سخت دلی کے پیش نظر فرمایا کہ اگر "کوئی تمہارے ایک گال میں طمانچہ مارے تو تم اس کے سامنے اپنا دوسرا گال پیش کردو" اور اگر کوئی بے گار میں پکڑ کر تمہیں ایک میل لے جائے تو تم اس کے ساتھ دو میل چلے جاؤ۔" اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے حلت اور حرمت کے بارے میں سخت احکام صادر فرمائے اور پابندیوں اور بندشوں کے سلسلہ میں بتدریج ان کے یہاں سختی کا ذکر ملتا ہے یہ سب کچھ قومی زندگی میں عملِ صالح کی روح پیدا کرنے کے لئے تھا۔

اس مقام کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کیوں کہ جب کبھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا دوسروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو بالعموم اسی قسم کی چیزیں پیش کی جاتی ہیں اور اصل حقیقت نہ سمجھنے کی بنا پر در پردہ ان مقدس ہستیوں کی توہین ہوتی ہے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے بعد "روسو" کا یہ قول قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے کہ "حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں ایک روحانی سلطنت قائم کرنے کے لئے تشریف لائے جس نے مذہبی اور سیاسی نظام کو جدا کر کے ریاست کی وحدت مٹا دی اور اندرونی تفرقے پیدا کر دئے جنہوں نے عیسائی اقوام کو کبھی چین نہ لینے دیا" (ملاحظہ ہو معاہدۂ عمرانی ص ٢٣٨)

دراصل عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں دین اور دنیا مذہب اور سیاست کی کوئی تفریق نہ تھی بعد میں ان کے ماننے والوں نے تفریق پیدا کی اس بنا پر الزام حضرت عیسیٰؑ پر نہیں بلکہ ان کے ماننے والوں پر ہے۔

اس بارے میں "ڈاکٹر جوزف ہیل" کی تحقیق زیادہ قابل قدر ہے وہ کہتے ہیں

"انبیاء و رسل اور بانیانِ مذہب نے اپنے زمانے اور اپنی قوم کی تہذیب و تمدن میں حصہ لیا ہے لیکن جو عالمگیر تبدیلیاں اسلام سے براہِ راست نہایت سرعت کے ساتھ مرتب ہوئی ہیں ان کی نظیر اور کسی مذہب میں نہیں ملتی ہے۔" (تمدن عرب ص ٢٣)

جیسا کہ بیضاوی نے خلافت آدم کی بحث میں کہا ہے۔

وکذلک کل نبی استخلفهم فی عمارة الارض و سیاسة الناس و تکمیل نفوسهم و تنفیذ امره فیهم

واقف ہیں۔

مثال کے طور پر چند یہ ہیں

(۱) قرآن حکیم میں انفاق اور خرچ کے بارے میں مختلف چیزیں ملتی ہیں کہیں جواب میں کہا گیا ہے "قل العفو" (جو کچھ ضرورت سے زائد ہو سب خرچ کر دو) کہیں قرابت دار یتیم اور مسکین وغیرہ پر خرچ کرنے کی تاکید ہے اور کہیں زکوٰۃ کا حکم ہے

اس قسم کی تمام آیتوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری باتیں دراصل حالتوں کے اختلاف کی بنا پر ہیں یعنی یہ بات مسلّم ہے کہ صالح معاشرہ کے بقاء و قیام کے لئے معیشت کا متوازن ہونا ضروری ہے اب اگر یہ توازن اس صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کو چھوڑ کر کثیر آمدنی والوں سے سب کچھ لے لیا جائے اور اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ ہو تو ایسی حالت میں "قل العفو" کا حکم ہے اور اگر یہ توازن زکوٰۃ کی مقررہ مقدار سے پیدا ہو سکتا ہے تو ایسی صورت میں اسی پر اکتفا کرنے کا حکم ہے۔

اسی طرح دفاع کا معاملہ درپیش ہے اور مصارفِ جنگ کا سوال ہے اس کے بغیر چارہ نہیں نظر آتا ہے کہ جو کچھ ہے سب اس راہ میں قربان کر دیا جائے تو ایسے نازک موقع پر ذاتی منفعول کو نظر انداز کر کے تن من دھن سب کے قربان کر دینے کا حکم ہے۔

قرابت داروں کی زندگی اجیرن بنی ہوئی ہے اور خود کے پاس زکوٰۃ کی مقدار نکالنے کے باوجود فاضل سامان موجود ہے تو ایسی حالت میں ہر طرح سے ان کی اعانت کرنا فرض ہے۔

غربت و افلاس اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ طبقاتی کشمکش صرف زکوٰۃ کی مقدار سے نہیں دور ہو سکتی تو سب سے پہلا کام اس کشمکش کو دور کرنا ہے جس طرح بھی ہو۔ غائر نظر ڈالنے سے اس طرح کی بہت سی مثالیں آپ کو مل سکتی ہیں۔

قرآن حکیم نے اچھائیوں کی نشر و اشاعت اور برائیوں سے روکنے کے سلسلہ میں جو روبیہ اختیار کیا ہے اس سے سماجی زندگی کے مختلف دور اور مختلف منزلوں کا پتہ چلتا ہے نہ ساری

اچھائیاں یک بیک اس نے مسلط کی ہیں اور نہ ساری برائیوں سے دفعتہً روک دیا ہے بلکہ ۲۳ سال میں سماج کے مزاج اور اس کی نفسیات کو سامنے رکھ کر سہتے سہتے ایک مکمل نظام پیش کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یکے بعد دیگرے جو نئی چیز سامنے آئی لوگوں نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔

آج دنیا کے سامنے شراب کا معاملہ کتنا نازک اور اہم ہے امریکہ نے اس بارے میں ۱۹۳۵ء تک سب کچھ کر کے دیکھ لیا اور بالآخر اُسے قانون واپس لینا پڑا۔ عربی زبان میں اس کے لئے ڈیڑھ سو کے قریب الفاظ ملتے ہیں جس سے اہلِ عرب کی فریفتگی اور شیفتگی کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ شراب ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی قرآنِ حکیم نے اس کی ممانعت میں جو طریقہ اختیار کیا وہ قابلِ غور ہے ایک مرتبہ اس نے کہا کہ شراب میں نفع (عارضی سرور) و نقصان دونوں ہیں لیکن نقصان اور برائی اس میں زیادہ ہے۔ ۲/۲۱۹

اس سے یہ ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کی کہ چیزوں کے استعمال میں صرف نفع ہی نہ دیکھنا چاہیئے بلکہ نفع اور نقصان دونوں کو تولنا چاہیئے جس چیز میں نقصان زیادہ ہو اسے ترک کر دینا چاہیئے اگرچہ تھوڑا نفع بھی ہو اور جس چیز میں زیادہ نفع ہو اسے اختیار کرنا چاہیئے اگرچہ اس میں کچھ نقصان کا بھی احتمال ہو ابتداء میں اس کی حیثیت مشورہ کی تھی جس کا مقصد شراب کے نقصان کو ذہن میں بٹھانا تھا اس ابتدائی مرحلہ میں شراب کے اس عارضی نفع کو بھی تسلیم کر لیا جو اُن کے خیال میں تھا کہ اس سے لڑائی لڑنے میں مدد ملتی ہے اور سرور کی خاص کیفیت پیدا ہو کر غم غلط ہو جاتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے اس موقع پر کس قدر ان کے جذبات کا لحاظ رکھا پھر دوسری مرتبہ نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا ۴/۴۳ اس سے کم سے کم اتنا تو ہو گیا کہ نماز اور اس کے وقت کے قریب شراب پینے پر پابندی لگ گئی پھر جب ان کی طبیعت ہموار ہو گئی اور مستقل نقصان کی خاطر عارضی نفع کو چھوڑنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تو شراب پر دائمی پابندی کا حکم آگیا اور اس شد و مد کے ساتھ کہ "رجس من عمل الشیطٰن فاجتنبوہ لعلکم تفلحون ۵/۹۰ یہ شیطانی حرکتوں کی گندگی ہے تم اس سے پرہیز کرو تاکہ فلاح پاؤ۔

راوی کا بیان ہے کہ جس دن دربارِ نبوت کی جانب سے یہ اعلان کیا گیا ہے مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب بہہ رہی تھی اور جو جس حالت میں شراب لئے ہوئے تھا اسی حالت میں اس نے پھینک دی حتیٰ کہ جام ...

یہ تھی شارع علیہ السلام کی پیشین گوئی کہ

"إن الله عزوجل يبعث لهذه الامة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها"

(۳) امام اشعری نے اسلامی فکر کے دھارے کا رخ غلط جہت سے ہٹا کر صحیح اسلامی جہت کی طرف موڑ دیا۔ لیکن پوری صدی کا امتدادِ زمانی بہت ہوتا ہے۔ جاہلی طاقتیں اسلامی سماج پر دوسرے رخنوں سے حملہ آور ہوئیں۔ امام اشعری نے ۳۲۳ھ میں وفات پائی۔ ان کی دفات کے دس سال بعد ہی قلمروئے اسلامیہ میں ایک انقلابِ عظیم آیا۔ ۳۳۴ھ میں دربارِ خلافت پر آل بویہ کا تسلط ہو گیا۔ بویہی تسلط عجمی جاہلیت کا بدترین نمونہ تھا اور اس نے بہت جلد پورے اسلامی سماج کو مسموم کر دیا۔ بدعتوں کا زور ہوا، ہزیمت خوردہ عجمیت کو دل کھول کر اسلام سے انتقام لینے کا موقعہ ملا۔ معتزلہ کی بدعتِ قدیمہ اور بویہیوں کے کینہ آمیز رفض نے مل کر الحاد و بے دینی کی ایک عجیب معجون مرکب پیدا کی اور مصیبت یہ ہوئی کہ یہ بے دینی عوام و خواص دونوں میں پھیلنا شروع ہوئی۔ جاہلیت کا یہاں تک غلبہ ہوا کہ دینِ متین کے انصار یعنی علمار اہلِ سنت گوشۂ عزلت میں مختفی ہو گئے۔ عوام طریقِ سنت سے ناآشنائے محض تھے۔ اور امرار کی مجالسِ علمیہ میں اہلِ سنت والجماعت کے مسلکِ قدیم کو بچشمِ ازدرار دیکھا جاتا تھا۔ ہر طرف رفض و اعتزال کا دور دورا تھا۔ حافظ ابن عساکر نے اس فاسد سماج کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے

وكانت شوكة المعتزلة بالعراق	معتزلہ کا اثر و رسوخ عراق میں بہت زیادہ تھا
شديدة الى ان كان زمن الملك	یہاں تک کہ بادشاہ پناہ خسرو کا زمانہ آیا وہ علم
فناخسرة وكان ملكا يحب العلم	اور علمار سے محبت رکھتا تھا اور اس کے یہاں
والعلماء وكانت له مجالس يعقد	علمار اور ان کے باہمی مناظرات کے لئے جلسے
فيها للعلماء ومناظرتهم وكان	ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس کا قاضی القضاۃ اس
قاضي القضاة في وقته معتزليا	زمانے میں معتزلی تھا۔ ایک دن پناہ خسرو نے
فقال له فناخسرة يوما:۔ هذا	اس سے کہا، یہ جلسے علمار سے معمور رہتے ہیں

المجلس عامر من العلماء الا انا لا
ادری احدا من اهل سنة والاثبات
ینصرون مذهبه فقال له: ان
هؤلاء القوم عامة رعاع اصحاب
تقلید والخبار وروایات یروون
الخبر وضده ویعتقدونهما
احدهما ناسخ المتنافی او متاول
ولا اعرف منهم احدا یقوم بهذا
الامر... وهذا الفاسق انما
اراد اطفاء نور الحق

(تبیین کذب المفتری ص۱۲۱)

لیکن میں اہلِ سنت میں سے کسی کو نہیں دیکھتا
جو یہاں اپنے مذہب کی تائید و نصرت کرتا ہو۔
قاضی نے جواب دیا یہ لوگ عام بے وقوفوں
میں سے ہیں تقلید و روایتِ حدیث ان کا کام
ہے۔ متضاد احادیث روایت کرتے ہیں اور
ان پر اعتقاد بھی رکھتے ہیں ایک اُن میں سے
دوسری کی ناسخ ہوتی ہے یا مؤل۔ مجھے تو اُن
میں کوئی ایسا شخص نہیں معلوم جو اس امرِ خطیر
کو انجام دے سکے (اس علمی مجلس میں اپنے
مسلک کی تائید و حمایت کر سکے) لیکن واقعہ
یہ ہے کہ اس فاسق نے حق کی روشنی کو بجھانا چاہا تھا۔

لیکن بادشاہ کو اس جواب سے تشفی نہیں ہوئی اور اُس نے علماءِ اہلِ سنت کی تلاش پر اصرار کیا تو معلوم ہوا کہ بصرے میں دو عالم ہیں ایک بوڑھا (ابو الحسن الباہلیؒ) اور دوسرا جوان (قاضی ابو بکر الباقلانیؒ) بادشاہ نے شیراز سے جو اس کا پایۂ تخت تھا انھیں بلا بھیجا لیکن امام ابو الحسن الباہلیؒ کے زہد و تقویٰ نے انھیں جانے کی اجازت نہ دی، البتہ امام باقلانی نے محض نصرتِ دین و اعانتِ سنت کی خاطر شیراز جانے کا ارادہ کر لیا اور وہاں جا کر بر سرِ دربارِ عام معتزلہ کو شکست دی اور اس طرح سنت کے جھنڈے کو بلند کیا۔ خود بادشاہ اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے اپنے بیٹے کو قاضی باقلانی کے سپرد کیا کہ وہ اسے مذہب اہلِ سنت کی تعلیم دیں اور قاضی باقلانی نے اس کے واسطے کتاب "التمہید" تصنیف کی۔ انھی کی نصرتِ دین کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی فکر کے دھارے کا رُخ بدعت و ضلالت اور کفر و جہالت سے مڑ کر اسلام و سنت کی جانب منعطف ہو گیا۔ اُن کی عظمتِ شان اور جلالتِ قدر کے متعلق ابو عبد اللہ صیرفی کہتے ہیں۔

"وكان صلاح القاضي اكثر من علمه وما نفع الله هذه الامة بكتبه وبثها فيهم الا لحسن سريرته ونيته واحتسابه ذالك عند ربه"

قاضی ابو بکر باقلانی کا صلاح و تقویٰ ان کے علم و فضل سے زیادہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے جو اُن کی کتابوں سے اس امت کو فائدہ پہنچایا اور اُس میں اُن کتابوں کی نشر و اشاعت ہوئی اُس کی وجہ وجیہہ قاضی باقلانی کی نیک نیتی اور اُن کا محاسبہ عند الرب کا عقیدہ تھی (تبیین)

دوسرے بزرگ کا قول ہے۔

"وكان حصنا من حصون المسلمين وما سر اهل البدعة بشيء كسرورهم بموته"

قاضی ابو بکر باقلانی مسلمانوں کے محفوظ قلعوں میں سے ایک قلعہ تھا تھے اور اہلِ بدعت کو کسی چیز سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اُن کی موت سے۔ (تبیین کذب المفتری)

لیکن امام باقلانی نے اپنی مساعیِ جمیلہ سے اسلامی سماج کی کہاں تک اصلاح کی اور اسلامی فکر کے دھارے کو صحیح سمت میں موڑنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کے لئے انھیں بزرگ کا قول پڑھیئے کہ

"وما سر اهل البدعة بشيء كسرورهم بموته رحمة الله عليه ورضوانه الا انه خلف بعده من تلاميذه جماعة كثيرة تفرقوا في البلاد، اكثرهم بالعراق وخراسان ونزل منهم الى المغرب رجلان احدهما ابو عبد الله الازدي رضي الله عنه وبه انتفع اهل قيروان وترك بها من تلاميذه

اہلِ بدعت کو کسی چیز سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنا کہ اُن کی موت سے، اللہ کی رحمت و رضوان اُن پر نازل ہو مگر انھوں نے اپنے پیچھے اپنے تلامذہ کی کثیر جماعت چھوڑی جو مختلف شہروں میں پھیل گئی زیادہ تر عراق و خراسان میں اُن میں سے دو شخص مغرب میں پہنچے ایک ابو عبد اللہ الازدی رضی اللہ عنہ اور اُن سے اہلِ قیروان نے بہت زیادہ استفادہ کیا اور وہاں انھوں نے اپنے صاحبِ علم و فضل شاگردوں کی ایک مشہور جماعت چھوڑی۔ . . . . . اور دوسرے

مبرزین مشاہیر جماعۃ ... ابو طاہر البغدادی ہیں ...... کہ اگر وہ

... والثانی ابو الطاہر البغدادی نہ ہوتے تو مغرب میں علم دین ضائع ہو جاتا۔

...... ولولاہ لضاع العلم

بالمغرب (تبیین کذب المفتری)

قاضی ابو بکر باقلانی نے مائہ رابعہ کے سرے پر ۴۰۳ھ میں وفات پائی اُن کی جلالت قدر خود اُس زمانہ میں اس درجہ مشہور ہو چکی تھی کہ اس وقت کے امام کبیر ابو الفضل تمیمی برہنہ پا ان کے جنازہ کے ہمراہ تھے اور ان کے حکم سے منادی ان کے جنازے کے سامنے کہتا جاتا تھا۔

"ھذا ناصر السنۃ والدین، ھذا امام المسلمین، ھذا الذی یذب عن الشریعۃ السنۃ المخالفین ھذا الذی صنف سبعین الف ورقۃ ردا علی الملحدین"

یہ سنت و دین کا مددگار ہے، یہ مسلمانوں کا امام ہے، یہ وہ ہے جو شریعت پر مخالفین کی دریدہ دہنی کو روکتا تھا، یہ وہ ہے جس نے ملاحدہ کے رد میں ستر ہزار اوراق تصنیف کیے۔

(تبیین ص۲۲۱)

یہ وہ امور ہیں جن سے قاضی ابو بکر باقلانی رحمہ اللہ کا مائہ رابعہ کا مجدد ملت ہونا مسلم ہوتا ہے۔ اور ان خدمات جلیلہ کا پتہ چلتا ہے جن کے ذریعہ انھوں نے اسلامی معاشرہ کی تجدید کی اور اسلامی فکر کے دھارے کا رُخ صحیح سمت میں موڑا۔

قاضی ابو بکر باقلانی چوتھی صدی کے سرے پر دنیا سے رخصت ہوئے اور اُن کی ذات سے صادق مصدوق کی اس دیرینہ پیشینگوئی کا ایک مرتبہ پھر تحقق ہوا کہ

"ان اللہ عزوجل یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا"

امام باقلانی کی کوششوں اور اُن کے جانشینوں کی مساعی جمیلہ سے اسلامی سماج کی تجدید ہوئی۔ اسلامی فکر کو ماؤف کرنے والی جاہلی طاقتوں کا استیصال ہوا۔ عوام میں سنت

کی طرف رغبت ہوئی اور سنت بےزار اور اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے نفرت۔ اس کا اثر سیاسی حالات پر بھی پڑنا ضروری تھا۔ بویہی حکومت اور اس کی اسلام دشمن اور جاہلیت نواز پالیسی سے عوام میں ایک گونہ بیزاری پیدا ہوئی اور نئے انقلاب کے لئے ماحول سازگار ہونے لگا، یہاں تک کہ ۴۴۷ھ میں سلاجقہ نے آل بویہ کا خاتمہ کر کے دربارِ خلافت پر اقتدار حاصل کر لیا۔ آل سلجوق سنی تھے، اس طرح اسلامی سماج میں طریق سنت کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ علماء سنت کو فروغ ہوا۔ مگر سلاجقہ اپنے ساتھ وسط ایشیا کی ملوکیت اور جاگیرداری لے کر آئے تھے اس جاگیردارانہ نظام کے مفاسد "الناس علی دین ملوکھم" کے مصداق اسلامی معاشرہ میں خلط ملط ہونے شروع ہوئے۔ امراء میں تجبر و رعونت، علماء میں جاہ پرستی اور انانیت اور عوام میں افلاس۔ ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سطح پر اسلامی سماج اسلامی تھا اور بظاہر سنت کا غلبہ تھا مگر اس کی روح مردہ ہو رہی تھی، للّٰہیت کے بجائے نفسانیت اور آخرت پسندی کی بجائے عقبیٰ فراموشی کا دور دورہ بڑھتا جا رہا تھا۔ سماج کے اعماقِ قلب سے ندا بلند ہونی ناگزیر تھی کہ

بس کن ز کبر و ناز کہ دیدہ است روزگار چینِ قبائے قیصر و طرفِ کلاہِ کے

خود سماج کے تقاضے ایک خصوصی تعلیم کے لئے دامن گیر تھے جو غیر اسلامی نہیں بلکہ اسلامی ہے، جو رہبانیت سے ماخوذ نہیں بلکہ مشکوٰۃ نبوت سے مستنیر ہے، جو جوگ و اشراق کا ورثہ نہیں بلکہ اصحاب صفہ کی مقدس یادگار ہے جسے "چنیا بیگم" سے تعبیر کرنا نہ صرف کم سوادی و بےبصیرتی کی دلیل ہے بلکہ مارکس اور لینن کی گمراہ کن سنت کی تقلید اور اس کی مادیت کے ساتھ استرضاء کا ثبوت ہے۔ یہ نظامِ فکر جو اس عہد کے قسی القلب اور آخرت فراموش رجحانات کے ردِ عمل اور اصلاح کے لئے فروغ طلب ہوا وہی چیز ہے جسے اسلامیات کی اصطلاح میں "تصوف" کہتے ہیں۔ بہر کیف فضا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر جانب سے یہی صدا آ رہی ہے۔

"الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ وما نزل من الحق"

"ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم، وکثیر منھم فاسقون"

کیا یہ پیغام ازلی عہد سلجوقی کے مومن گر عقبیٰ فراموش قسی القلب سماج سے زیادہ کسی اور سماج کے تنبہ کے لئے ساز گار ہو سکتا ہے؟ کیا یہ غیبی صدا جس نے داؤد طائیؒ کو ایک ڈاکو سے سرتاجِ اولیا ر بنا دیا اس سماج کی اصلاح نہیں کر سکتی تھی جس پر یہ پورا پورا صادق آ رہا تھا۔

"زین للناس حب الشہوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث ذلک متاع الحیوٰۃ الدنیا واللہ عندہ حسن المآب۔"

کیا اس وقت اس منشورِ الٰہی کے نشر و اعلام کی ضرورت نہ تھی کہ

"انما الحیوٰۃ الدنیا لعب ولھو وان تؤمنوا وتتقوا یؤتکم اجورکم ولا یسئلکم اموالکم"

کیا تاریخِ اسلام کے ادوار میں سے اس دور سے زیادہ کوئی دور اس حقیقت کا مصداق ہو سکتا ہے کہ

"اعلموا انما الحیوٰۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد کمثل غیث اعجب الکفار نباتہ ثم یھیج فتراہ مصفرا ثم یکون حطاما وفی الاخرۃ عذاب شدید۔ ومغفرۃ من اللہ ورضوان وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور"

کیا دنیوی دل کشی سے مسحور اس سے زیادہ اور کوئی سماج ہو سکتا تھا جسے اس دنیائے دنی کی لذاتِ فانیہ کے فریب سے متنبہ کرنے کی ضرورت ہو۔

یا ایھا الناس ان وعد اللہ حق فلا تغرنکم الحیوٰۃ الدنیا ولا یغرنکم باللہ الغرور

لہٰذا وقت کے برگزیدہ نقیب اور داعی کا فرض تھا کہ وہ پکار کر کہہ دے۔

یا قوم ان ھذہ الحیوٰۃ الدنیا متاع وان الاخرۃ ھی دار القرار

پس اُس نے انھیں مبہم الفاظ میں بتا دیا۔

بل تؤثرون الحیوٰۃ الدنیا والاخرۃ خیر وابقیٰ،

یہ بتانے والا امام غزالی تھا جس نے اسلامی سماج کی پانچویں صدی میں تجدید کی جب کہ معاشرہ میں رفق و لینت کے بجائے قساوت، احتساب باطن کے بجائے ظاہر پرستی، للٰہیت

کی طرف رغبت ہوئی اور سنت سے بیزاری اور اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے نفرت۔ اس کا اثر سیاسی حالات پر بھی پڑنا ضروری تھا۔ بویہی حکومت اور اُس کی اسلام دشمن اور جاہلیت نواز پالیسی سے عوام میں ایک گونہ بیزاری پیدا ہوئی اور نئے انقلاب کے لئے ماحول سازگار ہونے لگا، یہاں تک کہ ۴۴۷ھ میں سلاجقہ نے آل بویہ کا خاتمہ کر کے دربارِ خلافت پر اقتدار حاصل کر لیا۔ آل سلجوق سنی تھے، اس طرح اسلامی سماج میں طریق سنت کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ علماء سنت کو فروغ ہوا۔ مگر سلاجقہ اپنے ساتھ وسط ایشیا کی ملوکیت اور جاگیرداری لے کر آئے تھے اس جاگیردارانہ نظام کے مفاسد "الناس علی دین ملوکھم" کے مصداق اسلامی معاشرہ میں خلط ملط ہونے شروع ہوئے۔ امراء میں تجبر و رعونت، علماء میں جاہ پرستی اور انانیت اور عوام میں افلاس۔ ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سطح پر اسلامی سماج اسلامی تھا اور بظاہر سنت کا غلبہ تھا مگر اس کی روح مردہ ہو رہی تھی، للّٰہیت کے بجائے نفسانیت اور آخرت پسندی کی بجائے عقبیٰ فراموشی کا دور دورہ بڑھتا جا رہا تھا۔ سماج کے اعماقِ قلب سے ندا بلند ہونی ناگزیر تھی کہ

بس کن ز کبر و ناز کہ دیدہ است روزگار — چینِ قبائے قیصر و طرفِ کلاہِ کے

خود سماج کے تقاضے ایک خصوصی تعلیم کے لئے دامن گیر تھے جو غیر اسلامی نہیں بلکہ اسلامی ہے، جو رہبانیت سے ماخوذ نہیں بلکہ مشکوٰۃ نبوت سے مستنیر ہے، جو جوگ و اشراق کا ورثہ نہیں بلکہ اصحاب صفہ کی مقدس یادگار ہے جسے "چنیا بیگم" سے تعبیر کرنا نہ صرف کم سوادی و بے بصیرتی کی دلیل ہے بلکہ مارکس اور لینن کی گمراہ کن سنت کی تقلید اور اس کی مادیت کے ساتھ استرضاء کا ثبوت ہے۔ یہ نظامِ فکر جو اس عہد کے قسیٔ القلب اور آخرت فراموش رجحانات کے ردِ عمل اور اصلاح کے لئے فروغ طلب ہوا وہی چیز ہے جسے اسلامیات کی اصطلاح میں "تصوف" کہتے ہیں۔ بہر کیف فضا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر جانب سے یہی صدا آ رہی ہے۔

"الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ وما نزل من الحق"

"ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم، وکثیر منھم فاسقون"

کیا یہ پیغام ازلی عہد سلجوقی کے مومن گر عقبیٰ فراموش قسی القلب سماج سے زیادہ کسی اور سماج کے تنبہ کے لئے سازگار ہوسکتا ہے؟ کیا یہ غیبی صدا جس نے داؤد طائیؒ کو ایک ڈاکو سے سرتاجِ اولیاء بنا دیا اس سماج کی اصلاح نہیں کرسکتی تھی جس پر پورا پورا صادق آرہا تھا۔

"زین للناس حب الشھوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث ذلک متاع الحیوٰۃ الدنیا واللہ عندہٗ حسن المآب"

کیا اس وقت اس منشورِ الٰہی کے نشر و اعلام کی ضرورت نہ تھی کہ

"انما الحیوٰۃ الدنیا لعب ولھو وان تؤمنوا وتتقوا یؤتکم اجورکم ولا یسئلکم اموالکم"

کیا تاریخِ اسلام کے ادوار میں سے اس دور سے زیادہ کوئی دور اس حقیقت کا مصداق ہوسکتا ہے کہ

"اعلموا انما الحیوٰۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد کمثل غیث اعجب الکفار نباتہ ثم یھیج فتراہ مصفرا ثم یکون حطاما وفی الاخرۃ عذاب شدید۔ ومغفرۃ من اللہ ورضوان وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور"

کیا دنیوی دل کشی سے مسحور اس سے زیادہ اور کوئی سماج ہوسکتا تھا جسے اس دنیائے دنی کی لذاتِ فانیہ کے فریب سے متنبہ کرنے کی ضرورت ہو۔

یاایھا الناس ان وعد اللہ حق فلا تغرنکم الحیوٰۃ الدنیا ولا یغرنکم باللہ الغرور

لہٰذا وقت کے برگزیدہ نقیب اور داعی کا فرض تھا کہ وہ پکار کر کہہ دے۔

یاقوم ان ھذہ الحیوٰۃ الدنیا متاع وان الاخرۃ ھی دار القرار

پس اُس نے انھیں مبہم الفاظ میں بتا دیا۔

بل تؤثرون الحیوٰۃ الدنیا والاخرۃ خیر وابقیٰ۔

یہ بتانے والا امام غزالی تھا جس نے اسلامی سماج کی پانچویں صدی میں تجدید کی جب کہ معاشرہ میں رِفق و لینت کے بجائے قساوت، احتساب باطن کے بجائے ظاہر پرستی، للّٰہیت

کے بجائے نفسانیت بڑھتی جا رہی تھی۔ ازالۂ مرض کے لئے اسی دوا کی ضرورت تھی جو امام غزالی نے تجویز کی۔ روزانہ عملی زندگی کی تنظیم کے لئے کتاب و سنت کی روشنی میں ایک ضابطہ مرتب کیا۔ انھوں نے اسلامی معاشرہ کو یاد دلایا کہ اس کی زندگی جو ابتدا، قلب و دماغ، عقل و عشق، روحانیت و مادیت اور دنیا و آخرت کا متوافق بالذات اور ہم آہنگ نظام تھی رفتہ رفتہ یک رخی ہوتی جا رہی ہے اور اس میں سے محاسبۂ آخرت، روحانیت اور عشق کا عنصر یوماً فیوماً مفقود ہوتا جا رہا ہے۔

امام غزالی نے ۵۰۵ھ میں وفات پائی اور وہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئی کے مطابق کہ

"ان اللہ عزوجل یبعث لھذہ الامۃ علیٰ رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا"

مائۂ خامسہ کے مجدد تھے جنہیں اللہ عزوجل نے پانچویں صدی کے سرے پر تجدید دین اور اصلاحِ امت کے لئے مبعوث فرمایا۔ یہ جو آج ہماری زندگی میں تھوڑا بہت روحانیت کا امتزاج ہے یہ جو احتساب باطن کا جذبہ اور محاسبۂ آخرت کا اعتقاد ہے اس میں بہت کچھ امام غزالی رحمہ اللہ کی مساعیِ جمیلہ کا بھی دخل ہے۔ وجیز اور مستصفی الاصول بڑے پایہ کی کتابیں ہیں اور امام صاحب کے استقلالِ فکری کی شاہد ہیں لیکن جس نے ان کے نام کو اسلامی سماج میں زندۂ جاوید بنا دیا ہے وہ اُن کی تصوف کے متعلق تصانیف ہیں بالخصوص احیاء العلوم جو ہمارے ادبیاتِ عالیہ میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ تاریخ اسلامی کی زیر سطحی (under current) رووں کا مطالعہ کیجئے ناگزیر طور پر آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ پانچویں صدی میں اسلامی سماج سے اگر کوئی چیز کھوئی سی جا رہی تھی جس کا فقدان پورے اسلامی معاشرے کو فنا کے گڑھے میں ڈال سکتا تھا تو وہ اسلام کی وہ تعلیم تھی جسے فقہاء و محدثین تقرب و احسان اور زہد و رفاق سے تعبیر کرتے تھے اور دوسرے علماء تصوف کے نام سے۔ مگر مدعیوں کے فسادِ ذوق اور اعوجاجِ ذہنی کو کیا کہیئے کہ دنیا کے طلب گاروں نے اس وقت کے اہم تقاضے کو، معالج کی صحیح تجویز کو، معالج کا نقص، اصل مرض کے بگاڑ کا باعث اور "چنیا بیگم" بتایا ہے "نیا للعجب"۔ مارکس کا نظریہ کائنات غلط ہے لیکن اگر اس نے مذہب کو صعالیک کے حق میں

افیون بتایا تو اس کے مبادی و مسلمات کا یہ منطقی نتیجہ تھا لیکن مدعیانِ تجدید کو کیا کہا جائے جو "ان الذین لا یرجون لقاءنا ورضوا بالحیوۃ الدنیا واطمأنوا بہا والذین ہم عن آیاتنا غافلون۔ اولٰئک مأواہم النار بما کانوا یکسبون" پر ایمان کے مدعی ہیں مگر اس حقیقتِ حقہ کے عملی تحقق کا جو ذریعہ ہے اُسے "چنیا بیگم" سے تعبیر کر کے اپنی "بلندی ذوق" کے ساتھ ساتھ اس عقیدت کا بھی غیر شعوری طور پر اظہار کرتے ہیں جو انھیں مارکس اور لینن کے ساتھ ہے۔

اگر تاریخ کا مزید تتبع و تفحص کیا جائے تو بعد کے مجددین ملت کے تجدیدی کاموں کی نوعیت بھی متعین ہو سکتی ہے مگر خوفِ تطویل اس بحث کو تکمیل تک پہنچانے سے مانع ہے۔ یہ ہے اسلام کا فلسفہ تاریخ جس کی اساس حدیث مجدد دین ملت ہے کہ

"ان اللہ عزوجل یبعث لہذہ الامۃ علی رأس کل مأئۃ سنۃ من یجدد لہا دینہا"

اور جسے مدعیان فلسفہ تجدید نے باوصف دعوائے اجتہاد و تحقیق اس بے دردی سے نظر انداز کیا ہے جس کی توقع کم از کم اسلامی فرقوں میں سے تو کسی سے ہو نہیں سکتی۔

۳۔ اسلام کا فلسفہ تاریخ اور مفکرینِ اُمت کا اجماع

سطورِ گذشتہ میں اسلامی تاریخ کے فلسفہ کی تاریخ اسلام کی سطحی و زیرِ سطحی تحریکوں کی روشنی میں توضیح کی گئی ہے لیکن یہ انداز فکر نیا نہیں ہے۔ عام مفکرین ملت نے اس کی صحت و ثاقت پر مہر توثیق ثبت فرمائی ہے۔ صدرِ اول میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابی علقمہؒ بعد کے بزرگوں میں شراحیل بن یزید المعافری، سعید بن ابی ایوب، ابن وھب، سلیمان بن داؤد المہری اور امام ابو داؤد سجستانی رحمہم اللہ اور وہ بے شمار بزرگانِ کرام جن سے ان حضرات نے حدیث مجدد دین ملت کو روایت کیا، اسلامی تاریخ کے فلسفہ کو کچھ اسی انداز میں سمجھتے تھے۔ یہ پہلی تین صدیوں کے بزرگ ہیں تیسری صدی میں خصوصیت کے ساتھ امام احمد بن حنبل کا ذکر ضروری ہے۔ حافظ ابن عساکر نے تبیین صفحہ ۸ میں ان کا قول نقل فرمایا ہے:

"قال احمد بن حنبل فکان فی المائۃ الاولی عمر بن عبد العزیز وفی المائۃ الثانیۃ الشافعی"

"احمد بن حنبل فرماتے تھے پس پہلی صدی میں عمر بن عبد العزیز اور دوسری صدی میں شافعی معلم و مجدد دین تھے"

امام احمد بن حنبل کا سال وفات ۲۴۱ھ اور امام ابی داؤد سجستانی کا سال وفات ۲۵۶ھ ہے یہ دونوں بزرگ تیسری صدی سے تعلق رکھتے ہیں مگر چوتھی صدی میں بھی یہی انداز فکر جاری رہا۔ حافظ ابن عساکر نے امام ابی سہل الصعلوکی (المتوفی ۳۶۹ھ) یا امام ابی بکر اسمٰعیلی (المتوفی ۳۹۶ھ) کا قول نقل کیا ہے۔

"اعاد اللہ تعالیٰ ہذا الدین بعد ماذہب یعنی اکثرہ باحمد بن حنبل وابی الحسن الاشعری وابی نعیم الاستر آبادی"

"اللہ تعالیٰ نے اس دین کو پھر سے لوٹایا بعد اس کے کہ اکثر اس کا جاتا رہا تھا، احمد بن حنبل اور ابی الحسن الاشعری اور

ابی نعیم استرآبادی کے ذریعہ"

حافظ ابن عساکر نے ایک اور واقعہ بشیخ ابوالولید حسان بن محمد سے روایت کیا ہے۔

"۳۰۳ھ میں ایک دن ہم قاضی ابوالعباس بن سریج کی مجلس میں تھے کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر انھیں خوشخبری سنائی کہ قاضی صاحب اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر اپنے کسی بندے کو مبعوث فرماتا ہے جو اُس کے دین کی تجدید کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مائۃ اولیٰ کے سرے پر عمر بن عبدالعزیز کو مبعوث فرمایا اور انھوں نے ۱۰۱ھ میں وفات پائی اور دوسری صدی کے سرے پر ابا عبداللہ محمد بن ادریس الشافعی کو مبعوث فرمایا اور انھوں نے ۲۰۴ھ میں وفات پائی اور آپ کو تیسری صدی کے سرے پر مبعوث فرمایا پھر وہ کہنے لگا۔

"دو شخص ہیں کہ گذر گئے پس اُن میں برکت ہو گئی ــــ خلیفہ عمر (بن عبدالعزیز) پھر خلف مسعود روشن شافعی (جن کا نام) محمد ہے ..... ــــ وارث نبوت ہیں در جناب نبی کریم کے چچیرے بھائی ہیں

اے ابا العباس آپ کو خوشخبری ہو کہ آپ تیسرے ہیں ــــ اُن کے بعد احمد کے مزار کو سیراب کرنے کے لئے"

پس ابوالعباس قاضی نے چیخ ماری اور روئے اور کہا تو نے میری خبر مرگ مشہور کر دی۔ بشیخ ابوالولید کہتے ہیں کہ قاضی ابوالعباس نے اسی سال وفات پائی۔ حاکم ابوعبداللہ کہتے ہیں کہ جب میں نے اس حکایت کو روایت کیا تو لوگوں نے اس کو لکھ لیا اور جن لوگوں نے اسے لکھا تھا اُن میں سے ایک شیخ ادیب و فقیہ تھا جب دوسری مجلس منعقد ہوئی تو حاضرین میں سے کسی نے مجھ سے کہا کہ اس شیخ نے ان ابیات میں کچھ اضافہ کیا ہے اور اس میں شیخ ابوالطیب سہل بن محمد کا ذکر کر کے انھیں چوتھی صدی کے سرے پر رکھا ہے تو میں نے اس فقیہ سے دریافت کیا اور اُس نے اپنا قصیدہ مدحیہ سنایا۔

اور چوتھے مشہور سہل محمد ہیں ــــ جو ہر مومن کے نزدیک امام ہیں

مسلمان سب کے سب اُن کے پاس پناہ لیتے ہیں ــــ علم کے باب میں جب کوئی انھیں امر خطیر لاحق ہوتا ہے۔

ہمیشہ ہمارے درمیان شیخ خلائق بنے رہے ــــ اور مذہب پسندیدہ و مختار کے بہترین مجدد تھے

حاکم کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا اور کچھ نہ بولا تو اس سے مجھے بڑا صدمہ ہوا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسی سال اُن کی وفات مقدر کر دی"

اس طرح چوتھی صدی اور پانچویں صدی میں بھی تجدید ملت کے باب میں علماء متفکرین کا عام انداز فکر یہی تھا۔ حافظ ابن عساکر نے امام ابوالحسن علی بن المسلم السلمی کا یہ قول نقل کیا ہے جو انھوں نے خود جامع دمشق میں حدیث مجدد دین ملت کے سلسلے میں خود اُن کی زبان سے سنا تھا۔

كان على رأس المائة الاولى عمر بن عبد العزيز وكان على رأس المائة الثانية محمد بن ادريس	پہلی صدی کے سرے پر عمر بن عبدالعزیز تھے دوسری صدی کے سرے پر محمد بن ادریس شافعی تھے تیسری صدی کے سرے پر امام اشعری تھے اور چوتھی صدی

الشافعی وکان علی رأس المائة الثالثة الاشعری وکان علی المائة الرابعة ابن الباقلانی وکان علی رأس المائة الخامسة الامیر المؤمنین المسترشد باللہ"۔

کے سرے پر ابن الباقلانی اور پانچویں صدی کے سرے پر امیر المومنین مسترشد باللہ تھے۔

اگرچہ خود حافظ ابن عساکر کی اپنی رائے مائۂ خامسہ کے مجدد کے متعلق یہ ہے کہ وہ امام غزالی تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

"وعندی ان الذی کان علی رأس الخمس مائة الامام ابو حامد محمد الغزالی"۔

یہ چھٹی صدی ہجری کے بزرگ ہیں اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صدی میں بھی قرون ماضیہ کی طرح اسلام کے فلسفہ تاریخ اور تجدید دین کی توجیہہ و توضیح اسی انداز میں کی جاتی تھی۔ اگلی صدیوں میں بھی یہی انداز فکر برقرار رہا چنانچہ حافظ جلال الدین السیوطی رحمہ اللہ نے اس باب میں ایک ارجوزہ بنام "تحفۃ المہتدین باخبار المجددین" تصنیف فرمایا ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

الحمد للہ العظیم المنة	المانح الفضل لاھل السنة
ثم الصلوٰة والسلام نلتمس	علی نبی دینہ لا یندرس
لقد اتی فی خبر مشتھر	رواہ کل حافظ معتبر
بانہ فی رأس کل مائة	یبعث ربنا لھذہ الامة
منا علیھا عالما یجدد	دین الھدی لانہ مجتھد
فکان عند المائة الاولی عمر	خلیفة العدل باجماع وقر
والشافعی کان عند الثانیة	لما لہ من العلوم السامیة
وابن سریج ثالث الائمة	والاشعری عدہ من امة
والباقلانی رابع اوسھل او	الاسفرائنی خلف قد حکوا

غرض صدر اسلام سے جب کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حدیث مجددین ملت کو اپنے تلامذہ سے روایت کیا آج کے دن تک اسلام کے فلسفۂ تاریخ کی اساس اسی حدیث مجددین ملت پر استوار کی جاتی ہے اور تجدید دین کے اہم مسئلہ کو کچھ اسی انداز میں سمجھا جاتا ہے۔ جو ہم نے گذشتہ سوال کے جواب میں "تاریخ کی شہادت" کے عنوان سے اختیار کیا ہے۔

وما توفیقی الا باللہ

ادبیات

غزل

از

(جناب الم مظفر نگری)

صبا ٹھہرے نہ گل ٹھہرے نہ جو نغمہ خواں ٹھہرے
خدا جانے کہاں یہ کاروانِ گلستاں ٹھہرے

سفر ہی زندگی ہے گرم رفتارانِ منزل کی
سرِ فانوس کیوں پروانۂ آتش بجاں ٹھہرے

ہو فرضِ بندگی حدِ تعین میں ادا کیوں کر
یہاں جتنے کئے سجدے وہ سب ہی رائگاں ٹھہرے

حجابِ حسن ہیں یہ شورشیں آثارِ ہستی کی
نظر منزل تو آ جائے جو گردِ کارواں ٹھہرے

چھپائے رازِ دل اپنا وہاں کوئی نہیں ممکن
کہ جس محفل میں خاموشی بھی شرحِ داستاں ٹھہرے

بہاروں میں مرتب کر تو لوں تنکے نشیمن کے
ہوا کی جنبشوں میں کچھ تو شاخِ آشیاں ٹھہرے

نہیں ممکن سکوں اے ناخدا دریائے ہستی میں
سفینہ کس طرح ٹھہرے نہ جب موجِ رواں ٹھہرے

تحیر آفریں جلوے سنبھلنے ہی نہیں دیتے
تری محفل میں اب کوئی کہاں بیٹھے کہاں ٹھہرے

ہماری کیا ہے ہم وہ رہروانِ دشتِ وحشت ہیں
نگاہوں کو وہیں منزل نظر آئی جہاں ٹھہرے

طوافِ آشیاں سے میں ذرا فارغ تو ہو جاؤں
نہ ہو بے تاب دم بھر کے لئے برقِ تپاں ٹھہرے

نظر اوروں کی ان کے جلوۂ بیرونِ در پر تھی
ہمیں تھے وہ حریمِ ناز کے جو رازداں ٹھہرے

مجھے اک تبصرہ کرنا ہے بزمِ ماہ و انجم پر
ذرا گردش زمیں کی تا باوجِ آسماں ٹھہرے

غلامی پر انھیں کی اے الم میں فخر کرتا ہوں
ازل کے دن ہی سے جو صاحبِ کون و مکاں ٹھہرے

غزل

از

(جناب اشفاق علی خاں صاحب ایڈووکیٹ)

حوادث کی رہی ہیں یورشیں پیہم مری جاں پر
ہزاروں کفر منڈلاتے رہے ہیں میرے ایماں پر

نگاہِ خردہ گیراں خیرہ میرے دل کی تابش سے
نظر کی خیرگی کو دسترس کیا مہرِ تاباں پر

پریشانی سے میری پارہ پارہ دل حوادث کا
زمانہ رشک کرتا ہے مرے حالِ پریشاں پر

خداوندا یہ کیا آئین ہے تیری خدائی کا؟
ترا انساں کرے مشقِ ستم تیرے ہی انساں پر

انھیں کوہ و بیاباں سے ہے تسکینِ نظر میری
فروتر میرے منصب سے نظر کرنا گلستاں پر

مری تر دامنی پر طنز جو کرتے رہے برسوں
وہ دو آنسو گرا لیتے کبھی اپنے بھی داماں پر

رہی جن کے لئے وجہ سکوں میری پریشانی
وہ اب کیوں کر رہے ہیں غم مرے حالِ پریشاں پر

اسی آغوش میں میرے جنوں نے تربیت پائی
نظر پڑتی ہے حسرت سے درو دیوارِ زنداں پر

مجھے تردامنی تسلیم اپنی لیکن اے ہمدم
کسی کے خون کے دھبے نہیں ہیں میرے داماں پر

یہی ہے راز میری کامیابی کا زمانے میں
کہ میں ساحل پہ رہ کر بھی نظر رکھتا ہوں طوفاں پر

جنوں کیسا؟ سمجھتا ہوں میں توہینِ جنوں اُس کو
کہ جس کا زور چلتا ہو فقط چاکِ گریباں پر

جہاں کو میرے عزمِ کارفرما کی ضرورت ہے
جمودِ مستقل چھایا ہوا ہے نوعِ انساں پر

میں ہوں منجملہ آیاتِ قرآں اہلِ ایماں میں
کہاں توفیقِ ایماں کفر کو آیاتِ قرآں پر

تبصرے

عہد فاطمی میں علم و ادب از جناب عاشق حسین و محمد شاکر صاحب برہان پوری - تقطیع کلاں ضخامت ۲۰۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ :- ڈی - بی یکڈپو ۱۷۶ مسجد بندر روڈ بمبئی ۳ -

مصر کے خلفائے بنو فاطمہ نے جہاں اپنے مسلک "اسماعیلیت" کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی دعوت کا خاص اہتمام کیا تھا ان کو تعمیری اور علمی ادبی کاموں سے بھی بڑی دلچسپی تھی اور اس میں وہ فرقہ وارانہ عصبیت سے بلند و بالا تھے - چنانچہ جامعہ ازہر جو آج تک ان کی یادگار کی حیثیت سے قائم ہے اس میں حنفی - شافعی ، مالکی اور حنبلی چاروں مذاہب فقہ کے درس کا بھی باقاعدہ انتظام تھا - ان خلفاء کے عہد میں ہر علم و فن کے بڑے بڑے ماہر پیدا ہوئے - جو سلطنت کی زیر پرستی کے زیر سایہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بکمال فارغ البالی مصروف و مشغول رہتے تھے - اس کتاب میں خلفائے بنو فاطمہ کی اس علمی و ادبی سرپرستی کی روئداد خوش اسلوبی اور عمدگی کے ساتھ مرتب کی گئی ہے - شروع میں اسماعیلی فرقہ کی مختصر تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ان بعض باتوں کی تردید کی گئی ہے جو دوسرے طبقوں کی طرف سے ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں چنانچہ ثابت کیا گیا ہے کہ فرقہ کا امام عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتا ہے - اس میں نہ الوہیت ہوتی ہے - نہ وہ علم غیب رکھتا ہے - نہ وہ شریعت کو معطل کر سکتا ہے ، بلکہ ایک مقام پر تو یہاں تک لکھا ہے "عبادت ظاہرہ میں اسماعیلی اہل سنت سے متفق ہیں (ص ۲۷) شریعت اور سنت کی پابندی اُس کے لئے ایسی ہی ضروری ہے جیسی کہ ایک عام مسلمان کے لئے"۔

بہر حال کتاب کا اسلوب علمی اور محققانہ ہے اس کے مطالعہ سے جہاں اسماعیلی مذہب کے عقائد و افکار سے متعلق صحیح اور مستند معلومات حاصل ہوں گے - عہد فاطمی کی علمی و ادبی تاریخ

کا ایک معلومات افزا جائزہ مل جائے گا زبان شستہ اور انداز بیان سلجھا ہوا اور شگفتہ ہے۔
اس عہد کی تاریخ کے طالب علم کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

تاریخ بالکنڈہ از جناب منشی محمد فیض الدین صاحب صدیقی۔ تقطیع کلاں ضخامت ۱۲۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ؏ پتہ:- ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد، رفعت منزل حیدر آباد دکن۔

بالکنڈہ حیدر آباد دکن کا مشہور قصبہ ہے جہاں اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ سے اب تک بڑے بڑے نامور اُمرار۔ نواب۔ جاگیر داران۔ اولیا اور علماء پیدا ہوتے رہے ہیں لائق مصنف نے پندرہ سال کی عرق ریزی اور محنت کے بعد اسی قصبہ کی تاریخ مستند مآخذ کی مدد سے لکھی ہے۔ اگرچہ یہ صرف ایک قصبہ کی تاریخ ہے لیکن اس سلسلہ میں جن نامور شخصیتوں کا ذکر آگیا ہے ان کی حیثیت صرف مقامی نہیں تھی۔ بلکہ ان کے فیوض وکمالات کی شہرت دکھن کے علاوہ ملک کے دوسرے گوشوں میں بھی پھیلی ہوئی تھی اور اس کے اثرات شمالی ہند میں بھی نظر آتے تھے۔ اس بنار پر اس کا مطالعہ اس عہد کی تاریخ کے طالب علم کے لئے مفید ہوگا۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن کی ہمت وجوانمردی لائق داد ہے کہ وہ موجودہ ناسازگار اور حوصلہ شکن ماحول میں بھی دکھن کے ادب اور تاریخ سے متعلق ایسی قابل قدر کتابیں برابر شائع کر رہا ہے اور اپنی روایات سابقہ کو بہر طور قائم رکھے ہوئے ہے۔

آسٹریلیا کی جھلک از محترمہ تاج لیٰس علی خاں صاحب تقطیع خورد ضخامت ۲۷۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ؏ پتہ:- الہدیٰ بک ایجنسی مجرد گاہ معظم جاہی مارکیٹ حیدر آباد دکن۔

محترمہ تاج سلطانہ بیگم نے اپنے شوہر جناب لیٰس علی خاں صاحب کے ساتھ ۱۹۴۹ء میں آسٹریلیا کا سفر کیا تھا۔ یہ کتاب اس سفر کی روئداد ہے۔ لیٰس علی خاں صاحب ریلوے انجنیر ہیں اس لئے ان کا مقصد علاوہ سیر وتفریح کے اپنے فن سے متعلق نئی معلومات حاصل کرنا اور ہم فن لوگوں سے مل کر تبادلۂ خیالات کرنا بھی تھا۔ بظاہر محترمہ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن حق یہ ہے کہ

انھوں نے اس سفر میں صحیح طور پر اپنے شوہر کی رفیقۂ زندگی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ وہ سیر و تفریح میں تو ساتھ رہیں ہی انسٹیٹیوٹ آف انجینرس کے جلسوں میں بھی شریک رہیں اور انھوں نے آسٹریلیا کی سوسائٹیوں ہوٹلوں، کلبوں۔ غاروں۔ پارکوں۔ عجائب گاہوں اور وہاں کے عام و خاص مردوں اور عورتوں کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اپنی تنقیدی رائے کو آزاد رکھا ہے۔ جہاں تعریف کا موقع تھا وہاں تعریف کی ہے اور جہاں کوئی بات کھٹکتی تھی وہاں بے تامل نکتہ چینی کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ سفرنامہ قیمتی معلومات کا گنجینہ ہے۔ پھر اگرچہ زبان کہیں کہیں اصلاح طلب ہے۔ مثلاً آں موصوفہ نے بار بار "دراگرچہکہ" اور "ہم نے نہایا" لکھا ہے۔ اندازِ بیان بے تکلف اور بے ساختہ ہے۔ جس میں سنجیدگی کے ساتھ ہلکی ہلکی ظرافت کی آمیزش اور خصوصاً شوہر کے ساتھ بہت لطیف قسم کا مزاح بہت لطف دے جاتا ہے۔ ہم محترمہ کو اُن کے کامیاب طرز نگارش پر عموماً اور اس سفرنامہ پر خصوصاً مبارک باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اُردو زبان کی خدمت اسی طرح کرتی رہیں گی۔

بہار شباب | از مولانا محمد عبدالعلیم صاحب صدیقی قادری تقطیع خورد ضخامت ۹۲ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ:۔ المکتبہ اندرونی کھتاؤ مارکیٹ۔ نیو نھام روڈ کراچی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کتاب جنسیات کے موضوع پر ہے۔ لیکن جنسی مسائل پر اسلامی شریعت کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور اسلام میں جنسی گمراہی کے لئے جو احکام و وعیدیں ہیں ان کو عقلی دلائل کے ساتھ اثر انگیز الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ آج کل جنسی گمراہی کی گرم بازاری ہے اور جس کا بڑا سبب لادینی ماحول۔ مغربی تہذیب کے اثرات، مخرب اخلاق فلم اور فحش لٹریچر کی اشاعت ہے۔ کسی پر مخفی نہیں ہے۔ اسلام کے یہ احکام و تعلیمات ہمارے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے باعث عبرت و بصیرت ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ان کو ماحول بھی صحیح ملے۔ بہر حال مولانا نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔

BURHAN.
No. 5. 1956.

بُرہان

جلد ۳۶ — شمارہ نمبر ۵

مئی ۱۹۵۶ء مطابق شوال المکرم ۱۳۷۵ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

گذشتہ مہینے کے برہان میں لفٹننٹ کرنل خواجہ عبد الرشید صاحب کا جو مقالہ "کتبۂ مارگلہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے وہ ایک مخصوص کاوشِ دماغی کے اعتبار سے لائق قدر اور مستحقِ داد ہے لیکن جناب ڈاکٹر زبید احمد صاحب سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی نے اپنے ایک والا نامہ میں اس مضمون کی ایک فروگذاشت کی طرف توجہ دلائی ہے جو واقعی بڑی اہم ہے موصوف لکھتے ہیں

"مارگلہ کا مضمون دلچسپ ہے۔ لیکن فاضل مضمون نگار نے سال ۱۰۸۰ھ حاصل کرنے کے لئے "ہوش" کی جگہ "ماہ وش" جو تجویز کیا ہے اس سے تو مصرعہ میں سکتہ پڑ جاتا ہے "ناصیہ ہوش ہندوستان" کا وزن "مفتعلن مفتعلن فاعلن" ہے اور ناصیہ ماہوش ہندوستان کا وزن مفتعلن مفتعلن مستفعلن ہو جاتا ہے جو موزوں نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر ۱۰۸۰ھ ہی صحیح سال ہے تو شاعر نے تعمیۂ داخلی سے کام لیا ہوگا۔ پھر یہ مصرعہ "کہ سربرد چرخ برصد زماں" موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ "سربرد" کا وزن مُفاعلن ہے اور ہونا چاہیئے مفتعلن۔ گشت کی جگہ لفظ گفت ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بقیہ تینوں خواندگیوں ہیں گفت ہی ہے غالباً گشت کتابت کی غلطی ہے۔"

عثمانیہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد یوسف الدین نے حال ہی میں ایک بڑی عمدہ اور مفید کتاب شائع کی ہے۔ اس کا نام ہے "دنیا کی یونیورسٹیوں میں مشرقی اور اسلامی علوم کی تعلیم" کتاب انگریزی میں ہے اور بڑی تقطیع کے ڈھائی سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اس میں لائق مرتب نے ہر جگہ کے مستند اعداد و شمار فراہم کر کے تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ دنیا میں کہاں کہاں اسلامی علوم و فنون کی تعلیم کا انتظام ہے؟ اور یہ انتظام کتنے بڑے اور وسیع پیمانہ پر ہے۔ کتاب تین

حصوں پر تقسیم ہے۔ پہلے حصہ میں امریکہ اور کناڈا کی یونیورسٹیوں کا ذکر ہے دوسرے حصہ میں مغربی ممالک یعنی برطانیہ۔ ہولینڈ۔ فرانس۔ جرمنی اٹلی وٹیکن اسٹیٹ۔ سوویٹ روس اور ان کی یونیورسٹیوں کا تذکرہ ہے اس کے بعد کتاب کا تیسرا حصہ شروع ہوتا ہے جس میں مشرقی ممالک کی یونیورسٹیوں کا بیان ہے اس کتاب کو پڑھ کر معلوم ہوگا کہ آج دنیا کا کوئی ترقی یافتہ اور مہذب ملک ایسا نہیں ہے جہاں اسلامی تاریخ۔ فلسفہ۔ دینیات اور اسلامی کلچر کی تعلیم اور اس میں تحقیق کا کام کرنے کی سہولت نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے لاکھوں روپئے کے ٹرسٹ ہیں جو عربی کتابوں کی اشاعت اور طلبا، کے وظائف کے لئے وقف ہیں بڑی بڑی تنخواہوں کے استاذ اور پروفیسر ہیں جو دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو کر اپنی زندگیاں اسلامیات کی تحقیق و مطالعہ کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں اور انھیں لوگوں کی علمی کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اسلامیات کا کوئی طالب علم اپنی تحقیق ان علمائے مغرب کی کتابوں سے استفادہ کئے بغیر مکمل نہیں کر سکتا۔

اس کتاب کا مقصد در اصل یہ ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک طرف خود مسلمان اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ اُن کے علوم و فنون کے لئے دوسری قومیں جو کچھ کر رہی ہیں کیا وہ اُس کا ایک دسواں حصہ بھی خود کر سکے ہیں۔ اسلامیات پر تحقیق اور ریسرچ کی جو سہولتیں ان ملکوں میں ہیں کیا وہ خود مسلمانوں کے ہاں موجود ہیں۔ اسلامی علوم کے طلبہ کی جو حوصلہ افزائی یہ لوگ کرتے ہیں کیا خود مسلمان بھی یہی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں؟ اس کے علاوہ کتاب کا دوسرا مقصد۔ جیسا کہ مقدمہ میں پروفیسر محمد رحیم الدین صاحب نے صاف صاف لکھ بھی دیا ہے۔ حکومت ہند کو اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ وہ علم، کلچر اور اسلامیات کی قدر شناسی کے باب میں دنیا کی ان مہذب اور ترقی یافتہ قوموں سے سبق لے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ دینیاتِ اسلامی کو حرف غلط کی طرح مٹانے یا کم از کم اُس کا نام بگاڑنے کی کوشش نہ کرے حکومت پر اس کا اثر ہو یا نہ ہو لیکن مسلمان جو آج احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں وہ اس کتاب کو پڑھ کر یہ کہہ سکتے ہیں

"عالم ہمہ افسانہ با ما ہمہ ہیچ"

یہ کتاب کا پہلا اڈیشن ہے اور نامکمل ہے کیوں کہ اس کی طباعت کے وقت تک بعض معلومات حاصل نہ ہو سکی تھیں۔ امید ہے کہ دوسرا اڈیشن زیادہ مکمل اور جامع ہوگا۔ قیمت درج نہیں پتہ یہ ہے:۔ الہدیٰ بک ایجنسی۔ ناظم شاہی روڈ۔ حیدر آباد دکن۔

افسوس ہے ہمارے حمیم صمیم سید ابوالنظر رضوی کا ۸ر اپریل کو کراچی میں انتقال ہوگیا۔ موصوف امروہہ ضلع مرادآباد کے شرفا اور نامور رؤسا میں سے تھے بلا کے ذہین اور طباع تھے۔ درس نظامی کا بڑا حصہ مدرسہ امدادیہ مرادآباد میں پڑھا تھا اور پھر آخر میں ایک سال دارالعلوم دیوبند میں رہ کر تکمیل کی تھی۔ اردو کے صاحب طرز انشا پرداز اور ادیب تھے۔ طبیعت میں روانی غضب کی تھی۔ تقسیم سے پہلے برہان میں اُن کے مقالات اکثر نکلتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے ادبی اور علمی رسالے بھی مرحوم کے مضامین فخر سے شائع کرتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں یکایک اپنی تمام جائداد واملاک چھوڑ چھاڑ کر اچی چل دیئے۔ بڑی بڑی تمناؤں اور آرزوؤں کو لے کر گئے تھے لیکن ایک بھی پوری نہیں ہوئی اور ہزاروں روپیہ ماہوار کا خرچ رکھنے والا وہاں عسرت و تنگدستی کا شکار ہو کر رہنے لگا۔ ان پیہم ناکامیوں اور مایوسیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تپ دق میں مبتلا ہوگئے۔ مرنے سے چند ماہ پہلے ایک خط میں کس حسرت سے لکھتے ہیں "قدرت کے کارخانے بھی عجیب ہیں۔ جب میرے پاس ریاست تھی دولت تھی اور طاقت تھی اس وقت مجھ کو یہ موذی مرض نہ دیا کہ میں اس کا مقابلہ کر سکتا تھا اب اس غریب الوطنی اور تنگدستی میں مجھ کو اس بیماری میں مبتلا کرکے سوائے اس کے کہ قدرت "گربہ وموش" کا تماشا دکھانا چاہے اور کیا فائدہ ہے؟" بعض خاص اسباب کی بنا پر مذہبی خیالات میں عدم توازن پیدا ہوگیا تھا اور قرآن مجید میں بعض عجیب طرح کی تاویلات و توجیہات کرنے لگے تھے۔ یوں نہایت شریف۔ بامروت۔ دوست نواز۔ بے حد خلیق اور ملنسار تھے۔ مہمان نوازی بڑی عالی ظرفی سے کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی لغزشوں اور غلطیوں سے درگذر فرماکر ان کو مغفرت و بخشش کی نعمت سے نوازے۔

آمین

دسویں صدی ہجری کا باکمال محدّث

از

جناب شیخ فرید برہان پوری

(پروفیسر رابرٹسن کالج۔ جبل پور)

دسویں صدی ہجری کا باکمال محدث ــــــ حضرت شیخ علی متقی برہان پور کی مایۂ ناز ہستی ہے۔ وہ اپنے دور کے ممتاز عالم اور فاضلِ اجل تھے۔

علی متقی اصلاً جونپوری اور مولداً برہان پوری ہیں۔ اِن کے والد حسام الدین بن عبدالملک بن قاضی خاں اپنے اہل و عیال کو لے کر جون پور سے برہان پور آ گئے۔ اور یہاں ۸۸۵ھ ۸۱-۱۴۸۰ء میں علی متقی پیدا ہوئے۔ سات یا آٹھ سال کی عمر میں تقریباً ۸۹۳ھ ۸۸-۱۴۸۷ء میں ان کے والد نے حضرت شاہ بہاء الدین باجن کے حلقۂ ارادت میں شامل کر دیا۔

اپنے والدِ بزرگوار اور شہر کے دوسرے عالموں سے علومِ متداولہ کی تعلیم حاصل کی۔ اور مختصر عرصہ میں علم و فضل میں کمال حاصل کر لیا۔

والد کی وفات کے بعد ابتدار شباب میں ملازمت کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس ارادہ سے شادی آباد ــــ مانڈو ــــ پہنچے۔ اور وہاں ملازمت کر لی۔ فارغ البالی کے ساتھ زندگی گذارنے لگے۔ کچھ مال و متاع بھی جمع کر لیا۔ مگر خدا کی عنایت اور ہدایت کی دست گیری سے دنیاوی مال و متاع کی وقعت نظروں سے اُٹھ گئی۔ اور اس فانی دنیا کی حقیقت کے انکشاف کے بعد دنیا سے قطع تعلق کرنے کی ٹھان لی۔ ملازمت چھوڑ کر برہان پور واپس آئے اور شیخ عبدالحکیم ابن شاہ باجن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی صحبت سے فیض پاتے رہے خاندانِ چشتیہ کا خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

ان کے ابتدائی حالات نہیں ملتے۔ انھوں نے اپنا حال یوں بیان کیا ہے ——

"یہ فقیر جب بچہ تھا۔ اُس وقت والد رضی اللہ عنہ نے شیخ اجل شیخ باجن چشتی کا مُرید کر دیا تھا۔ ان کا طریقہ وجد و سماع صفا و ہیجان کا باعث ہوا۔ پس جب میں سنِ شعور کو پہنچا۔ اور حق و باطل کی تمیز ہوئی۔ تو انھیں کو میں نے اپنا شیخ رکھا۔ اور انہیں کے قول پر عمل کرنے کے لئے راضی ہوا۔ کیونکہ مشائخین کا یہ قول ہے۔ کہ لڑکا جب مرید کر دیا جاتا ہے۔ تو اس کو بالغ ہونے کے بعد اختیار ہے کہ چاہے اسی شیخ کو اپنا شیخ بنائے یا کوئی اور شیخ بنائے۔ میں نے انھیں کو اپنا شیخ رکھا جب میرے والد اور حضرت شیخ (شاہ باجن) کا انتقال ہوگیا۔ تب میں مشائخین خاندان عالیہ چشتیہ بہشتیہ کا خرقہ حضرت شیخ عبدالحکیم بن شیخ باجن سے پہنا۔"[1]

غالباً ۹۱۲ھ / ۱۵۰۶ء میں حضرت شیخ عبدالحکیم کے مرید ہوئے۔

ملتان کا سفر اور قیام رہِ طریقت میں پیش آنے والی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لئے ملتان کا قصد کیا۔ دو سال تک شیخ حسام الدین ملتانی کی صحبت میں رہے۔ اور ظاہری و باطنی فیوض سے مستفیض ہوتے رہے۔ ان سے اکثر تفسیر بیضاوی اور عین العلم کا تذکرہ رہا۔

عبدالوہاب متقی برہان پوری [متوفی ۱۰۰۱ھ / ۱۵۹۲ء] کی روایت سے اخبار الاخیار میں منقول ہے کہ ——

"جب شیخ الاسلام حضرت حسام الدین کی خدمت میں ملتان میں رہتے تھے۔ شیخ الاسلام خود اپنے سر پر کتابیں رکھ کر ان کے حجرے میں آتے تھے۔ کیوں کہ یہ خلوت میں رہتے تھے اس لئے اندر جانے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے وہ فرماتے تھے کہ حسام الدین آیا ہے۔ کیا حکم ہے۔ ایک دو دفعہ اسی طرح کہتے تھے۔ تو حضرت دروازہ کھول دیتے تھے۔ اکثر ایسا

---

[1] اخبار الاخیار (اردو) ص ۳۶۵ ۔ ترجمہ مراۃ احمدی ص ۱۰۳
معارج الولایت قلمی ص ۳۸۹ اور سفینۃ الاولیاء میں فارسی عبارت نقل ہے)
مذکورہ بالا عبارت اس رقعہ کا ترجمہ ہے۔ جو انھوں نے اپنی رحلت کے وقت کسی مخلص کے سپرد کر دیا تھا۔ [2] ایضاً ص ۳۶۹ ۔

بھی ہوا کہ حضرت شیخ حجرہ نہ کھولتے تھے۔ تو حضرت شیخ الاسلام واپس ہو جاتے تھے.....
اکثر تفسیر بیضاوی کا مذاکرہ کیا کرتے تھے"۔

اسی طرح چند سال حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں ملتان میں رہے جب جاذبۂ توفیق نے مرکز ـــــ سوادِ اعظم ـــــ کی جانب کھینچا۔ تو مدینہ منورہ کے قصد سے ملتان سے روانہ ہوئے۔ مانڈو آئے۔ یہاں والدہ کی بیماری کی وجہ سے کچھ عرصہ تک ان کو قیام کرنا پڑا۔ ان کی آمد کی خبر سُن کر طالبانِ رشد و ہدایت جوق در جوق آنے لگے۔ ہر وقت ایک مجمع رہتا۔

والدہ کی وفات کے بعد مانڈو گڑھ سے احمد آباد آئے۔

قیام احمد آباد | احمد آباد میں وردد اور قیام کے زمانہ کا تعین مشکل ہے۔

کچھ عرصہ تک انھوں نے احمد آباد میں قیام کیا۔ ان کی بزرگی اور فضیلت کا شہرہ سن کر سلطان بہادر شاہ والی گجرات نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ عوام پروانہ وار ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ اکثر تنگ آکر دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتے تھے۔

انھی دنوں ـــــ قاضی عبداللہ سندھی ـــــ صاحب علم و تقویٰ ـــــ گردشِ روزگار سے پریشان ہو کر گجرات کی راہ عازمِ مدینہ تھے۔ شیخ سے اِن کو بے حد عقیدت اور محبت تھی۔ بادشاہ نے شوقِ ملاقات کی شدت سے مجبور ہو کر قاضی صاحب موصوف کی معرفت باریابی چاہی۔ انھوں نے قاضی صاحب کی درخواست منظور کر لی۔ سلطان حاضرِ خدمت ہوا۔ اور ان کے نصائح و ارشادات کو غور سے سُنا۔ اور ایک کروڑ تنکہ ـــــ گجراتی سکہ ـــــ بطور نذرانہ ان کی خدمت میں بھیجا۔ چونکہ یہ نذرانہ قاضی صاحب کے توسل سے حاصل ہوا تھا۔ قاضی صاحب کو عنایت کر دیا۔

گجرات سے ۹۵۳ھ / ۱۵۴۶ء میں دیارِ عرب کا رُخ کیا اس وقت اِن کی عمر ۶۷ برس کی تھی۔

سفر میں طریقِ زندگی | سفر میں ان کا طریقہ یہ تھا کہ دو تھیلے ساتھ رکھتے تھے۔ ایک میں کھانے پینے کا ضروری سامان اور دوسرے میں قرآنِ پاک اور چند کتابیں۔ کھانے کا سامان بھی دو تین دن سے زیادہ کا نہ ہوتا تھا۔ جنگل سے لکڑیاں چن کر لاتے۔ چقماق سے آگ جلاتے اور اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے تھے۔ اور خود ہی برتن وغیرہ صاف کر لیتے تھے۔ اس باب میں انھوں نے کسی کی خدمت قبول نہ کی۔

مکہ میں سکونت | شیخ نے عرب پہنچ کر مشہور اور معروف اساتذہ اور شیوخ کی خدمت میں چند سال تک علوم ظاہری اور باطنی کی تکمیل کی۔ ان شیوخ میں شیخ ابن حجر مکی، شیخ ابو الحسن بکری۔ اور محمد بن سخاوی جیسے فاضل اجل شامل ہیں۔ چند سال میں شیخ نے اپنی فطرت ذہانت۔ روحانی ذوق اور توفیقِ ایزدی سے یہ مرتبہ حاصل کر لیا۔ کہ استاد شاگرد اور شاگرد استاد ہو گیا۔

"از ہند در سال نہصد و پنجاہ و سہ سالہ بصوب حرمین شریفین خرامش فرمود و توفیق تصحیح و تصیح جملگی صحاح حدیث در ملازمت شیخ ابو الحسن بکری شافعی مصری و دیگر محدثانِ معجزبیان یا ..... استعداد خدیو مردم را با فاوہ فرمائی بہ مسند ...... نشاند و فراوان تالیفاتِ سود مند در فنِ حدیث برائے رہنمائی مردم گذاشت"[1]

۹۵۷ھ / ۱۵۵۰ء سے ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء تک مکہ میں حدیث شریف کی دائرۃ المعارف۔ "کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال" ——— کی ترتیب و تہذیب میں مصروف رہے جس نے سیوطی کے مجموعۂ احادیث پر خطِ نسخ پھیر دیا۔

شیخ اس درمیان میں ۹۶۱ھ / ۱۵۵۳ء تک دو مرتبہ گجرات آئے۔ وہاں شیخ اور سلطان محمود کی ملاقات کی تفصیل "ظفر الوالہ بمظفر وآلہ"[2] میں درج ہے۔

یہاں سلطان محمود اکثر خلافِ شریعت لباس پہن کر حاضرِ خدمت ہوتا۔ اس کی طرف انھوں نے کبھی توجہ نہ کی۔ ایک مرتبہ جب سلطان شرعی لباس میں حاضر ہوا۔ تو انھوں نے

---

[1] گلزارِ ابرار ورق ۲۵۶۔ اذکارِ ابرار ص ۴۰۳ [2] ظفر الوالہ ——— مطبوعہ لندن ص ۳۱۵

خوشنود ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ سلطان کی درخواست پر اُس کے محل میں تشریف لے گئے۔ اپنے گلاس کو چار مرتبہ پانی سے دھو کر سلطان کو پانی پینے کے لئے دیا۔ تاکہ اس کا شک دور ہو جائے۔ سلطان نے خوشی سے پانی پی لیا۔ سلطان نے اپنی سلطنت لا کر قدموں پر ڈال دی۔ مگر انھوں نے کچھ قبول نہ کیا۔

سلطان نے مدرسہ اور طلبار کے وظائف کے لئے بڑی رقم مقرر کر دی۔ شیخ مکہ لوٹ گئے۔ اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔

وفات | وفات سے چند روز پہلے ان میں کچھ جذبے پیدا ہو جاتے تھے۔ جس سے تمام بدن اور حرکات سکنات میں تغیر پیدا ہو جاتا تھا۔

عبدالوہاب متقی کہتے ہیں کہ صفر کے مہینے ۹۷۵ھ ۱۵۶۷ء میں وفات سے دو تین دن قبل شیخ نے اُن سے ایک بیت پڑھنے کے لئے کہا۔ انھوں نے ذیل کی بیت پڑھی[1]

ہرگز نیامد در نظر صورت ز رویت خوب تر   شمسے ندانم یا قمر یا زہرہ یا مشتری

اس بیت کو سُن کر ان کی عجیب حالت ہو گئی۔ باآوازِ بلند پڑھنے کے لئے کہا عبدالوہاب متقی نے کئی مرتبہ بلند آواز سے پڑھا۔ "حضرت شیخ سے محبت آمیز کلام اور شور انگیز نالے بلند ہونے لگے"۔ جب خادم کھانا لایا تو انھوں نے اس کو اس طرح کوٹنے کے لئے کہا کہ سب ایک ہو جائے اور دوئی نہ رہے۔ اور ایک دوہرہ پڑھا۔

"آں چناں سحق کن کہ یکے شود و دوئی نماند چنانچہ ایں دوہرہ خبرے دہد"

دوہرہ ــــــ

"سُن سہیلی پریم کی باتا   یوں مل رہی جیون دود بتاتا"[2]

اپنے مقالہ ــــــ "ہندوستان میں ہندوستانی" میں حضرت سید سلیمان ندوی نے اس دوہرہ کے ذیل میں لکھا ہے۔ کہ "غور کیجئے۔ کہ ان کا تعلق ہندوستان کے کن کن صوبوں

[1] اخبار الاخیار (اردو) صفحہ ۳۷۶ [2] اخبار الاخیار مطبع ہاشمی میرٹھ صفحہ ۲۴۹ (بحوالہ نقوش سلیمانی)

سے رہا۔ جون پور (یوپی)، برہان پور (خاندیش)، مانڈو (مالوا) ملتان (پنجاب سندھ) اور احمد آباد (گجرات) بایں ہمہ ان کی جو زبان تھی وہ اِس دوہرے سے ظاہر ہے[1]۔

وفات کے وقت تمام جسم ساکت تھا۔ شہادت کی انگلی حرکت کر رہی تھی۔ اس کی حرکت بند ہونے کے بعد مریدوں نے سمجھ لیا۔ کہ روح قالب سے رخصت ہوگئی ہے۔ رحلت کے وقت ان کا سر شیخ عبدالوہاب متقی کے زانو پر تھا۔

دوم[2] جمادی الاوّل ۹۷۵ھ منگل ۴ نومبر ۱۵۶۷ء کو صبح کے وقت جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

برہان پور کی مردم خیز خاک سے اُٹھا ہوا باکمال محدّث —— مکّہ کی مقدس سرزمین میں ابدی آرام کے مزے لے رہا ہے ——

تاریخ وفات | "شیخ مکّہ"۔ "قضنی نحبہ"۔ "متابعتِ نبی"[1]۔ اور "پیروِ خاص مصطفٰے است علی"[2] سے تاریخِ وفات نکلتی ہے۔

مخبرالواصلین (قلمی) میں ذیل کا قطعہ درج ہے۔

آنکہ او ہادیٔ خفی وجلی است	متقی زمانہ شیخ علی است
وارثِ علم مرسلیں بودہ	خاتمِ دہر را نگیں بودہ
درۃ التاج اتقیار او بود	گوئے تقویٰ ازیں زمانہ ربود
در احادیث بود بے ہمتا	ہم چو در اختراں قمر یکتا
بہ فقاہت عدیلِ او عدم است	عاجز از وصفِ او قلم است
از جمادیٰ نخست بود دوم[3]	کہ علی شد بادجِ چرخِ نہم
سالِ ترحیل او رقم افتاد	وارث الانبیار بحق جاں داد

---

[1] نقوش سلیمانی صفحہ ۵۶ [2] گلزار ابرار (قلمی) ورق ۲۶۵ [3] اخبار الاخیار (اردو) صفحہ ۳۷۵ پر تاریخ وفات بارہ جمادی الاول ہے مگر قطعہ میں دو تاریخ نظم کی گئی ہے۔

مرقد او بہ مکۃ اللہ است   فیض بخشِ گدا و ہم شاہ است

پایۂ علم وفضل | شیخ کی ریاضت۔ زہد وتقویٰ۔ ظاہری اور باطنی علوم میں کمال کی وجہ سے مکہ معظمہ کے علماء وفضلاء اُن کے فضل وکمال کے معترف تھے۔

مفتیٔ حرم محترم ــــــــ شیخ ابنِ حجر مکّی ــــــــ ابتداءً ان کے استاد تھے اور آخر میں مرید بن کر خرقۂ خلافت ان سے حاصل کیا۔ اِن کی ذات سے اس مقدس مقام میں سینکڑوں طالبانِ علم کو فیض پہنچا۔ ان کی آغوشِ تربیت میں کئی ذرّے غیرتِ شمس و قمر ہو گئے۔ چند ہندی فضلاء اور خلفاء کے نام یہ ہیں

عبدالوہاب متقی۔ شاہ طاہر پٹنی۔ شیخ ابو جیو تیمی۔ شیخ محمد فضل اللہ۔ حضرت مخدوم جیو قادری۔ شیخ عبداللہ۔ شیخ رحمت اللہ سندھی وغیرہ۔

طریقۂ درس وہدایت | طالب علموں کو رشد وہدایت کا ان کا طریقہ یہ تھا کہ طالب علم کو اُس کی ظاہری حالت پر چھوڑ دیتے تھے اور اس کے باطن کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ اُس کے دل میں نور اور صفائی پیدا ہوتی اور وہ منزل تک پہنچ جاتا۔

شمس اللہ صاحب قادری نے تاریخ زبان اُردو میں لکھا ہے۔ کہ

"شیخ کے درس کا طریقہ یہ تھا۔ کہ آپ حرم میں تشریف رکھتے تھے۔ اور درس کے لئے طلباء جمع ہو جاتے اس کے بعد عربوں کو عربی میں۔ عجمیوں کو فارسی میں اور ہندیوں کو ہندی میں درس دیتے تھے"[1]

شیخ کے طریقۂ درس کو ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردِ رشید اور خلیفہ عبدالوہاب متقی نے جاری رکھا[2]۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے "زاد المتقین الی طریق سلوک الیقین" میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تاریخ زبانِ اُردو میں متعلقہ عبارت میں منقول ہے[3]

---

[1] تاریخ زبانِ اُردو ص ۲۹   [2] نقوشِ سلیمانی ص ۵۶   [3] تاریخ زبانِ اُردو ص ۲۹

تصانیف | فاضل اجل حضرت شیخ علی متقی کی عربی اور فارسی میں ایک سو سے زیادہ ادبی یادگاریں ہیں۔ ان سے اُن کے تبحرِ علمی اور پایۂ فضل و کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت موصوف کو علم کی ترویج و اشاعت کا بڑا شوق تھا۔ اِس خاطر کتابیں لکھتے اور نقل کرواکے شائقینِ علم کی تشنگی کی تسکین کی خاطر دوسرے شہروں کو بھیجتے تھے۔

شیخ مکہ معظمہ میں ۹۵۶ھ / ۱۵۵۰ء سے ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء تک کتبِ احادیث کی تصحیح و تقابل میں دن رات مصروف و مشغول رہا کرتے تھے۔ عبدالوہاب متقی تمام تصنیفات کی کتابت اور تصحیح کرتے رہتے تھے۔ اِن کی کتابت کی مشق اس قدر بڑھ گئی تھی کہ حضرت شیخ کی ایک کتاب جس میں بارہ ہزار ابیات ہیں۔ بارہ راتوں میں نقل کر لیا۔

اُن کی تخلیقات میں سے چند کا ذکر سطور ذیل میں کیا جا رہا ہے۔ اِن میں سے کچھ کتابوں کے خوش خط مخطوطات پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد میں محفوظ ہیں۔

(۱) عجالۃ الناسک فی انتخاب المناسک

فرائض۔ واجبات۔ محرمات۔ مکروہات۔ مباحات۔ سنن۔ مستحبات۔ حج و احرام کے بیان میں فارسی زبان میں ایک رسالہ مبتدیوں کے لئے ہے۔ حضرت رحمت اللہ بن قاضی عبداللہ سندھی کی لباب المناسک سے ماخوذ ہے۔

حمد و نعت کے بعد لکھا ہے۔

"می گوید احقر العباد اللہ علی ابن حسام الدین الشہیر بالمتقی کہ ایں رسالہ ایست در بیان فرائض و واجبات و محرمات و مکروہات و مباحات و سنن و مستحباتِ حج و احرام از کتاب لباب المناسک از تصنیفاتِ حضرت رحمت اللہ بن قاضی عبداللہ سندھی بزبانِ پارسی برائے مبتدیاں انتخاب کردہ و نام وے "عجالۃ الناسک فی انتخاب المناسک" نہادہ شد"

(۲) البرہان: — علامہ سیوطی نے امام مہدی آخر الزماں کے حالات میں "کتاب المعروف الوردی فی اخبار المہدی" تالیف کی اس کتاب میں ابواب وغیرہ کی ترتیب نہ تھی۔ علی متقی نے اس کو دوبارہ ترتیب دیا۔ اور اس میں جا بجا احادیث کے اضافے

کئے۔ یہ احادیث جمع الجوامع اور عقد الدرر فی اخبار المختصر سے لی گئی ہیں۔

کتاب کا سنہ تصنیف ۹۲۴ھ / ۱۵۱۸ء ہے۔ ۱۰۷ صفحات پر مشتمل پاکیزہ نسخہ احمد آباد میں ہے۔

(۳) تبیین الطرق:—— علم تصوف پر یہ شیخ کی پہلی تصنیف ہے۔ منقول ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے لئے ان کو غیب سے الہام ہوا تھا۔ "تنویر الافق" کے نام سے اس کتاب کی شرح بھی شائع ہو چکی ہے۔

(۴) مجموعہ حکم کبیر:—— تصوف کی یہ دوسری کتاب ہے۔ اس میں تمام مشہور کتب تصوف کا خلاصہ ہے۔ اس کے متعلق شیخ متقی کا کہنا تھا کہ اس میں تصوف کے ہر مشکل مسئلہ کا حل ہے۔

(۵) شرح رسالہ اصول الطریق:—— شیخ احمد برزوق کی اصول الطریق کی شرح ہے

(۶) رسالہ وصایا:—— بمبئی سے شایع ہو چکی ہے۔ نایاب ہے۔

(۷) وسیلۃ الفاخرہ فی سلطنت الدنیا والآخرۃ:—— ۱۴ صفحات کا مختصر رسالہ ہے۔

(۸) الطب للتیام لجمیع الاسقام:—— طب میں تصنیف ہے۔

(۹) رسالہ محتوی:—— دو ہزار احادیث پر مشتمل ایک رسالہ ہے۔

(۱۰) کنز العمال اور منہج العمال:—— کنز العمال شیخ کی علمی کوششوں کا شاہکار ہے۔ مکہ معظمہ میں ۹۵۷ھ / ۱۵۵۰ء سے ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء تک وہ احادیث کی دائرۃ المعارف کی ترتیب و تدوین میں مصروف رہے۔

شیخ نے سیوطی کی کتاب جمع الجوامع کو از سر نو ترتیب دی۔ اس کے ابواب قائم کئے۔ اور کنز العمال نام رکھا۔ دوبارہ کنز العمال سے مکرر احادیث کو علیحدہ کر کے عمدہ طریقہ پر ان کی ترتیب دی اور اس کا نام منہج العمال رکھا۔

ان کتابوں نے سیوطی کے مجموعوں پر خط نسخ پھیر دیا ان دونوں تصنیفات کو دیکھ کر

شیخ ابو الحسن بکری نے کہا تھا۔

للسیوطی منة علی العالمین	سیوطی کا احسان تمام عالم پر ہے اور علی متقی کا
وللمتقی علی السیوطی	احسان سیوطی پر ہے۔

(۱۱) رسالہ التوکل فی الیقین والتوکل :۔ "کتاب التنویر فی اسقاط التدبیر" ابو الفضل تاج الدین احمد بن محمد بن عبد الکریم ابن عطاء اللہ اسکندری کی تصنیف ہے۔ علی متقی نے آخری دو فصلوں کا ترجمہ کر کے رسالہ التوکل فی الیقین و التوکل نام رکھا۔

ایک ۲۳ سطری ۵" × ۹" تقطیع کا آٹھ اوراق کا قلمی نسخہ احمد آباد کے پیر محمد شاہ کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

مقدمہ کی عبارت درج ذیل ہے :۔

"علی بن حسام الدین چوں کتاب نام ...... تالیف امام محقق ابی الفضل تاج الدین احمد بن محمد بن عبد الکریم بن عطاء اللہ اسکندری رضی اللہ واقف شد۔ بخاطر آمد کہ دو فصل آخر ترجمہ بپارسی کردہ شود فائدۂ عام وخاص را باشد و ایں را نام "رسالہ التوکل فی الیقین والتوکل نہادہ شد"

کتاب تنویر کا ایک قلمی نسخہ حضرت سید محمد مطیع اللہ صاحب راشد برہان پوری (مقیم کراچی) کے نادر کتب خانے کی زینت ہے موصوف نے اپنی خرابیٔ صحت اور گوناگوں مصروفیات کے باوجود ازرہِ بندہ نوازی رسالۂ مذکور کے متعلق جو تحریر کیا ہے۔ بجنسہٖ نقل ہے :۔

"تمہید یہ ہے

میگوید احقر عباد اللہ علی بن حسام الدین کہ مشہور است بمتقی کہ مشائخ رضی اللہ عنہم اتفاق کردہ اند کہ مرید راہیچ مانعی بطلب حق چنانچہ غم رزق است نیست۔ چوں ایں مانع از مرید دور شود و توکل بر خدائے تعالیٰ حاصل شد۔ بقوتِ توکل بر فضیلتِ دینی و دنیوی کہ خواہد بسہولت حاصل تواند کرد۔ پس بنا بریں مضمون دو فصل آخریں از کتاب تنویر کہ تصنیف

ابن عطاء اللہ اسکندری است فارسی کردہ شود وخاتمہ مناسب رسالہ زیادہ کردہ شد تا فائدہ خاص وعام را باشد وایں رسالہ را . . . . نام نہادہ آمد۔

چھوٹی تقطیع کے ۲۰ اوراق ہیں۔ اس رباعی پر خاتمہ ہے۔

شش بود انکارِ تحصیلِ توکل اے عزیز | علم و قدرت۔ نفی عجز و سہو نقص خلق بیں
بگذراں برخاطرت چنداں کہ مستولی شوند | نیک آساں باشد ایں برخاطر طبع گزیں

"خاتمہ بالخیر"

ترقیمہ اس کے سوا کچھ نہیں اور اس کے آگے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ از فضیلتِ مہتر آدم صلوٰۃ اللہ علیہ در بیانِ سورۃ مائدہ ساعتے بود از یک جانب آوازے شنیدند۔ پیغمبر خدا مرا دستوری دہ تا در آیم۔ بعدہٗ حضرت رسالت فرمودند۔ یاراں من شما میدانید کہ ایں آواز از آنِ کیست۔ یاراں گفتند مانمی دانیم گفت اے یاراں ایں آوازِ ابلیسِ لعین است۔

حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے عرض کی اجازت ہو تو ہم اس کو ہلاک کردیں۔ فرمایا خدائے تعالیٰ نے اس کو مہلت دے رکھی ہے۔

بہر حال اس کو باریاب ہونے دیا گیا۔ پھر شیطان کا حلیہ ہے اور اس کا مکالمہ آں حضرت صلعم سے۔ لب لباب یہ ہے کہ حضور نے ابلیس سے تمام تلبیسات کا دریافت کیا کہ تو انسانوں کو کیسے ورغلاتا ہے۔ کس کو پسند کرتا ہے اور کس کو ناپسند کرتا ہے۔ تو کس چیز سے خوش ہوتا ہے۔ کس سے ناخوش۔ تیرا مقام کہاں ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ رسالہ بھی ۱۴ اوراق میں ختم ہوا ہے۔ اس پر ترقیمہ یہ ہے۔

تمت تمام شد۔ کار من نظام شد۔ کاتب الحروف بندۂ درگاہ شیخ امان اللہ والد شیخ جمال محمد ابن شیخ محمود قوم شیخ زادہ قریشی ساکن اکبر آباد بوقت یک ہر روز برآمدہ روز جمعہ بتاریخ بست و دوم محرم الحرام ۴۷ جلوس والا تمام شد۔ فرد۔

ہر کہ خواند دعا طمع دارم　　زانکہ من بندۂ گنہ گارم

یا یہ کوئی جداگانہ رسالہ ہے یا پھر اول الذکر ترجمۂ تنویر کا خاتمہ ہے۔ جس کو موصوف نے تمہید میں وعدہ فرمایا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لیکن مذکورہ ہر دو رسائل سے قبل ایک اور رسالہ اسی ترکیب اسی انداز بیان میں اسی موضوع پر منسلک ہے۔ جس کا آغاز نہیں۔

خاتمہ پر صرف اس قدر تحریر ہے

تمت تمام شد کارِ من نظام شد

فرد

ہر کہ خواند دعا طمع دارم　　زانکہ من بندۂ گنہ گارم

اس رسالہ کے ۱۴ اوراق ہیں اور اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اللہ تعالےٰ سے مختلف سوالات اور بارگاہِ الٰہی سے ان کے جوابات ہیں۔ اور نتیجۃً حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت ہے۔

یہ پورا مجموعہ ایک ہی کاتب نے یکساں طور پر لکھا ہے۔

رسائل علی متقی

اس تحریر سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ تینوں رسالے حضرت شیخ علی متقی کے ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

جاحظ کی کتاب الحیوان

(متوفی ۲۵۵ھ)

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق

(استاد ادبیاتِ عربی - دہلی یونیورسٹی)

کتاب الحیوان عربی زبان میں جانوروں سے متعلق پہلی کتاب ہے بلکہ اگر کہا جائے کہ یہ پہلی اور آخری کتاب ہے تو بے جا نہ ہوگا، وجہ یہ ہے کہ مسلمان اہلِ قلم نے اس موضوع سے دلچسپی نہیں لی - اس تصنیف سے کوئی ساڑھے پانچ سو سال بعد ایک اور کتاب لکھی گئی جس کا نام حیاۃ الحیوان الکبریٰ تھا، اس کے مصنف مصر کے فقیہ دَمیری تھے - اِس میں جانوروں سے متعلق جو کچھ ہے وہ بیشتر جاحظ کی کتاب الحیوان سے مستعار ہے - جاحظ کی کتاب بھی شاید وجود میں نہ آتی اگر خاص حالات ان کو مجبور نہ کرتے - آپ کو معلوم ہے کہ جاحظ ادیب ہی نہ تھے، ناقد اور معتزلی بھی تھے، اور اعتزال میں ایک خاص نظریہ کے حامل تھے۔ انھوں نے بہت سے رسالے لکھے جن میں سے اکثر کا موضوع اختلافی مسائل تھا، مثلاً خلافت کا مسئلہ، خلقِ قرآن کا مسئلہ، نبوتِ اصلی اور نبوتِ جبلی کا فرق، جن اور فرشتوں میں فرق، انسان اور فرشتوں میں فرق، خوارق کا مسئلہ، عربوں کا غیر عربوں سے موازنہ، مردوں کا عورتوں سے موازنہ، وعد و وعید کا مسئلہ، اور مشبّہ فرقہ کا رد - انھوں نے ایسے رسالے بھی لکھے جو اس وقت کے تمدن کو بے نقاب کرتے تھے، مثلاً رسالۃ القیان، رسالۃ فی ذم اخلاق الکُتّاب، اور کتاب البخلاء، انھوں نے ایسے رسالے بھی لکھے جو خالص فنی معلومات سے متعلق تھے جیسے کتاب المعادن، اور کتاب الأوفاق والریاضیات - جاحظ کی دو باتیں خاص طور پر ان کے ہم عصر اہلِ علم و قلم کو ناگوار تھیں، ایک تو ان کے

نوٹ:- حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط کا سلسلۂ اشاعت جولائی سے پھر جاری ہوگا۔

ان کے قلم کی تیزی اور دوسرے ان کا عباسی خلفاء (مامون، معتصم، واثق، متوکل) اور وزیروں سے تعلق، اور ان حضرات کی ان کے ساتھ داد و دہش اور قدر دانی کا برتاؤ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد اور بصرہ کے بہت سے محدث، فقہا اور متکلم ان کی علمی شہرت اور ادبی وجاہت کی عمارت گرانے کے درپے ہو گئے، ان کی کتابوں پر اعتراض کی آندھی چل پڑی، کسی نے موضوع پر نکتہ چینی کی، کسی نے ان کے نقد پر، کسی نے اسلوب بیان پر، کسی نے نظریات پر، کسی نے ان کی مذہبیت پر، اور ایسے اللہ کے بندے بھی تھے جو سرے سے کتابی علم کے دشمن تھے اور چاہتے تھے کہ علم صرف حفظ و سماع کے ذریعہ حاصل اور نشر کیا جائے۔

جاحظ نے کتاب الحیوان کی پہلی جلد کا آغاز معترضین کے شکوہ سے کیا ہے اور کوئی ۲۵ درجن کتابیں گنائی ہیں جن پر حملے کئے گئے تھے، ان میں سے متعدد کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، کچھ تنوع مضمون کی خاطر مگر شاید زیادہ تر طنز و طعن سے متاثر ہو کر جاحظ نے ایک ایسا موضوع اختیار کیا جو نہ تو محض ادبی تھا، نہ محض فنی، نہ مذہبی، اور نہ اختلافی، یہ موضوع تھا جانور۔ جانوروں پر جاحظ نے علمی یا سائنٹیفک بحث نہیں کی ہے اور نہ وہ ایسا کر سکتے تھے، کیوں کہ جس عہد میں وہ تھے، وہ تجرباتی سائنس کا عہد نہ تھا، اس لئے کسی کو یہ توقع نہ رکھنی چاہیئے کہ اس کتاب میں جانوروں کا مطالعہ اس طرح کیا گیا ہو گا جیسا موجودہ زمانہ میں علم الحیوانات کے ماہر کرتے ہیں۔ بلکہ کتاب میں ہاتھی سے لے کر چیونٹی تک بہت سے پرندوں چرندوں، درندوں اور کیڑے مکوڑوں کے وہ عادات و صفات اور خصائص بیان ہوئے ہیں جو خود مصنف یا دوسرے ماہرین حیوانات نے مشاہدہ کئے تھے۔ لیکن آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ اس ضخیم کتاب میں جانوروں سے زیادہ دوسری باتیں بیان ہوئی ہیں۔ جن کو ہم ادبی، لغوی، لسانی، عمرانی اور نفسیاتی عنوان کے تحت رکھ سکتے ہیں۔

جاحظ کا دماغ اور قلم دونوں بہت تیز تھے اور قلم شاید ضرورت سے زیادہ تیز گام تھا اسی وجہ سے اس عہد میں جب کہ لکھنا مطعون اور حفظ و سماع مستحسن و مقبول تھا، جاحظ نے

کتابت کے دریا بہادئے، ان کی یہ بات ہم عصر علماء کو سخت ناگوار ہوئی اور انھوں نے علم کتابی کی تنقیص، اور حفظ کی تحسین پر خوب جوشِ زبان صرف کیا، جاحظ نے کتاب میں اس رویہ کی بھی شکایت کی ہے اور کتابت کی تائید میں عقلی دلیلوں کے علاوہ، قرآن، حدیث، تاریخ و اجماع سے مدد لے کر بہت تفصیلی جواب بیس پچیس صفحوں میں دیا ہے۔

بحیثیت مصنف جاحظ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مواد کی تنظیم و ترتیب کے بالکل قائل نہیں ہیں، ایک ہی صفحہ پر دس قسم کی باتیں مضمون زیرِ بحث میں جمع کر دینا ان کے ہاں عام بات ہے، ابھی جانور کا ذکر کر رہے ہیں کہ خصی، قلم، پلیٹون، جن اور آگ، کا ذکر چھیڑ دیا اور دس بیس شعر بیچ میں کر دئے۔ یہ استطرادات صرف مزہ بدلنے کے لئے ہی نہیں ہوتے بلکہ اکثر مستقل مباحث بن جاتے ہیں جو کبھی کبھی دس، بیس، تیس، چالیس صفحات گھیر لیتے ہیں اور خود اپنے اندر بہت سے استطرادات سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ جاحظ کا یہ انداز خاص ہے، ان کو اس کا شعور ہی نہیں وہ اس کے مبلغ، ملقن اور مداح بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سنجیدہ مضمون کو دیر تک نہیں برداشت کیا جا سکتا لہٰذا دماغی تناؤ کم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تفریحی باتیں شروع کر دی جائیں، بنابریں جدّ و ہزل، قصّے کہانیاں، لطیفے بذلہ سنجیاں، ہنسی مذاق حتیٰ کہ جنسی اور شہوت انگیز مضامین کا تناسب ان کی کتاب میں بہت ہو گیا ہے۔

۱۔ کتاب الحیوان جاحظ کی مطبوعہ کتابوں میں سب سے ضخیم کتاب ہے، مصنف نے اس کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے اور میرے پیش نظر جو اڈیشن ہے وہ بھی سات حصوں میں ۱۳۲۳ھ میں مصر سے شائع ہوا تھا۔ کل کتاب میں تقریباً گیارہ سو صفحات ہیں، کتاب میں تحریف و تصحیف کی بہت سی غلطیاں ہیں، چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

۳/۳۶ - ولمّا ولی حارثه بن بدر سرف ، صحیح سُرَّق

۳/۱۱۴ - قیل لصحاف العبدی ، صحیح صُحار العبدی

۱۶۶/۳ - تسمیة الفرس بشکود ، صحیح تسمیة الفرس ببشبکود

۵۷/۷ - لعمر ابیك ما حمّام کسری علی البانین من حمّام فیل
ولما ارقاضیاخلف الموالی کنسبتنا علی عهد الرسول

صحیح - لعمر ابیك ما حمّام کسری علی الثلثین من حمّام فیل
وما ارقالنا حول الموالی بسنتنا علی عهد الرسول

کتاب میں لگ بھگ چھ ہزار شعر اور بہت سے مصرعے بیان ہوئے ہیں یعنی کتاب نثر میں ہونے کے باوجود شعر کا ضخیم دیوان بھی ہے، یہ اشعار زیادہ تر غریب الفاظ اور مشکل ترکیبوں پر مشتمل ہیں، اخلاق و سیرت کو بلند کرنے اور سنوارنے والے اشعار (جن کی تعداد عیون الاخبار میں بہت ہے) بہت ہی کم ہیں، نازک جذبات یا محبت کی ترجمانی کرنے والے اشعار بھی نہ ہونے کے برابر ہیں، کتاب میں ایک بڑا اور مشکل قصیدہ بیان ہوا ہے جس میں ناظم نے بہت سے جانوروں اور ان کی بعض صفات کا ذکر خالق کی ناقابلِ ادراک حکمت سے متاثر ہو کر کیا ہے - زیادہ تر اشعار کا موضوع جانور ہیں، ہجو کے شعر بھی کافی ہیں اور درجنوں میں جنسی اور شہوت انگیز باتوں کا ذکر ہے -

۲ - جانوروں کے بارے میں کتاب میں جو معلومات ہیں ان کا ایک اقل قلیل حصہ مصنّف کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے، باقی دیگر ماخذوں سے مستعار ہے - ان ماخذوں میں غالباً زیادہ تر زبانی ہیں یعنی وہ لوگ جو جانوروں کا گہرا ذاتی تجربہ رکھتے تھے - مصنف نے بہت جگہ اس طرح حوالہ دیا ہے: قال صاحب الکلب ، قال صاحب الدیك ، قال صاحب الحمام ، قال صاحب الفرس ، قال صاحب الفیل ، اور کسی کتاب کا نام نہیں لیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ماخذ غالباً زبانی تھے، کتاب میں قال صاحب المنطق (ارسطو) کا حوالہ بھی بکثرت آیا ہے - مصنف نے صرف ایک جگہ (۱۹/۲) تصریح کی ہے کہ ارسطو نے حیوانات پر کتاب لکھی تھی جو غالباً اس کے پیشِ نظر

تھی، اکثر عربی تصانیف میں (بالخصوص تیسری صدی کے بعد) یہ خامی نظر آتی ہے کہ ان میں ماخذ کا حوالہ نہیں ہوتا، مصنف بڑی بڑی عبارتیں دوسری کتابوں سے بلا اعتراف ماخذ اپنی کتابوں میں ضم کر دیتے ہیں۔ جاحظ اس باب میں محتاط اور صالح فکر تھے، انھوں نے اپنی اور دوسروں کی معلومات گڈمڈ نہیں کیں

۳۔ مصنف نے بہت سے ایسے چوپاؤں اور پرندوں کا ذکر کیا ہے جن میں کچھ پالے جاتے ہیں مثلاً کبوتر، گھوڑا، ہاتھی اور کچھ جنگلی زندگی بسر کرتے ہیں، جیسے شہد کی مکھی، زرافہ، ہرن اور شتر مرغ۔ درندوں میں ایسے درندوں کا ذکر ہے جو اپنی قوت اور جارحانہ صفات کے لئے ممتاز ہیں مثلاً شیر، تیندوا، ریچھ، نیل گائے۔ گوشت خور جانوروں میں ایسے جانوروں کا ذکر ہے جو چالاکی اور بعض حیرت انگیز خصائص کے حامل ہیں جیسے لومڑی، بجّو، وَزَغ (جنگلی چھپکلی) کیڑے مکوڑوں میں ایسے کیڑوں کا ذکر ہے جو سمجھ بوجھ یا ایذا رسانی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً چیونٹی، نیولا، سانپ، بچھو۔ ان جانوروں میں جو جانور جس قدر انسان سے قریب ہے یا جتنا زیادہ اس کے استعمال میں آتا ہے، یا جس قدر اپنی خصائص کے اعتبار سے محیر ہے، اتنا ہی اس کا ذکر زیادہ مفصل کیا گیا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مصنف نے جانوروں کے انتخاب میں فائدہ اور قرب انسانی سے زیادہ ان کی مابہ الامتیاز حیثیت کو ملحوظ رکھا ہے، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ پالتو جانوروں میں بکری، اونٹ، گائے، بھینس اور گدھے کا ذکر بہت کم ہے، اس کے برخلاف کتے، کبوتر، مرغی کا ذکر نہایت تفصیل سے ہوا ہے۔ ایک بات اور سمجھ لینا چاہیئے اور وہ یہ کہ مصنف کے دائرۂ بیان میں صرف وہ جانور ہیں جن کے بارے میں اس کو اپنے مشاہدہ یا دوسروں کے تجربات سے علم ہو سکا ہے۔ کتاب میں کتے اور کبوتر پر سب سے زیادہ تفصیلی بحث کی گئی ہے اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ ان کے بارے میں معلومات زیادہ فراہم تھیں بلکہ یہ بھی ہے کہ کتا وفاداری و خود فراموشی کی مثال اعلیٰ ہے اور کبوتر کو پیغام

رسانی کی محیر عقل صلاحیت خالق نے عطا کی ہے کتے کی نجاست اور اس کو مارنے کی تائید میں جو آثار رسول اللہ کے وقت سے مشہور تھیں ان سب کو بیان کیا ہے پھر اُن عقلی و نقلی دلیلوں کو تفصیل سے پیش کیا ہے جو کتے کی خوبیوں اور فوائد پر ماہرین اور خود مصنف کے پاس موجود تھیں، ان حدیثوں کو جو قتل کلاب کی مؤکد ہیں صحیح مانتے ہوئے مصنف نے اُن عوامل و محرکات کی کھوج کی ہے اور خوب کی ہے جن کی بناء پر رسول اللہ نے کتوں کی مخالفت کی اور یہ ثابت کیا ہے کہ امتناعی حکم کی وجہ خاص تھی اور جب یہ وجہ نہ پائی جائے تو حکم امتناعی بھی منسوخ ہو جانا چاہیئے میں آگے حکم امتناعی پر مصنف کی رائے زیادہ وضاحت سے پیش کروں گا۔

۴۔ مصنف نے جانوروں کے خصائص، طور طریق، فراست اور نفسیات کے ساتھ بہت سا ایسا مواد بھی جمع کیا ہے جو ان کی قدرتی زندگی اور رہنے سہنے کے ڈھنگ سے متعلق ہے مثلاً وہ بتاتا ہے کہ پرندہ انڈے دیتا ہے یا بچے، نیز یہ کہ اگر انڈے دیتا ہے تو ان کی تعداد کیا ہوتی ہے، ان کو کتنے دن سینا ہوتا ہے، آیا نر اور مادین دونوں سیتے ہیں، یا کوئی ایک اور اگر دونوں سیتے ہیں تو زیادہ کون سیتا ہے، انڈے سے بچے کتنے دن میں نکلتے ہیں، پھر اُڑنے کے لائق ہونے تک کس طرح ماں باپ ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں، کس طرح کھلاتے ہیں، اور پرواز کی مشق کراتے ہیں، مختلف پرندوں کی غذا کیا ہوتی ہے، ایک ہی قسم کے جانور کس کس نوع کی غذا کھا لیتے ہیں، کتنی دفعہ اور سال کے کس موسم میں انڈے نکلتے ہیں، نر و مادین کا جنسی میلان کس پایہ کا ہوتا ہے، ان کی عمر کتنی ہوتی ہے، اگر جانور کے بچہ ہوتا ہے تو اس کا زمانۂ حمل کتنا ہے، بچوں کی تعداد کیا ہوتی ہے، اور سال میں کتنی بار ہوتے ہیں، حمل کے زمانہ میں مادہ کا طرزِ عمل کیا رہتا ہے اور وضع حمل کے بعد کیا، بچہ ہونے کے بعد دودھ کتنے دن میں اُترتا ہے اور کس طرح اترتا ہے، نیز یہ کہ جانوروں کے دودھ میں کس قسم کا فرق ہوتا ہے۔ مصنف یہ بھی بتاتا

ہے کہ کون سے پرندے دوسری صنف کے انڈے سے لیتے ہیں اور کون سا چوپایہ دوسری صنف کے چوپایہ سے جنسی فعل کر لیتا ہے۔ مصنف نے بعض جانوروں کے جسموں اور پروں کی ساخت کا بھی ذکر کیا ہے، اور عمدہ قسم کے کتّوں کی پہچان اور قسمیں بتائی ہیں، ان میں جو شریف و فیاض اور جو لئیم طبیعت ہوتے ہیں ان کی بھی نشان دہی کی ہے، جانوروں کے پسینہ، قے، پیشاب، جلد کی بو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ بعض جانوروں مثلاً کبوتر، کتا اور ہاتھی کی بیماریوں، بیماریوں کے اسباب اور علاج کا بھی ذکر کیا ہے، یہ بھی بتایا ہے کہ بعض جانوروں کے گوشت یا ان کی راکھ یا پاخانہ سے کن انسانی امراض کو فائدہ ہوا ہے۔ بعض جانوروں کے خصی کرنے پر بھی مصنف نے روشنی ڈالی ہے، رسول اللہ، صحابہ اور تابعین کی خصی کرنے سے متعلق آرا پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ مصنف یہ بھی بتاتا ہے کہ جانور کن اعضا کو دفاع یا حملہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کتاب میں چند ایسے جانوروں کی بھی تصریح ہے جو بیٹ یا گوز کے ذریعہ مدافعت کرتے ہیں، جانوروں کی باہمی عداوت پر بھی مصنّف نے تحقیق کی ہے اور بتایا ہے کہ کون سا جانور کس جانور کا دشمن ہوتا ہے، اور کون سے جانور باہم رواداری سے پیش آتے ہیں، مصنف نے مختلف جانوروں کے اعضائے تناسل کے عربی نام بھی الگ الگ گنا دئے ہیں اور ہزل کے موڈ میں آ کر ایسے قصّے بھی بیان کئے ہیں جن میں آدمی، کتوں، بکریوں اور بعض دیگر جانوروں سے ہم صحبت نظر آتا ہے۔

(الف) ذکرِ حیوان کے چند دلچسپ نمونے

۵ - حَمام (حمام کا اطلاق مصنّف نے متعدد پرندوں مثلاً شہری و جنگلی اور پہاڑی اور چھوٹی بڑی فاختہ پر کیا ہے) حمام آٹھ ماہ انڈے دیتا ہے، اگر اس کی مناسب دیکھ بھال کی جائے تو پورے سال دیتا رہتا ہے، مُرغی دس ماہ انڈے دیتی ہے، بعض مرغیاں بڑی ہوتی ہیں اور بڑے انڈے دیتی ہیں اور بہت کم سیتی ہیں، بعض پالتو مرغیاں ایک دن میں

دو دو انڈے دیتی ہیں، ایسی مرغیاں بھی ہوتی ہیں جو زیادہ انڈے دینے سے مرجاتی ہیں۔
خُطّاف (ابابیل) سال میں صرف دو بار انڈے دیتی ہے اور اپنا گھونسلہ مضبوط اور اونچی
جگہ بناتی ہے۔ کبوتر، فاختہ، اطرغلات؛ اور برمی کبوتر سال میں دو بار انڈے دیتے ہیں۔
گھریلو کبوتر دس بار۔ قبج (کبک) اور تیتر اونچی گھنی گھاس میں انڈے دیتے ہیں، جب
پرندہ انڈے دیتا ہے تو انڈہ نچلے حصہ سے نہیں نکلتا بلکہ موٹی طرف سے باہر آتا ہے، نُکیلے
سرے والے لمبے انڈے میں مادہ ہوتی ہے اور گولائی لئے ہوئے موٹے سرے میں نر۔ جب
انڈا نکلتا ہے تو اس کا چھلکا نرم اور تر ہوتا ہے جو انڈے ہوا سے پیدا ہوتے ہیں چھوٹے اور
نازک ہوتے ہیں اور کھانے میں دوسرے انڈوں سے زیادہ لذیذ۔ جن پرندوں کے پیٹ میں
انڈے کا بیج ہوا سے پیدا ہوتا ہے وہ ہیں مرغی، قبج (کبک) شہری کبوتر، فاختہ، مور اور
بطخ انڈے سینا پرندہ اور انڈے کی صحت کے لئے مفید ہوتا ہے اسی طرح بچے پر بیٹھنے سے
پرندہ اور بچہ کے جسم کو فائدہ ہوتا ہے۔ کبھی بچوں پر بیٹھنے سے مرغی مر بھی جاتی ہے۔ گرمی میں سینے
سے جاڑے کی نسبت بچے جلد نکل آتے ہیں اس لئے گرمی میں مرغی پندرہ دن انڈے سیتی ہے،
سینے کے دوران میں بادل آجانے، یا گرج چمک سے انڈے خراب ہوجاتے ہیں، گرمی کے
موسم میں بالعموم انڈے زیادہ خراب اور بچے زیادہ ہلاک ہوتے ہیں۔ زیادہ تر جنوبی ہواؤں
سے انڈے خراب ہوتے ہیں، اس لئے ابن الجہم صرف اُس زمانہ میں اپنی عورتوں سے ہم صحبت
ہوتا تھا جب شمالی ہوا چلتی تھی۔ کچھ لوگ ہوا سے پیدا ہونے والے انڈے کو جنوبی ہوا کا
انڈا کہتے ہیں، کیوں کہ بعض پرندے اپنے پیٹ میں ہوا لے لیتے ہیں، کبھی خرابی کے باوجود
ہوائی انڈے سے بچہ پیدا ہوجاتا ہے، لیکن اس کا رنگ متغیر ہوتا ہے۔ اگر دوسری صنف
کا طائر کسی مادہ سے ہم صحبت ہو تو بچہ کی شکل وصورت بدل جاتی ہے۔ اور یہ شکلی فرق
مرغی کے بچوں میں زیادہ عام ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ انڈے چار طرح وجود میں آتے ہیں:-
(۱) نر اور مادہ کے ملنے سے۔ (۲) خاص اوقات میں چلنے والی ہواؤں سے۔ (۳) اس

ہوا ہے جو خاص اوقات میں نر سے ٹکراتی ہوئی مادہ کی طرف جاتی ہے۔ (مصنف نے چوتھی قسم کا ذکر نہیں کیا) ......"

"کبوتر جب ہم صحبت ہوتا ہے تو پر پھیلاتا ہے، دُم ہلاتا ہے اور بازو پھڑپھڑاتا ہے۔ مرغی کا انڈا دس دن میں تیار ہوتا ہے، کبوتر کا انڈا اس سے کم مدت میں۔ کبوتری کبھی میعاد سے زیادہ پیٹ میں انڈا روکے رہتی ہے، ایسا کسی ضرورت کے ماتحت ہوتا ہے مثلاً گھونسلہ پر کوئی حادثہ آجائے، یا خود اس کی طبیعت خراب ہو، یا بادل گرج رہے ہوں۔

...... صرف کبوتر اور انسان چومتے ہیں، بوڑھا ہونے پر کبوتر یہ عمل چھوڑ دیتا ہے، عام لوگوں کا خیال ہے کہ کوّے نر اور مادہ کا ایک دوسرے کو چونچ سے کھلانا جنسی اتصال ہے، مگر ماہرین حیوانات اس رائے سے متفق نہیں ہیں، کبوتر اور کبوتری جب ہم صحبت ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو چومتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ایسے جنسی اتصال سے انڈا تو پیدا ہوتا ہے لیکن ایسے انڈے سے بچہ نہیں ہوتا...... تین دن رات کے بعد انڈے میں بچہ بن جاتا ہے، ایسا جوان مرغی کے انڈوں میں ہوتا ہے، عمر رسیدہ مُرغی کا بچہ زیادہ دن میں بنتا ہے، اس وقت انڈے کی نکیلی طرف کے بالائی حصہ میں زردی آچکی ہوتی ہے اور انڈے کی سفیدی میں خون کا ایک نقطہ بن چکا ہوتا ہے اور یہ نقطہ پھڑکتا رہتا ہے، بچہ کا جسم سفیدی سے بنتا ہے، اور زردی سے وہ غذا لیتا ہے اور دس دن میں اُس کی جسمانی ساخت پوری ہو جاتی ہے، بچہ کا سر باقی جسم سے بڑا ہوتا ہے، ہمارے ایک ثقہ ہم مسلک عالم کا قول ہے کہ بعض مرغیوں کے انڈوں میں دو دو زردیاں ہوتی ہیں...... کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کبوتری اور اس سے ملتے جلتے پرندے تین تین انڈے دیتے ہیں، اطرغلات ہاور فاختائیں دو دو انڈے دیتی ہیں اور اگر تین دے دیں تو بچے صرف دو سے پیدا ہوتے ہیں اور کبھی ایک ہی ہوتا ہے۔ بعض پرندے پورا سال گذرنے پر انڈے دیتے ہیں، کبوتری کا ایک بچہ نر اور دوسرا عام طور پر مادہ ہوتا ہے، اس کا پہلا انڈا نر کا ہوتا ہے، اس کے بعد ایک دن رات بیٹھتی ہے تو

دوسرا انڈا نکلتا ہے، انڈوں کو سترہ سے بیس دن تک موسمی حالت کے بموجب سیتی ہے، کبوتری انڈے پر اور کبوتر بچے پر بہت مہربان ہوتا ہے۔ وہ سارے پرندے جو گوشت خور ہیں، ان کے بارے میں یہی معلوم ہو سکا ہے کہ سال میں ایک بار انڈے بچے دیتے ہیں، البتہ خُطّاف (ابابیل) دو بار انڈے دیتی ہے۔ عقاب تین انڈے دیتا ہے جن سے دو بچے نکلتے ہیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ صرف دو انڈے سیتا ہے، بعض کہتے ہیں سیتا تینوں ہے اور بچے بھی تین نکلتے ہیں مگر پرورش کے بارے سے بچنے کے لئے ایک بچہ پھینک دیتا ہے ایک رائے یہ ہے کہ عقاب لئیم طبیعت پرندہ ہے اور پرورش اچھی نہیں کر سکتا، اگر بچوں کی ماں ایثار سے کام نہ لے تو وہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اور یہی رائے عُقعُق (ایک قسم کی مینا) کے بارے میں ہے جو اپنے بچے ہلاک کر دیتی ہے چنانچہ مثل مشہور ہے اَحمقُ من عُقعُق۔ جس طرح یہ مثل ہے: اَحذَرُ من عقعق۔ عقاب کے بچوں کو مُکلّفۃ (جس کو کاسرُ العظام بھی کہتے ہیں) اپنا لیتا ہے اور ان کی پرورش کرتا ہے۔ عقاب تیس دن تک انڈے سیتا ہے اور یہی حال ہے بڑے جسم والے پرندوں کا جیسے بطخ۔ درمیانی جسامت کے پرندے بیس دن سیتے ہیں، جیسے چیل، اور کئی قسم کے باز۔ چیل کے دو انڈے ہوتے ہیں، کبھی تین انڈے بھی دیتی ہے اور ان سے تین بچے نکلتے ہیں۔ وہ سب پرندے جن کے پنجے ٹیڑھے ہوتے ہیں بچوں کے قابلِ پرواز ہوتے ہی گھونسلہ سے نکال دیتے ہیں، صرف گدھ ایسا پرندہ ہے جو بال و پر والے بچوں کے ساتھ بھی لطف سے پیش آتا ہے اور گھونسلہ سے نہیں نکالتا . . . . . کوّے کی مادہ سیتی ہے اور نر غذا لا کر اس کو کھلاتا ہے . . . . . مور کے پر بت جھڑ شروع ہوتے ہی گرنے لگتے ہیں اور جب درختوں میں نئے پتے آتے ہیں تو اس کے بھی نئے پر نکل آتے ہیں۔"

(ب) کبوتر

کبوتر کی فضیلت اور قدر و قیمت کا یہ حال ہے کہ کبوتر پانچ سو دینار (تقریباً

ڈھائی ہزار روپئے) میں بکتا ہے، اتنی قیمت نہ باز کی ہوتی ہے، نہ شاہین کی، نہ شکرہ اور عقاب کی، نہ مور اور تدرج کی، نہ مرغ کی، نہ اونٹ کی، نہ گدھے خچر کی اور اگر ہم معلوم کرنا چاہیں کہ کوئی پانچ سو دینار میں فروخت ہوا ہو تو اس کی سند چاہے رت قصوں میں مل جائے دنیائے حقیقت میں کہیں نہ ملے گی، اس کے برخلاف اگر ایسے کبوتر کی قیمت معلوم کرنا ہو جیسے بازی جیتی ہو اور بغداد یا بصرہ کے بازار میں جاکر تحقیق کرو تو بآسانی تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ایسے کبوتر کا نر بچہ بیس یا زیادہ دینار میں بکتا ہے اور مادہ بچہ دس یا زیادہ دینار میں اور انڈا پانچ دینار میں اس طرح ایسے کبوتر کا جوڑا ایک جائداد کے مساوی ہوتا ہے جس سے خاندان کے خرچ کے علاوہ قرض بھی ادا ہو جائے اور جس کی آمدنی سے گھر، باغ اور دکانیں خریدی جاسکتی ہیں...... کبوتر کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ راہ نہیں بھولتا اور اگر بھول جائے تو بڑی خوبی سے ڈھونڈھ لیتا ہے، وہ کتنا ہی دور کیوں نہ چلا جائے مگر اس کا دل وطن، گھر اور مالک میں لگا رہتا ہے، سپرد کئے ہوئے کام کو خوب یاد رکھتا ہے اور بڑی تن دہی سے اس کو انجام دیتا ہے..... اگر کبوتر کو رات میں پیام بری کے مشن پر بھیجا جائے تو وہ ستاروں سے راہ معلوم کرتا ہے، کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ فرات اور دجلہ کی رہ گذر پر اڑتا رہتا ہے یا ان وادیوں کو زیر پرواز رکھتا ہے جن سے ہو کر وہ کبھی پہلے گذرا ہے وہ پانی اور پانی کے بہاؤ کی سمت کو دیکھتا اور سمجھتا ہے اور زیادہ اڑنے کے بعد اگر وہ فرات یا دجلہ پر آنکلتا ہے تو اس کو سمجھنے میں ذرا دقت نہیں ہوتی کہ اس کا اور پانی کا راستہ ایک ہے اور یہ کہ جدھر پانی کا رخ ہے اسی طرف اس کو جانا چاہیئے، کبھی وادیوں کی مدد سے اس کو صحیح سمت کا اندازہ نہیں ہوتا تو وہ فضا اور راستوں سے اندازہ لگاتا ہے، اگر اس کو یہ معلوم کرنا ہو کہ وہ چڑھ رہا ہے یا اتر رہا ہے تو ہوا یا سورج کی آسمان پر پوزیشن کے ذریعہ یہ علم حاصل کرتا ہے، یہ سب کبوتر کو اس وقت کرنا پڑتا ہے جب کوئی دوسری واضح علامت راہ پہچاننے کی نہ ہو۔

کبوتر مانوس پرندہ ہے مگر نامبارک اور آفتوں سے گھرا ہوا۔ اس کے دشمن بہت ہیں، شکاری پرندے بری طرح اس کی فکر میں رہتے ہیں، شکاری پرندوں میں شاہین سے بے انتہا ڈرتا ہے اور گو کہ شاہین اور سارے شکاری پرندوں سے تیز تر اڑتا ہے، تاہم خوف اس کے اوسان خطا کر دیتا ہے اور وہ نجات کی راہ بھول جاتا ہے۔ شکاری جانوروں سے تیز تر اڑنے کے باوجود اس میں وہ چستی اترنے چڑھنے اور جھپٹنے کی وہ پھرتی نہیں ہوتی جو ان میں موجود ہے اسی وجہ سے ان کے مقابلہ میں زک کھاتا ہے، شکاری پرندے چٹان کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں[1]

(ج) سانپ

سانپ کی بے وقت موت کے تین سبب ہوتے ہیں: ایک یہ کہ اونٹ یا بکری کے ریوڑ اس جگہ سے گذریں جہاں یہ ابتدائی جاڑے میں دھوپ سینکنے پڑا ہو، یا گرمی کے موسم میں رات کے وقت ہوا کھا رہا ہو یا غذا کی تلاش میں بل سے نکلا ہوا ہو۔ دوسرے یہ کہ پہاڑی بکری، سیہی یا ورل کی زد میں آ جائے، یہ تینوں اس کی جان کے گاہک ہیں اور اس کو دبا لیتے ہیں، سور بھی اس کو کھا جاتا ہے، تیسرے یہ کہ سپیرے اس کو پکڑ لیں سپیرے کے قبضے میں آنے کے بعد وہ جلد مر جاتا ہے۔ اگر اس پر آفت نہ آئے تو بہت دن جیتا ہے۔ بڑھاپے میں جب جسمانی رطوبت ختم اور حرارت کم ہو جاتی ہے تو وہ غذا سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور صرف ہوا کھا کر زندہ رہتا ہے، بل سخت اور ابھری ہوئی زمین میں بناتا ہے، نرم مٹی میں بل کے گرنے اور نشیبی زمین میں پانی سے بہنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس کی ایک حیرت انگیز خصوصیت یہ ہے کہ اس کے دو عضو تناسل ہوتے ہیں جس طرح ضبّہ (گوہ) کے دو شرمگاہیں ہوتی ہیں[2]

---

[1] کتاب الحیوان ۳/ ۵۲، ۵۵، ۶۵؛ ۶۶، ۶۷ [2] کتاب الحیوان ۶/ ۱۶-۱۷

عربی شاعری و خیالات کا اثر پروفنسا و اطالیہ کی شاعری پر

از

جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی

(پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد)

آٹھویں صدی عیسوی کے وسط سے تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز تک عربوں کی شاندار فتوحات اور علم نوازی روز روشن کی طرح نمایاں ہے کیمیا، Chemistry فلسفہ، Philosophy طب، Medicine ریاضیات، Mathematics نجوم و تنجیم، Astronomy and astrology موسیقی، Music زراعت، Agriculture جغرافیہ، Geography کے عرب محسنین کو مثلاً ابن جبیر — Ibn Jaber رازی، Razes فارابی، Farabi زریاب، Zaryab ابن سینا، a- vecinna ابن رشد، Averroes عمر خیام omar khayyam ابن الہیثم، Ibnal Haitham المعری، Almarri الغزالی، Alghazali ابن باجہ، Avempace الکندی، Alkindi ابن طفیل، Ibn Tufail البیرونی، Alberuni ابن خلدون، Ibn khaldun ابن البیطار، Ibnal Baithar ادریسی، Idrisi وغیرہم کو تاریخ فراموش نہیں کر سکتی بغداد و شام میں یونانی سریانی علوم کے ترجمے ہو رہے تھے۔ نصرانی۔ یہود بھی عرب کے اسی چشمۂ فیض سے سیراب ہو رہے تھے پھر یہ علوم انھیں یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں کے ذریعہ اندلس پہنچے جس کی موافق سرزمین نے اس میں چار چاند لگا دیے دوسری طرف یورپ میں جہل، لغو و فاسد عقائد کی ترقی ہو رہی تھی کلیسا کی حالت بھی دگرگوں اور ناگفتہ بہ تھی۔ مسیحی کلیسا بہت سے ایسے علوم و آداب کا مخالف تھا جن سے

اور اسی علم کی وجہ سے فرانس اور اٹلی میں اتنا تفوق حاصل کیا کہ مسند پوپ پر "المرتبۃ البابادیۃ"
۹۹۹ سے ۱۰۰۳ تک سلفسٹر دوم Sylvester II کے نام سے فائز رہا۔ جب اندلس سے
ایک متبحر عالم ہو کر واپس ہوا اس کے علم و فضل کو دیکھ کر لوگوں نے اس کو جادوگر سمجھا
بادشاہوں نے اپنے لڑکوں کی تعلیم کے لئے ان کو منتخب کیا یہی وہ شخص ہے جس نے ارقام
عربی کو جس کو ہم ارقام ہندی کہتے ہیں یورپ میں رائج کیا۔ ورنہ وہ لوگ لاطینی زبان کو
بمنزلہ حروف ابجدیہ استعمال کرتے تھے۔ طلبہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑے اور شعراء عرب اور
ان کے ادیبوں کی تقلید کرنے لگے فرانس کے لوگ جو عرب کے پڑوسی تھے لاطینی زبان سے
اعراض کرنے لگے اور عربی اشعار اور ان کے ازجال سیکھنے کی طرف مائل ہو گئے اسپین کی
شاعری نے رسمیاتی قیود سے آزادی حاصل کر کے نئی نئی بحریں اور دلکش طرز اختیار کر لیا
تھا جو جدید شاعری میں نمایاں ہے رزمیہ نظمیں اور عشقیہ غزلوں میں روحانی احساسات کو
ظاہر کیا جانے لگا تھا نغمہ و موسیقی اور حسن ترنم شاعری کی جان تھی اسی طرز شاعری سے نصاریٰ
بہت متاثر ہوئے اور عربی تغزل کے دونوں طریقوں موشحات اور ازجال کو قشتالیہ
castile کی مقبول طرز . villancica کی صورت میں فروغ ہوا اس طرز کو عیسائی
گیتوں اور میلاد مسیح کی نظموں میں استعمال کرتے تھے اسپین نے اس خاص طریقہ کی ترقی کی
جس کو strophic measures کہتے ہیں جس کی ایک قسم موشح Muwash shah
(girdled) ہے اور اسی کا ایک جز زجل Zazal یا bilingnal ہے
جو ولانسیکو villancico کے بالکل مماثل و مشابہ ہے ان کے باہمی مماثل و
انطباق میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں کہ ایسا انطباق صرف
مصطلحات تک محدود رہے یا صرف ایک قسم کی شاعری میں رہے اگرچہ Rmancero
افسانوی نظم میں مستند عربی عنصر کم ہی کیوں نہ ہو اس نے بروفنسا کی شاعری پر بہت اثر
کیا۔ بروفنسا کی زبان اٹلی وغیرہ میں بھی بولی جاتی تھی عربی زبان سسلی۔ بروفنسا۔ اٹلی میں

شعر و شاعری کی عام زبان ہو گئی تھی عربی فوج اور ان کے سپہ سالار قوافی کا ذکر دلوں پر اثر کرتے تھے اس کی اشاعت میں وہ لوگ بہت سرگرم تھے ان مقامات کے پرانے طبقوں کے گیتوں کا بڑا حصہ اور ولایت جو الکین کے شعرا کے بہت سے گانے صرف اندلس کے عربی شعرا کے قصائد پر مشتمل تھے عربی شاعری جہاں گئی وہاں شعر گوئی کا مذاق بڑے زور و شور کے ساتھ فروغ پاتا رہا بے شمار اشعار ایک دوسرے تک منتقل ہوتے تھے ادنیٰ اعلیٰ سب ہی اس کے مداح نظر آتے تھے لفظوں کے اتار چڑھاؤ حسن ترنم سے محظوظ ہوتے تھے اس زمانے میں فرانسیسی زبان اور اس کے ادب کو ایسی صورت حال پیش آئی جو ان حالات میں قدرتاً زبانوں کو پیش آتی ہے اس زمانہ میں مسلمہ طور پر عرب اور یونان بہت زیادہ متمدن تھے اس لئے فرانسیسی زبان قدرتاً عربی زبان سے متاثر ہوئی سڈیلیو Sedeleau لکھتا ہے کہ فرانسیسی زبان میں لاطینی زبان سے زیادہ عربی زبان کی نادر تعبیریں داخل ہوئیں لامنس Lamensa کے بیان کے مطابق فرانسیسیوں نے اپنی زبان میں توسو عربی الفاظ داخل کئے[1] عربوں نے شاعری کی جو روح مغرب میں موشح اور زجل کی صورت میں پھونکی تو ان لوگوں کو جو عربی میں ماہر ہو رہے تھے اس سے حد درجہ شغف ہوا یورپ میں شاعری کی ترقی ابھی نہیں ہوئی تھی صرف کچھ گانے اور گیتیں اس کی شاعری تھی "عربوں کے اختلاط نے یورپ کو لاطینی اقوام کے شعر کے معنی بتائے اور جو چیز پسند آئی اسکو عربوں سے سیکھا اور عربوں کی شاعری کے دوسرے اصناف رزم، بزم عشق و محبت کو کام میں لائے۔" (تمدن عرب از لیبان) ابو عبداللہ نے جب سے اپنا درد انگیز موشحہ اپنی محبوبہ مریم کی قبر پر پڑھا تھا اس وقت سے شاید ہی کوئی امیر ہوگا جس کے نام کو عاشقانہ قصیدوں یا رزمیہ نظموں نے زندہ نہ رکھا ہو اس میں اشبیلیہ Sevillea کا آخری بادشاہ معتمد ناقابل واگذشت ہے پادری حضرات بھی تاثرات سے خالی نہ تھے بلکہ تقریباً عربی تمدن کے نمائندے نظر آنے لگے تھے ان میں شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا قرطبہ Cordova طلیطلہ Toledo اشبیلیہ Sevelle اور غرناطہ Grenada کے

---

[1] فرانسیسی عربی مشتق الفاظ پر ایک نظر از لامنس

سرچشموں سے تشنگانِ علوم اپنی پیاس بجھانے دور دراز ممالک سے آتے تھے اس طرح درمیانی تبدیلی کا ایک آلہ medium of transmission یہی زجل اور اس کا مقابل و مماثل villancico تھا خوش قسمتی سے اس خاص قسم کے ادب کا قیمتی حصہ زمانہ کے دست برد سے محفوظ رہ گیا تھا یہ تقریباً ۱۵۰ قطعات ہیں جن کو ایک اندلسی شاعر ابن قزمان[1] نے بارہویں صدی کے ابتداء میں مخلوط محاورہ میں لکھا تھا۔ ابن قزمان تروبادور Troubadours کا ہم عصر تھا اس کی شاعری کی مصطلحات قوافی عروض و اوزان کے لحاظ سے بالکل عربی ہیں بحریں لفظی accentual ہیں ارکان تہجی کے مطابق نہیں (syllabic) اس نے اپنے ابیات نہایت ہوشیاری سے نظم کئے ہیں جو گانے والی جماعت کے ذوق کے مطابق ہے کیوں کہ اس کی اکثر نظمیں بقول Ribera ایک ڈرامائی اور افسانوی داستان ہے جو سڑکوں پر گانے والی جماعت کے لئے لکھی گئی ہیں ان ابیات کا موازنہ بروفنسالی شاعر کے مقفی طریقہ کار سے ایک نمایاں مطابقت ظاہر کرتا ہے William of Poitiers کی نظمیں ان بحروں میں لکھی گئی ہیں جو ابن قزمان کی بحروں کے بالکل مماثل ہیں بلکہ بعض تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اس تجزیہ کی ہم آہنگی کے مطابق معلوم ہوتے ہیں جو گویوں کی جماعت کے لئے بنایا گیا تھا۔ اور Provencal بروفنسالی شاعری میں جو اوزان و قوافی کا استعمال پایا جاتا ہے اور بالیقین پایا جاتا ہے اس کے وجود کا کوئی بنیادی ثبوت ان کے یہاں نہیں ہے بخلاف اس کے اندلسی گویوں کی شاعری اب تک ان کی مقفی اور موزوں شاعری میں موجود ہے جس کا اثر بروفنسال Provencal شاعری سے انفانسو کی نظموں میں یا متاخرین اندلسی شاعروں کے اشعار میں اب بھی ممتاز کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال فرانسیسیوں کے فقرا و مساکین گیارہویں صدی میں اشعار پڑھتے اور عربی مداح خوش الحانی سے گاتے تھے اور دروازہ دروازہ، راستے راستے دستِ سوال دراز کرتے تھے تو لوگ ان کے الفاظ کے حسنِ ترنم کو سُن کر مسحور ہو جاتے تھے اور داد و دہش کی بارش ہونے لگتی تھی اور یہ ان کے اقوال کے فہم و ادراک یا نزاکت کی وجہ سے

---

[1] Legacy of Islam

نہیں بلکہ غایتِ شوق میں کہ کس قدر خوش لحن اور خوش نغمہ ور سرور افزا یا دردناک قوافی میں گاتے ہیں، رومانی زبان دو حصوں میں منقسم ہوگئی تھی ایک کا نام لسان اوق (١) Langued oc تھا اس کو اہلِ جنوب خاص کر بروفنسا Provence کے رہنے والے بولتے تھے دوسرے کا نام لسان اویل Langue d'oil تھا اس کو اہلِ شمال خاص کر جزیرہ فرنسا France بولتے تھے اور یہ وہ حکومت ہے جس کا دار السلطنت پیرس Paris ہے شمالی شعراء کو تروفیر Trouvères کہتے تھے اور جنوبی شعراء کو تروبادور Troubadours کہتے تھے تروبادور وہ لوگ ہیں جو بروفنسا کی حکومت میں مداحوں کی ایک قسم تھی یہ لوگ ایک محل سے دوسرے محل ایک قلعہ سے دوسرے قلعہ کی طرف چکر لگایا کرتے تھے اپنے قصائد کو گاتے تھے امراء اور ذی وجاہت لوگوں کی تعریف کرتے تھے اور اپنے ادب کو علم [illegible] [illegible] کہتے تھے ان کے اشعار میں عرب کی طرح قوافی کا استعمال نہیں ہوتا تھا بجائے قوافی کے ان کے یہاں وقف کرنے کے لئے جگہ یعنی مرکز موقف ہوتے تھے جیسے وہ اشعار جن کو بکریوں کے چرواہے گاتے تھے ہاں اس شاعری کا ایک فن ضرور تھا جس کو وہ لوگ تنسون Tenson کہتے تھے جو اندلسی شاعری سے مشابہ تھی اہلِ علم کا [illegible] اتفاق ہے قوافی بروفنسال شاعری میں پہلی مرتبہ داخل ہوئی اور وہ بالکل عرب سے ماخوذ ہے[1] فرانسیسیوں کے نزدیک قافیہ شعر کے ہر دو بیت یا ہر دو قطعہ کے اخیر میں صوتی حروف کے اخیر والے حرف کا اور اس کے مابعد والے ساکن حرف کا متحد ہونا ہے جیسے ساج وباج Sage, Page لہٰذا جس چیز کو سماع اور تقلید سے لیا وہ علم قوافی ہے اس سے پہلے وہ لوگ قافیہ کے عوض میں اسونانس Assonance استعمال کرتے تھے اور اس کے معنی شعر کے ہر دو بیت کے اخیر میں صوتی حروف کے اخیر والے حرف کا متحد ہونا اور اس کے بعد والے ساکن حرف کا کوئی لحاظ نہ ہونا ہے جیسے ساج Sage اور آرم Arme جن حضرات نے سائنس فلسفہ

---

[1] تاریخ الادب لافرنج والعرب از روحی بک الخالدی

ادب - علم تجارت وزراعت نیز مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے وہ بطریق احسن جانتے ہیں کہ مراقشی عرب کا اثر لاطینی پر کتنا ممتاز و نمایاں ہے، موجودہ شاعری میں قوافی کا جو وجود ہے ان قوافی سے یونان والے بھی ناواقف تھے کہیں کہیں لاطینی زبان میں پتہ ملتا ہے مگر وہ موجودہ قوافی و اوزان سے بالکل مغائر تھی مقاصد بھی جداگانہ تھے یہ صرف عربوں کی ترکیب میں مطابقت کے لئے وضع کی گئی تھی اس کا مقصد شعر کے اختتام کی نشان دہی کے لئے نہ تھا بلکہ مفہوم کی نشان دہی کے لئے تھا ایک فعل Verb یا ایک اسم Noun ایک دوسرے کے مقابل استعمال کیا جاتا تھا اور اس تکرار Repetition کا اثر یہ تھا کہ شاعر مطابق اور باہم مشابہ خیالات کو تین یا چار شعر تک جاری رکھ رہا ہے اس کے بعد قوافی و اوزان کا سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا قرونِ وسطیٰ کی لاطینی نظموں میں قوافی کا استعمال زیادتی کے ساتھ ملتا ہے یعنی آٹھویں یا نویں صدی میں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ لاطینی اور عربوں کا اختلاط آٹھویں صدی میں ہوا لہذا قرینِ قیاس یہی ہے کہ لاطینی زبان کی پہلی مقفّیٰ شاعری عربوں ہی سے لی گئی ہے بالکل یہی حال جرمن کی مقفّیٰ شاعری کا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ قوطا (گاتھ) Goths نے قوافی کو ان مشرقی ممالک سے جہاں سے وہ نکلے تھے یورپ میں رائج کیا ہو لیکن شعر کی قدیم صورت ٹیوٹانک قوم Teutonic Nation میں اسکینڈینیویا Scandinavia سے لی گئی تھی جس میں ردیف Alliteration تو تھی مگر قافیہ Rhyme نہ تھا، ردیف کے معنی الفاظ کی ابتداء میں انھیں حروف کو بار بار لانا ہے نہ کہ ختم پر اسی آواز کو دہرانا اور مکرر لانا ذیل میں اسی ردیف Alliteration کی جو قافیہ کی جگہ مستعمل تھی مثال لکھی جاتی ہے :

لہ Hell verheissen.

It is an example of the alliterations which supplied the place of rhyme. The lines are from the German imitation of Fouque. (Sismonde. An historical view of the literature of south of Europe.)

Hats mein oheim

Kurz mein leben kühn mein lust;

Rasch mein rasch,

Raub der ausgang,

Fliessend blut im Nyungenstam

یہی ردیف Alliteration شمالی زبانوں کا زیور تھا اور جنوبی اقوام کے یہاں اسونانس Assonance کا استعمال نمایاں تھا لیکن قوانی جو عربی کی ہر اصناف کی شاعری کے لوازمات میں سے لطی ازرہے اور جو کانوں کے لئے خوش آیند تھے اس کو تروبادوروں نے بروفانسال شاعری میں روشناس کرایا عربی شاعری میں ان قوانی کا استعمال نظم کے اختتام تک جاری رہتا ہے اور درمیان میں کہیں یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوتا جیساکہ Nibelungen کی شاعری میں ہوتا ہے اسی طرح یہ اندلسی عربی شاعری کی قدیم خصوصیت ہے شہنشاہ فریڈرک Frederick جس نے بہت سے قصائد عربی میں لکھے ہیں کی ایک مشہور نظم ثابت کرتی ہے کہ قوانی کا بالکل یہی سلسلہ بروفنسال شاعروں نے استعمال کیا ہے۔ یہ شہنشاہ جو تقریباً تمام زبانوں سے واقف تھا ریمونڈ برنجر II کاونٹس آف پرادنس Raymond Berger II Count of Provence سے تورن Turan میں ۱۱۵۴ء میں ملا اور اس کو خلعت و جاگیر دی کاونٹس مذکور کے ساتھ بہت سے شعرا تھے جو اس کی قوم کے تھے ان شاعروں نے فریڈرک کو اپنے اعلیٰ اعلیٰ نازک خیالات کی کثرت اور اشعار کی ہم آہنگی اور اجزا کی باہمی مطابقت سے بہت خوش کیا جس کا فریڈرک نے ان الفاظ میں جواب دیا:۔

French	English Translation.
Plas mi cavalier Francez	A Frenchman I'll have for my cavalier
E la donna catalana.	And a Catalonian dame.

El'onrar del Ginoes, A Genoese for his honour clear,
E la court de Castellana, And a court of Castilian fame;
Lou cantar Provencalez The Provencal songs my ears to please,
E la danza Trevisana, And the dances of Trevisan.
E lou corps Aragones, I'll have the grace of the Arragonese,
E la perla juliana, And the pearl of Julian;
La manse kora dis Angles An Englishman's hands and face for me,
E lou donzel de Toscana And a youth I'll have from Tuscany.

عربی شاعری میں بھی ہر شعر کا دوسرا مصرعہ اکثر اسی حرف پر ختم ہوتا ہے اور اسی تکرار کو
پروفنسال نے اسی طرح سے اختیار کیا اسی کی ایک دوسری شاندار مثال Geofrey de
Rudel کے اشعار میں پائی جاتی ہے یہ پروفنسا کے Blieux کا ایک شریف زادہ تھا اور
ان لوگوں میں تھا جن کو Frederick Barbarossa کے سامنے ۱۱۵۴ میں پیش کیا گیا تھا یہ
اشعار حسب ذیل موقع پر کہے گئے تھے:۔ کچھ بہادران سرزمین مقدس Holy Land
سے واپس ہو کر تریپولی Tripoli کی شہزادی (Countess) کی شاندار مہماں نوازی کی
پرجوش تعریف کی جیفری روڈل Geoffry Rudel بن دیکھے عاشق ہو گیا اور اپنے
ایک دوست Bertrand d'Allamanon کو جو اسی کی طرح تروبادور تھا ساتھ
لے کر لیونٹ Levant گیا اور جہاز پر سوار ہو کر سرزمین مقدس پہنچا راستے میں شدید بیمار ہو گیا
اور جب تریپلی Tripoli کے بندرگاہ پر پہنچا تو بولنے کی طاقت بھی نہ تھی جب شاہزادی کو
اطلاع ہوئی کہ ایک مشہور شاعر اس کے عشق میں مر رہا ہے تو وہ جہاز ہی پر جا کر اس سے ملی
اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کو ڈھارس دلایا اور خوش کرنے کی کوشش کی تاکہ اس کے
رگ و ریشہ میں کچھ قوت آ جائے جیفر نے قوت گویائی کو محسوس کر کے تہِ دل سے اس کا شکریہ

ادا کیا اور جذباتِ محبت کا اظہار کیا اور یکایک اسی اثنا میں موت کا شکار ہو گیا ترپولی
Tripoli میں مدفون ہوا شہزادی نے اس کی یادگار میں ایک قبہ بنایا جس پر ایک عربی کتبہ
نصب کیا بہرحال وہ نظم جس کو اس نے اپنے آخری سمندری سفر سے پہلے کہا تھا وہ محفوظ ہے
جو ناظرین کے لئے دلچسپی اور صحیح قسم کا اثر معلوم کرنے کے لئے اصل بروفنسال معہ ترجمہ
فرانسیسی وانگریزی لکھی جاتی ہے

Provencal بروفنسال	Frech الترجمة الفرانسارية
Irat et dolent men partray	Irrite, dolent partirai
Si ell non vey cet amour de luench	Si ne vois cet amour de loin
Et non say qu, aurala veray	Et ne sais quand je le verrai
Car sont trop noutras terras luench	Car sont par trop nos terres loin
Diell que fer tout van e vay	Dieu qui toutes choses as fait
Et forma aquest amour luench	Et, formas cet amour si loin
My don poder al cor car hay	Donne force a mon coeur, car ai,
Esper vezer l, amour de luench	L'espoir de voir m, amour all lo[in]
Sagnour tenes mi pour veray	Ah! seigneur, tenez pour line vrai
L, amour qu, ay vers ella de luench	L, amour que ai pour elle de loi[n]
Car pour un bean que men eslay	Car pour un line que j'en aurai,
Hay mille mals, tant soy de luench	Jai mille maux tant je suis loin
Jad, auta amour non jauzirai	Jad'auta amour de loin
Si ieu non jaudest amour de luench	Si non dest amour de loin
ou, une plus bella non en say	ou, une plus belle je ne n'sais

Provench پروفنسال Frenche الترجمة الفرنسارية

En luez que sia ny Prey ni luench En lien qui soit ni Preo ni loin

English translation الترجمة الانجلیزیة

Angry and sad shall be my way
If I behold not her afar.
And yet I know not when that day,
Shall rise for still she dwells afar,
God, who hast formed this fair array,
of worlds, and Placed my love afar,
Strengthen my heart with hope, I pray.
of seeing her I love afar.
oh, Lord believe my faithful lay,
for well I love her though afar,
Though but one blessing my repay.
The thousand griefs I feel afar.
No other love shall shed its ray.
On me, if not this love afar,
A brighter one. where, eo I stray
I shall not see, or near or far.

دیکھئے یہاں پروفنسال شاعری کی نظم کے قوافی کی مطابقت کے لئے تراجم میں بھی قوافی کا لحاظ رکھا گیا تروبادور ہمیشہ اسی خاص طرز ہی کے پابند نہیں رہے جو بالکل عربی ہے

بلکہ انھوں نے ہزاروں مختلف قسم کے قوافی بنائے یہی قوافی بروفنسال شاعری کی بنیاد تھے
جہاں سے کہ یہ موجودہ یورپ کی کل قوموں کی شاعری میں رینگ گئی اعداد اور تلفظ کے
نشانات اور لب و لہجہ عربی ہی طریقہ کو نقل کر کے بروفنسال شعراء نے اختیار کیا بروفنسالی
شعراء نے قوافی کا استعمال تیرہویں صدی میں کیا عرب سے نظم میں مدح۔ غزل۔ نسیب
ہجو اور ہزل لیا جس کا نام لیریک [illegible] اور ساتیریک satire ہے جیسا کہ نثر میں قصص
ملح۔ ضرب الامثال لیا بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جن کو نثر کی حالت میں نقل کر کے نظم کر دیا
اگر عرب کے جنوبی پڑوسی اور ان کی لغت اوق Langnedoc کے لئے غلبہ ہوتا تو ہم فنون
عربیہ کی بہت سی چیزوں کو موجودہ فرانسیسی زبان میں ضرور پاتے لیکن غلبہ شمالی باشندہ اور
ان کی لغت اویل Langueduil کو ہوا اور ان کے تروفیر Trotrueres شعراء سوائے
حماسی اشعار کے اور کچھ نہ جانتے تھے ان کے قصائد چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے اور بیت کی
تالیف اس طرح کی جاتی تھی کہ ان میں قافیہ نہ ہوتا تھا ہاں ان کے یہاں اسونانس Assonance
ضرور تھا جیسا کہ اغانی رولان Chansonde-Roland میں دیکھا جا سکتا ہے تیرہویں صدی
میں تروفیر شعراء تروبادور کے طریقہ پر اشعار کہنے لگے اور ان سے قوالی۔ رقت غزل۔ لحن
موسیقی سیکھا ان کے شہسوار عرب کے شہسواروں کی تقلید کرنے لگے اور سوار کی فضیلت
سواری میں مہارت۔ اشعار کی یادداشت۔ اور شطرنج کے کھیل پر موقوف ہو گئی ان
کی شاعری میں عربی قوافی کے داخل ہونے سے ایک لطیف حسن پیدا ہو گیا یہیں پر ایک
بات اور قابلِ غور ہے وہ یہ کہ ابن قزمان کی نظموں میں اندلس کے درباری شعراء کے بلند خیالات
اور عام نظموں کی صحیح داستان کا پتہ نہیں ملتا اگرچہ nillamof Portiers کے بعض
کارنامے اسی قسم کی اخلاقیات سے دور نہیں ہیں مگر پھر بھی اندلسیوں کی اس عام نظم کا لب و
لہجہ بروفنسا کی رسمی شاعری سے جو ان کی درباری شاعری کا نمونہ کمال ہے بالکل مختلف معلوم
ہوتا ہے لیکن ابن قزمان تو عربی اندلسی معاشرت کے ایک حیرت انگیز انحطاط کی نمائندگی کرتا

ہے عربی مصنفین نے جو دوسری مشہور نظموں کے تراجم کا حوالہ دیا ہے اس سے اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے ہر دل عزیز کارناموں میں (خاص کر گیارہویں صدی میں جب اندلس کی تہذیب اوجِ کمال پر تھی) درباری شاعری کا نمونہ کمال بطریق احسن منعکس ہے اس قسم کی شہادتوں سے جن سے اندلسی درباری شاعری اور پروفنسا کی شاعری کا منطبق اور باہم مماثل ہونے کا ثبوت ملتا ہے تبدیلی اور تاثیری اصول کو رد نہیں کیا جا سکتا اس کے علاوہ اندلسی اور پروفنسال شاعری کی ہم آہنگی اور نغمہ و لحن کی باہمی یگانگت بھی اس پر کافی روشنی ڈالتی ہے Ribera نے تو خود لفظ تروبادور Troubadour کو عربی لفظ طرب سے مشتق مانا ہے جس کے معنی گانے اور باجے کے ہیں Music + Song اور اگر تروبادر Troubadour کو Trouver ہی سے متعلق سمجھا جائے تو بھی غور کرنے کا مقام ہے کہ عربی لفظ "وجد" Wagda کے معنی بھی محبت۔ درد اور تکلیف کے جذبات کا محسوس کرنا ہے۔ لہذا اگر ہم پروفیسر Makail کے اس قول پر پورا دھیان نہ بھی دیں "کہ جیسے یورپ مذہب میں (Judaea) کا زیر بار احسان ہے اسی طرح رومانس Romance میں عرب کا زیر بار احسان ہے تب بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ عربی شاعری نے یورپ کی زیر بحث شاعری پر کتنا اثر کیا ہے۔

فنِ تشخیص میں بھی فرانس بنیادی طور سے عرب سے متاثر نظر آتا ہے اس کی ایجاد کنیسہ سے ہوئی یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کے قتل و سولی کا قصہ یا دوسری مقدس ہستیوں کے قصے ڈرامائی طریقہ سے ظاہر کرنا چاہتے تھے اور یہ ڈرامائی طریقہ یونانیوں سے لیا تھا یہ لوگ اس طریق سے ناواقف تھے چودہویں صدی میں لاطینی کتابوں کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہوا اور ان لوگوں نے علومِ یونان اور ان کا فلسفہ عرب سے لیا اس لئے کہ خود تو یونانی زبان سے نابلد تھے لہذا ارسطو Aristotle کی کتابوں کا ترجمہ اس لاطینی سے کیا جو عربی سے ترجمہ کی گئی تھی اس طرح جب فرانس کو اسلامی زبان کے ذریعہ یونانی حکمت و فلسفہ و علوم کا پتہ

لگا تو یہ لوگ یونانی زبان سیکھنے میں مشغول ہو گئے اور ان کے اشعار تمثیل کی طرف مائل ہو گئے
اور ان کے اسلوب کو اختیار کیا اس لئے کہ فن تشخیص یا تمثیل یونان اور روماں میں بکثرت
تھا اور پھر فرانسیسی نے اس میں بہت ترقی کی جیسا کہ ان کے تراجیدی Tragedy
اور کومیدی Comedy سے ظاہر و باہر ہے الکساندر ہاردی A. Hardy نے باریز Paris
میں ایک تھیٹر بنایا اور اس میں بہت سی روایات کو دکھایا جس کے موضوع اسپین سے
لئے تھے کیوں کہ وہاں عرب کے پڑوسی ہونے کی وجہ سے فنونِ ادبیہ نے ترقی کی تھی لہذا
یہ سب ترقی بنیادی حیثیت سے عرب ہی کی بدولت نصیب ہوئی کیوں کہ انھیں کے مہیا کردہ
علوم ان کو اس طرف مائل کرنے کے محرک ہوئے[1] اگرچہ براہِ راست ان سے تشخیص میں زیادہ
نہیں لیا۔ اس لئے کہ انھوں نے خود اس فن کی طرف توجہ نہیں مبذول کی اور وہ بھی کسی خامی
کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ طوالت طلب ہے اور عرب اختصار کا عادی ہے دوسرے عرب
برجستہ گو ہے اپنے علاوہ دوسرے پر نظر نہیں ڈالتا تیسرے ان کے عقیدۂ توحید نے بارمینز
مضمون کو حرام قرار دیا تھا جو ڈرامائی شاعری کا بڑا عنصر ہے۔

لوئی چہاردہم XIV Louis کے زمانہ کے مشہور ڈراما نگار شاعر فیکتور ہیو گو
سے کون ناواقف ہے اس کا باپ یوسف بوناپارٹ Bonapart
کے ساتھ اسپین گیا اور یہ مختلف سفر میں ان کے ساتھ رہا وہاں مشرقی آبادیوں کے اثرات
دیکھے وہاں اس کے خیالات زیادہ وسیع ہوئے اور اندلسی شاعروں سے متاثر بھی ہوا
الفاظ و معانی میں رقت پیدا ہو گئی اور اس کے اشعار میں اندلسی روح نمایاں ہو گئی اپنے قصیدہ
"غرناطہ" میں اندلس کے اکثر شہروں کا ذکر کیا ہے۔ اس نے جمعیت "اکادمیہ لعب الازہار"

---

[1] اس تحریک سے فرانس والے یونانی اور لاطینی کے سیکھنے کی طرف جھک پڑے یہاں تک کہ لوئی چہاردہم
کے زمانہ میں اپنے علوم و فنون کو خوب سنوارا مارکیزہ رامبویہ Marquise de Rambouillet نے اپنا
گھر ادیبوں کے لئے کھول دیا ۱۶۲۹ء میں اس میں شعراء، ادبا، قصاص بغیر طبقی تفریق کے اکٹھا ہو کر اشعار پڑھتے تھے
پھر پیرس میں ایک مجلس قائم ہوئی شعراء امراء سے ملنے لگے پہلے صرف بھیک مانگنے کے لئے مخصوص تھے پھر
کاردینال رشو Cardinal Richlieu نے الاکادمیۃ الفرنساویہ قائم کیا پھر دیکارت نے ۱۵۹۶ء۔ ۱۶۵۰ء
French academy.

accademy of the Jeux-Floraux میں جو طولوز (Toulouse) میں ۱۳۲۳ء م
میں قایم کیا تھا اور جس میں عمدہ شعراء کو انعام میں سونے چاندی کے ڈھلے ہوئے پھول دئے
جاتے تھے اور جس کا ابتدائی نام مدرسۃ العلم المفرح "College du gai savoir" تھا۔ اپنا قصیدہ
"عزاری فیردون" Virgins of Verdun اور دوسرا قصیدہ "ہنری رابع کی تعریف میں"
بھیج کر انعام حاصل کیا تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ جب شہر مون پلیہ (Mont Pallia) میں تیرھویں
صدی میں طب کا مدرسہ قائم کیا گیا جو طبیہ مدرسہ سالیرن Salerno کے بعد سب سے قدیم
طبی درسگاہ تھی تو یہاں معلمین اور مدرسین عرب اور مستعربین یہودیوں کو بلایا تھا کیوں کہ اس وقت
اندلس اوج کمال پر تھا عرب کے اس علم و فضل سے بے حد متاثر ہو کر طولوز میں یہ ادبی ادارہ قائم
کیا گیا تھا جس سے فیکتور ہوگو نے انعام حاصل کیا انھیں سب تاثرات کی وجہ سے فیکتور ہوگو کو
عرب شعرا سے حد درجہ مماثل نظر آتا ہے اس شاعر نے الشرقیات (Les Orientales)
کے مقدمہ میں لکھا ہے "کہ تمام دنیا ماہر علوم یونانی تھی اب تمام دنیا ماہر علوم مشرقی ہے
" All the world was Hellenist now it is orientalist" وہ مشرقی دنیا کی قومی ہمدردی کا معترف
ہے "اس کو ان علوم مشرقی میں فنونِ شاعری کا بیش بہا خزانہ نظر آتا ہے۔ یہ وہ سرچشمۂ فیض
ہے جس سے وہ اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہے اس کی تصانیف اور اس کی شاعری عرب شعرا سے غایت
درجہ مماثل ہے اس کی تصنیف اوراق الخریف ــــــــــــــــــــــــ
میں اس شاعر کی عربی شاعری سے مماثلت و یگانگت قابل دید ہے اللہ تعالیٰ کی تمجید و بزرگی کا بیان دیکھئے
یا حیرت و استعجاب کا نظریہ دیکھئے تو عرب شاعر سے متشابہ نظر آتا ہے عرب حیرت کا ذکر یوں کرتا
ہے " رب زدنی فیک تحیراً " جیسا کہ مشہور عرب شاعر ابن الفارض نے کہا ہے ؎

زدنی بفرطِ الحب فیک تحیرا ۔۔۔ وارحم حشا بلظی ھواک تسعرا

فیکتور ہوگو نے اسی حیرت و استعجاب کی سچی تصویر اپنی اس نظم میں کھینچی ہے جس کا
عنوان ہے " ما یسمع علی الجبل "

فقہی اور فروعی اختلافات کے اسباب

افادات

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

مترجمہ

(مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی)

فقہ اسلامی کے دور اول ہی سے جو اختلافات چلے آرہے ہیں ان کو دیکھ کر ہمارا روشن خیال اور تجدد پسند طبقہ اسلام پر نہایت ہی رکیک قسم کے الزامات عائد کرنے کی کوشش کر رہا ہے حالانکہ یہ جزئی اختلافات ایک بالکل فطری اور ضروری امر ہے اور یہ اختلافات درحقیقت مذموم نہیں ہیں بلکہ وہ رقابت اور آپس کی چشمک مذموم ہے جس کا ابتدائی دور میں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا اور جس نے چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں جنم لے کر امت مرحومہ کو گھن کی طرح کھانا شروع کر دیا اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ اسباب اختلافات پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں اور چوں کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کو تمام علوم اسلامیہ میں درک و مہارت حاصل ہے اور وہ اسرار شریعت کے بہت بڑے عالم اور نکتہ داں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتابوں میں ہر ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ان کا قلم ہر ہر مسئلہ پر جس خوبی اور صفائی کے ساتھ روشنی ڈال سکتا ہے وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں اس لئے ہم انھیں کے افکار و خیالات ان کی مشہور اور معرکۃ الآرا کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" سے درج کر رہے ہیں ؎

داستانِ عہدِ گل را از نظیری باز پرس　　عندلیب آشفتہ تر گوید ازیں افسانہ را

اور یہ فقہی اختلافات چوں کہ صحابہ اور تابعین ہی کے زمانہ سے چلے آرہے ہیں اس لئے اس مضمون میں انھیں کے اسباب اختلاف کا تذکرہ کیا جارہا ہے اس کے بعد شاہ صاحب رح

نے فقہاء کے اختلافات بھی بیان فرمائے ہیں۔ سردست ہم اسی فصل کے ترجمہ پر اکتفا کر رہے ہیں کیوں کہ اس سے اختلاف کے اصلی وجوہ کا بخوبی سراغ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ تو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں فقہ آج کی طرح مدون نہ تھی اور نہ فروعی احکام و مسائل میں فقہاء کے طریقۂ بحث و نظر کی طرح وہاں بحثیں ہوتی تھیں اس لئے کہ فقہاء ارکان، شروط اور آداب وغیرہ کو دلائل کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور مختلف صورتیں فرض کر کے ان مفروضہ صورتوں پر مسائل کا استخراج و استنباط کرتے ہیں، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب آپ وضو کرتے تو صحابہ بھی بغیر رکن و ادب کو معلوم کئے ہوئے اسی طریقہ کو اختیار کر لیتے، آپ کو جس طرح نماز پڑھتے اور حج کرتے ہوئے دیکھتے اسی طرح خود بھی پڑھنے اور کرنے لگتے۔ اکثر یہی حال دوسرے معاملات میں بھی ہوتا تھا چنانچہ آپ نے وضو میں چار یا چھ فرائض ہونے کی کوئی تعیین نہیں فرمائی ہے اور نہ بغیر موالاۃ کے وضو کرنے کے متعلق وضو کی صحت یا فساد کا فیصلہ صادر فرمایا ہے الا ما شاء اللہ۔

اور خود صحابہ کرام بہت کم رسول اکرمؐ سے سوالات کیا کرتے تھے، عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا:۔

ما رأیت قوماً خیرا من اصحاب رسول اللہ، سألوہ عن ثلاث عشرۃ مسألۃ حتی قبض کلھن فی القرآن منھن (یسألونک عن الشھر الحرام قتال فیہ الخ) (ویسألونک عن المحیض) قال ماکانوا یسألون الاعما ینفعھم	میں نے رسول اللہ کے ساتھیوں سے زیادہ بہتر لوگ نہ دیکھے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف تیرہ ۱۳ سوالات کئے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا جن میں سے سب کا ذکر قرآن میں موجود ہے مثلاً (یسألونک عن الشھر الحرام) اور (یسألونک عن المحیض) ابن عباس فرماتے ہیں کہ صحابہ آنحضرت سے

صرف ضروری اور مفید باتوں کے متعلق سوال کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا ارشاد ہے:-

"تم لوگ ایسی باتوں کے متعلق سوالات نہ کرو جو ابھی پیش نہ آئی ہوں، کیوں کہ میرے باپ (حضرت عمرؓ) اس طرح کے لوگوں کو لعنت ملامت کیا کرتے تھے جو ان باتوں کو پوچھتے تھے جو ابھی تک نہ ہوئی ہوں"

قاسم فرماتے ہیں:-

"تم لوگ ایسی باتیں پوچھا کرتے ہو جن کے متعلق ہم لوگ نہیں پوچھا کرتے تھے اور تم لوگ ان باتوں کی کرید کرتے ہو جن کی ہم کرید نہیں کرتے تھے، تم لوگ ایسی چیزیں پوچھتے ہو جن کا مجھے کوئی علم نہیں اور اگر علم ہوتا تو میرے لئے ان کا کتمان جائز نہ ہوتا"

عمر بن اسحاق کا بیان ہے:-

"جن صحابہ کو میں نے دیکھا وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں جنہیں میں نے نہیں دیکھا (یعنی جو مجھ سے پہلے مر گئے) تو میں نے صحابہ سے زیادہ آسان سیرت اور کم شدت پسند کسی کو نہیں دیکھا"

اور حبیب بن اسحاق سے ایک ایسی عورت کے بارہ میں سوال کیا گیا جس کی موت ایسی جماعت کے اندر ہوئی جہاں اس کا کوئی ولی نہ تھا تو فرمایا کہ:-

"میری آنکھوں نے ان لوگوں (صحابہ) کو دیکھا ہے جو تمہاری طرح شدت پسند نہ تھے اور نہ تمہاری طرح سوالات کرتے تھے"[1]

غرض دورِ نبوی کا حال فقہاء کے زمانہ سے بالکل مختلف تھا، آپ کے زمانہ میں مسائل سے واقفیت کی کم و بیش یہ صورتیں تھیں:-

(۱) پیش آنے والے واقعات میں لوگ آنحضرتؐ سے فتویٰ طلب کرتے اور

---

[1] ان آثار کی تخریج دارمی نے کی ہے۔

آپ ان کو جواب دیتے۔

(۲) کوئی نزاعی معاملہ آنحضرتؐ کی بارگاہ میں بشکل مقدمہ دائر کیا جاتا اور آپ اس کا فیصلہ فرمادیتے۔

(۳) آپ صحابہ کو کوئی بہتر کام کرتے دیکھتے تو اس کی مدح وستائش کرتے اور اگر کوئی ناگوارِ خاطر کام کرتے ہوئے پاتے تو اس پر اظہارِ ناپسندیدگی فرماتے۔ اور اکثر یہ ساری باتیں عام لوگوں کے اجتماعات میں ہوا کرتی تھیں اس لئے سب کو واقفیت ہوجاتی۔

ٹھیک یہی حال شیخین (حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) کا بھی تھا کہ انھیں جب کسی مسئلہ میں واقفیت نہ ہوتی تو لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث معلوم کرنے کی سعی کرتے چنانچہ جب حضرت ابوبکرؓ سے جدّہ کے حصہ کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی اور ظہر کی نماز کے بعد صحابہ کو جمع کرکے رسول اکرمؐ کا فرمان معلوم کرنا چاہا۔ تو مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بتلایا کہ رسول اللہؐ نے جدّہ کو سُدس (چھٹا حصہ) دیا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے مزید اطمینان کے لئے لوگوں سے تصدیق کرانی چاہی تو محمد بن سلمہ نے تصدیق فرمائی۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے غرق کے متعلق حضرت مغیرۃ کی خبر کی طرف اور وباء کے بارہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی خبر کی طرف رجوع کیا اور جب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ان کے دروازہ پر آکر اجازت طلب کی اور جواب نہ پاکر چل دئے تو پھر حضرت عمرؓ نے جب ان سے اس کا سبب معلوم کیا تو انھوں نے رسول اللہؐ کی حدیث سنائی لیکن حضرت عمرؓ نے مزید تحقیق کے لئے ایک شہادت طلب کی اور حضرت ابوسعیدؓ نے گواہی دی۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک مسئلہ میں اجتہاد کیا اور حضرت معقل بن یسارؓ نے انھیں بتایا کہ یہی فیصلہ رسول کریمؐ کا بھی ہے تو وہ بہت مسرور ہوئے اور تلاش کیا جائے تو اس طرح کے بہت سے واقعات! درمثالیں صحیحین، اور دوسری کتب

حدیث میں ملتے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ نبیؐ اور صحابہ کا یہی معمول تھا۔

اب دیکھو کہ ہر صحابی کے لئے جہاں تک ممکن ہوتا وہ آں حضرت صلعم کے معمولات عبادت، فتاوے اور فیصلے دیکھتا، سنتا اور محفوظ کر لیتا اور ہر چیز کی قرائن سے کوئی نہ کوئی توجیہہ کرتا مثلاً کسی کو اباحت پر محمول کیا اور کسی کو اپنی عقل کے مطابق قوی دلائل و قرائن سے نسخ پر محمول کیا اس طرح رسول کریمؐ کا مبارک اور مسعود زمانہ ختم ہو گیا اور صحابہ کا یہی طریقہ رہا لیکن جب وہ اِدھر اُدھر شہروں میں پھیلے اور مختلف مقامات میں پھیل گئے اور ہر شخص اپنے خطہ کا امام اور مقتدیٰ تسلیم کیا جانے لگا نیز کثرت سے واقعات و حوادث رونما ہونے لگے، مسائل کا دور دورہ ہوا اور صحابہ کے پاس کثرت سے استفتاء آنے لگے تو انھوں نے اپنے حافظہ کے بھروسہ پر یا استنباط کے ذریعہ لوگوں کو جوابات دئے لیکن جب کسی مسئلہ میں آنحضرتؐ کی رائے معلوم نہ ہوتی اور کوئی موزوں استنباط بھی نہیں کر پاتے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرتے لیکن ان علل و اغراض کو معلوم کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھ چھوڑتے جس طرح کی علت کو سامنے رکھ کر نبیؐ اسی طرح کے کسی دوسرے مسئلہ میں کوئی حکم صادر فرماتے تھے۔ اس طرح صحابہ کے اندر اختلاف پیدا ہوا جس کی بعض صورتیں یہ ہیں:-

(۱) پہلی شکل یہ ہے کہ کسی صحابی نے رسول اللہ کے کسی فیصلہ یا فتوی کو سنا جسے دوسرے صحابہ نے نہیں سنا تھا تو اس نے اپنی رائے سے اجتہاد کیا، لیکن اس اجتہاد کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(الف) اجتہاد کرنے والے صحابی کا اجتہاد بالکل فرمان نبویؐ کے مطابق ہو جائے جیسا کہ نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ ابن مسعودؓ سے ایک ایسی عورت کے متعلق سوال کیا گیا جس کا شوہر مہر کی تعیین سے پہلے ہی مر چکا تھا، مگر انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دینا چاہا کہ مجھے اس سلسلہ میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم نہیں معلوم ہے، لیکن لوگ مہینوں آپس میں جھگڑتے رہے اور ان سے اصرار کرتے رہے تو بتایا کہ اسے مہر مثل دی جائے گی

اور وہ عدت گذارے اور وراثت میں بھی اس کا حصہ ہوگا۔ بعد میں حضرت معقل بن یسار نے بتایا کہ خود رسولِ اکرمؐ نے اسی طرح کے مسئلہ میں ان کے قبیلہ کی ایک عورت کے ساتھ یہی فیصلہ کیا تھا یہ معلوم کرکے عبد اللہ بن مسعودؓ کو بے انتہا خوشی ہوئی۔

(ب) دو صحابیوں میں مناظرہ ہو اور حدیث بھی اس فریق کے ساتھ ہو جس کی بات غلبۂ ظن کے موافق ہو تو دوسرا صحابی اپنے اجتہاد کو ترک کرکے سماعی فیصلہ کو اختیار کرے مثلاً ائمۂ حدیث نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرۃ کا مسلک یہ تھا کہ جو صبح کو جنبی ہو کر اٹھے اس کا روزہ معتبر نہ ہوگا، لیکن ازواجِ مطہرات میں سے کسی نے بتایا کہ حدیث ان کے متضاد مسلک کے خلاف ہے تو انھوں نے اپنے مسلک سے رجوع کرلیا۔

(ج) دو صحابیوں میں مناظرہ ہو اور حدیث غلبۂ ظن کے خلاف ہو تو دوسرا صحابی اپنے اجتہاد کو ترک کرنے کے بجائے حدیث ہی میں اظہارِ قدح کرنے لگے جیسا کہ اصحابِ اصول نے روایت کیا ہے کہ فاطمہ بنتِ قیس نے حضرت عمرؓ کو بتلایا کہ انھیں تین طلاقیں دی گئیں مگر رسول اللہ نے ان کے لئے کوئی نفقہ اور سکنی نہیں مقرر فرمایا تو حضرت عمرؓ نے ان کی شہادت کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ

لا نترک کتاب اللہ بقول امرأۃ	میں ایک عورت کی بات کی وجہ سے خدا کی کتاب
لا ندری أصدقت ام کذبت	کو نہیں چھوڑ سکتا مجھے کیا معلوم کہ اس نے سچ کہا یا
لہا النفقۃ والسکنی	جھوٹ مطلقہ ثلاثہ کو نفقہ اور سکنی ملے گا۔

اور حضرت عائشہؓ نے فاطمہ بنتِ قیس سے کہا: الا تتقی اللہ (کیا تمہیں اللہ کا ڈر نہیں ہوتا)
اسی طرح کی ایک دوسری مثال کی تخریج شیخین نے کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک پانی نہ ملنے کی صورت میں بھی جنبی کے لئے تیمم جائز نہیں ہے اور حضرت عمار نے انھیں اپنے ایک واقعہ سے آگاہ کیا اور بتایا کہ وہ رسول اللہ صلعم کے ساتھ ایک سفر میں تھے اور انھیں جنابت لاحق ہوگئی اور پانی نہ ملا تو وہ خاک میں لت پت ہو گئے اور پھر آنحضورؐ کو اپنے واقعہ کی خبر دی

تو آپ نے فرمایا کہ :-

انما کان یکفیک ان تفعل ھکذا	تمھارے لئے تو صرف اتنا کافی تھا کہ اس طرح کر لیتے
وضرب بیدیہ الارض ثم مسح	اور آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر مارا اور
بھما وجھہ ویدیہ	ان کو چہرہ اور ہاتھوں پر پھیر دیا۔

لیکن حضرت عمرؓ نے اس حدیث کو قبول نہیں کیا اور ایک مخفی قدح کی وجہ سے ان کے نزدیک اس حدیث سے کوئی حجت نہیں قائم ہو سکتی لیکن یہی حدیث بعد میں متعدد طرق سے مروی ہونے کی وجہ سے مشہور اور مستفیض کے درجہ میں ہو گئی اور لوگوں نے حضرت عمرؓ کے قدح کی پرواہ کئے بغیر حدیث کو اختیار کر لیا۔

(۳) سرے سے کسی صحابی کو حدیث ہی نہ معلوم ہو چنانچہ امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ عورتوں کو حکم دیتے تھے کہ وہ غسل کے وقت اپنی چوٹیاں کھول لیں لیکن حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ابن عمرؓ کتنی مضحکہ خیز بات فرما رہے ہیں کیوں نہیں وہ عورتوں کو سر ہی منڈانے کا حکم دیتے میں تو رسول اللہؐ کے ساتھ ایک ہی برتن سے غسل کرتی تھی مگر تین مرتبہ سے زائد سر پر پانی نہ ڈالتی۔

اس کی ایک دوسری مثال یہ بھی ہے کہ جمہور کے نزدیک طواف میں رمل مسنون ہے اور عبد اللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے اسے بر سبیل اتفاق ایک عارضی ضرورت کی بنار پر کیا تھا اور وہ عارضی ضرورت یہ تھی کہ مشرکین نے مسلمانوں کو طواف کرتے ہوئے دیکھ کر طنزاً کہا تھا کہ یثرب کی آب و ہوا نے مسلمانوں کو نحیف و زار بنا دیا اور اب جب کہ یہ عارضی ضرورت ختم ہو گئی تو رمل مسنون نہیں رہا۔

(۴) وہم کی وجہ سے بھی اختلاف ہو سکتا ہے مثلاً آنحضرتؐ نے جب حج کیا تو بعض لوگوں نے سمجھا کہ آپ نے تمتع کیا اور بعض نے سمجھا کہ قران یا افراد کیا ہے اس کی دوسری مثال ابو داؤد کی وہ روایت ہے کہ حضرت سعید بن جبیر نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا

کہ مجھے صحابہ کے موقعۂ احرام کی تعیین میں اختلافات پر سخت حیرت ہوتی ہے، ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ مجھے اس معاملہ میں خوب آگاہی ہے بلاشبہ آپ نے ایک ہی حج کیا تھا اور یہیں سے لوگوں کا اختلاف بھی ہے کہ جب رسول اللہؐ حج کرنے چلے تو مسجد ذی الحلیفہ میں نماز پڑھی اور اسی مجلس میں احرام باندھا اور جب دونوں رکعتوں سے فارغ ہوئے تو تلبیہ کہنا شروع کیا، یہ واقعہ جن لوگوں کو معلوم ہوا انھوں نے محفوظ کر لیا پھر آپ اونٹنی پر سوار ہو کر چلے اور تلبیہ کہا تو بعض لوگوں نے اس واقعہ کو اخذ کر لیا اور یہ اس لئے کہ لوگ آگے پیچھے ایک دوسرے کے بعد آتے تھے اس لئے انھوں نے موقعہ احرام اسی کو سمجھا پھر جب آپ شرف بیداء پر چڑھے اور وہاں تلبیہ کہا تو کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ آپ نے احرام اور تلبیہ یہیں سے شروع کیا ہے حالانکہ بخدا آپ نے احرام مسجد ذی الحلیفہ ہی میں باندھا تھا اور تلبیہ سوار ہوتے وقت اور بیداء پر چڑھتے ہوئے بھی کہا تھا۔

(۳) سہو اور نسیان کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو جائے اس کی مثال یہ ہے کہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عمرہ ماہ رجب میں بھی کیا تھا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ ابن عمرؓ کو سہو ہو گیا ہے۔

(۴) ضبط و حفظ کی وجہ سے اختلاف ہو جائے جیسا کہ ابن عمرؓ یا خود حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ:۔

ان المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ — یقیناً میت کو گھر والوں کے رونے سے عذاب دیا جاتا ہے۔

حضرت عائشہؓ کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے کہا کہ ابن عمرؓ حدیث کو بعینہٖ اخذ نہ کر سکے حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی عورت کی قبر کے پاس سے گذرے جس کے اہل و عیال اس پر گریہ وزاری کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا:۔

انھم لیبکون علیھا وانھا لتعذب — یہ لوگ اس پر رو رہے ہیں حالانکہ اسے قبر میں

فی قبرھا عذاب دیا جارہا ہے۔

یہاں ابن عمرؓ کو دو باتوں میں دھوکہ ہوگیا اول یہ کہ وہ عذاب کی علت بکاء کو سمجھ رہے ہیں اور دوسرے وہ اس حکم کو ہر میت کے لئے عام قرار دے رہے ہیں۔

(۵) حکم کی علت میں اختلاف واقع ہو مثلاً قیام جنازہ کی علت کچھ لوگ تعظیم ملائکہ کو سمجھتے ہیں اس لئے مومن و کافر ہر ایک کے جنازہ پر قیام کو ضروری مانتے ہیں اور کچھ لوگوں کے نزدیک اس کی علّت موت کی ہولناکی ہے اس لئے وہ بھی مومن و مسلم سب کے جنازہ کے لئے عام قرار دیتے ہیں اور حسن بن علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضورؐ ایک یہودی کے جنازہ سے گذرے تو اس کراہیت کی وجہ سے کھڑے ہوگئے کہ حاشا وہ آپ کے سر سے گذر جائے اس لئے ان کے نزدیک یہ قیام صرف کافر ہی کے جنازہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

(۶) دو مختلف باتوں کے درمیان جمع و تطبیق کی وجہ سے اختلاف واقع ہو مثلاً آں حضور کریم صلعم نے خیبر کے سال متعہ کی رخصت دی پھر عام اوطاس میں اجازت دی اور پھر اس سے روک دیا لیکن ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپ نے رخصت ضرورت کی بناء پر دی تھی اور ممانعت ضرورت کے ختم ہونے کی وجہ سے کی تھی اس لئے حکم رخصت ضرورتاً برقرار رہے گا مگر جمہور کے نزدیک رخصت اباحت کے لئے تھی۔ اور نہی اس اباحت کو منسوخ قرار دے رہی ہے۔

یہ صحابہ کے اختلافات کی مختصر سی تفصیل تھی اور یہیں سے تابعین کے اختلافات کا بھی پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے بھی امکان بھر صحابہ سے مسائل سیکھے آں حضرت صلعم کی حدیثوں کو سُنا اور مختلف باتوں کے درمیان جمع و تطبیق دی اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی، بعض کبار صحابہ کے مسلک کو مشہور حدیثوں کی وجہ سے مرجوح قرار دیا جیسا کہ جنبی کے تیمم کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ کا مسلک اس لئے ان کے نزدیک مرجوح ہے کہ حضرت عمار بن یاسر اور عمران بن حصین کی مشہور حدیثوں کے خلاف ہے۔

اس طرح گویا علمار تابعین میں سے ہر ایک نے اپنی جگہ پر ایک مستقل حیثیت اختیار کرلی، اور ہر ہر مقام پر کچھ لوگ امام اور مقتدی مانے جاتے تھے مثلاً مدینہ میں سعید بن مسیب اور سالم بن عبداللہ اور ان کے بعد زہری، یحییٰ بن سعید اور ربیعہ بن عبدالرحمٰن، مکہ میں عطاؒ بن ابی رباح، کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شعبی، بصرہ میں حسن بصری، یمن میں طاؤس بن کیسان اور شام میں مکحول امام اور مقتدی تسلیم کئے جاتے تھے، اور لوگوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے ان کے علوم کی پیاس اور تڑپ پیدا کردی اور انھوں نے ان ائمہ سے حدیثیں، صحابہ کے اقوال اور فتاوے اور خود ان کی ذاتی تحقیقات جمع کر کے محفوظ کرلیا اور جب مسائل پیش آتے تو خود ان بزرگوں کی خدمت میں استفتار پیش کر کے جواب طلب کرتے۔

سعید بن مسیب اور ابراہیم نخعی نے فقہ اسلامی کے تمام ابواب کی جمع و تدوین کی اور ہر ہر باب میں سلف سے اصول مستنبط کئے۔

یہاں پہنچ کر یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ فقہ کے کئی اسکول اس وقت قائم ہو گئے تھے سعید اور ان کے اصحاب کا خیال تھا کہ فقہار مکہ اور مدینہ کا مسلک زیادہ قوی اور مستند ہے اور ان لوگوں کے فقہی مسالک کا دار و مدار زیادہ تر عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کے فتووں اور مدینہ کے قاضیوں کے فیصلوں پر تھا، ان لوگوں سے جہاں تک ممکن ہوا ان بزرگوں کی باتوں کو جمع کیا اور پوری تحقیق و تفتیش کے ساتھ ہر مسئلہ کو پرکھا اور جس پر علمار مدینہ کا اتفاق نظر آیا اسے پوری مضبوطی کے ساتھ اختیار کرلیا اور جس میں ان کا اختلاف ہوتا تھا اس میں سب سے قوی اور راجح مسلک کو اختیار کرلیتے اور کسی مسلک کے قوی ہونے کی وجہیں ان کے نزدیک یہ تھیں کہ:-

(الف) کثرت سے علمار کی یہی رائے ہو۔

(ب) یا وہ مسلک قوی قیاس کے مطابق ہو۔

(س) کتاب و سنت کی صریح تخریجات سے اس کی تائید اور توثیق ہوتی ہو۔

اور جب کوئی ایسا معاملہ پیش آجاتا جن میں انھیں اپنے اسلاف کا مسلک معلوم نہ ہوتا

تو وہ اس صورت میں خود اُنکے کام کی روشنی میں استنباط اور تخریج کرتے، ابراہیم نخعی اور ان کے اصحاب کا خیال تھا کہ عبداللہ ابن مسعود کا فقہ میں کوئی مدِمقابل نہیں جیسا کہ علقمہ نے مسروق سے کہا تھا :-

هل احدٌ منهم اثبت من عبد الله ؟ کیا ابن مسعود سے بھی کوئی اثبت ہو سکتا ہے ؟

اور امام ابو حنیفہ نے امام اوزاعی کو جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ابراہیم سالم سے افقہ ہیں اور اگر صحابہ کی فضیلت مسلم نہ ہوتی تو میں کہتا کہ علقمہ عبداللہ بن عمرؓ سے افقہ ہیں اور عبداللہ بن مسعود کا تو کہنا ہی کیا۔

اہل کوفہ کے مسلک کا دارومدار اکثر ابن مسعود کے فتوے، حضرت علی کے فتوے اور فیصلے اور قاضی شریح وغیرہ کے قضایا ہیں اور کوفہ والوں نے بھی اپنے ائمہ کے مسالک کو پوری کوشش اور تندہی کے ساتھ محفوظ اور جمع کیا اور جمع و تطبیق، ترجیح اور تفریع مسائل کے سلسلہ میں ان کا طرز عمل بھی مدینہ والوں کی طرح ہے، اس طرح ان کے یہاں بھی مسائل کی بہتات اور فراوانی ہوئی۔ اور سعید بن مسیب کی طرح ابراہیم نخعی فقہاء کوفہ کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔

العلم والعلماء

ادبیات

مومنہ

از

(جناب خاور رحیبل پوری)

"زیرِ نظر نظم مثنوی مولانا رومؒ کی ایک حکایت مومنہ کا ترجمہ ہے جس کو مسلم خواتین میں مذہبی روح بیدار کرنے کے لئے فارسی سے اُردو میں منتقل کیا گیا ہے۔" (بُرہان)

یہودی قوم، جب رسمِ وفا کو بھول بیٹھی تھی
خودی کے زعمِ باطل میں خدا کو بھول بیٹھی تھی

جہالت کا اندھیرا چھا رہا تھا اُس کی ہستی پر
اُتارا تھا بلندی سے خودی نے اُس کو پستی پر

پڑا تھا گردنوں میں رشتۂ ابلیس کا پھندہ
یہ جرأت ہوگئی پیدا کہ بن بیٹھا خدا، بندہ

دماغوں میں بزعمِ خویش بو تھی خود نمائی کی
بجائے بندگی کرنے کے بندوں نے خدائی کی

بقولِ[1] شاہنامہ ہر بشر مردود بن بیٹھا
کوئی فرعون بن بیٹھا کوئی نمرود بن بیٹھا

فلسطیں میں جو بیٹھا اک یہودی تختِ شاہی پر
ہوئی ظلمت مسلط اور قسمت کی سیاہی پر

دھواں چھایا کچھ ایسا ہر طرف قسمت کے ناری کا
کیا مردود نے اعلان اپنی نابکاری کا

کہا کمتر ہیں سب انسان ان سب سے بڑا میں ہوں
اگر ہوں تو حقیقت میں خدائی کا خدا میں ہوں

سرِ رہ اُس نے پھر بنوا کے پُتلہ اپنی صورت کا
رکھا اور کہہ دیا ہے فرض سجدہ میری مورت کا

کیا پھر قرب بت آتش کدہ قایم ستمگر نے
دلوں کو جنبشِ پیہم میں ڈالا جس کے منظر نے

کوئی رہ گیر جب اُس راہ سے ہو کر گذرتا تھا
ادب سے پہلے جھکتا اور بُت کو سجدہ کرتا تھا

غضب تھا سجدہ کرنے سے ذرا انکار کر جانا
کہ تھی پاداش اُس کی نذرِ آتش ہو کے مرجانا

خس و خاشاک کی صورت جب انساں اُس میں جلتے تھے
ملایک دیکھ کر اُن کو کفِ افسوس ملتے تھے

حقیقت میں وہ شاہِ مملکت تھا نفس کا بندہ
جکڑ رکھا تھا شیطانِ لعیں نے ڈال کر پھندہ

وہ اپنے نفس کے بُت کو سزا دینے میں کاہل تھا
ہزاروں بُت بنانے پر بہت نفس اُس کا مائل تھا

جو دیکھا جائے چشمِ غور سے تو دل ہو سی پارہ
کہ ہے مادر بتوں کی فی الحقیقت نفسِ آمارہ

اِسی ٹکسال میں سکّے بدی کے ڈھلتے رہتے ہیں
اسی آغوش میں دُنیا کے سب بُت پلتے رہتے ہیں

کیا ہے پیش اس ادراک کی تصریح میں اپنی
جنابِ ذوق کا یہ شعر ہے تبیح میں اپنی

بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

---

[1] شاہنامۂ اسلام اُردو

کہیں سے ان دنوں اک مومنہ آئی تھی بیچاری
ستائی چرخ کی تھی گردش تقدیر کی ماری

لئے آئی تھی اک معصوم بچہ گود میں اپنی
امیدوں کی تمناؤں کی دنیا گود میں اپنی

پکڑ کر لے گیا خود شاہ اس کو آگے اس بت کے
کہا کر اس کو ایمان و عقیدت کے مگر سجدے

کہ یہ بت میری صورت میری مورت میرا نقشہ ہے
میں وہ ذی جاہ ہوں رتبہ جسے حاصل خدا کا ہے

کہا اس نے کہ میں رحمٰن پر ایمان رکھتی ہوں
اسی کو سر جھکاتی ہوں اسی کا دھیان رکھتی ہوں

یہی کہتے ہوئے آئے ہیں میری قوم کے عالم
خدا کے ماسوا سجدہ کسی کو بھی نہیں لازم

یہ سن کر آتش قہر و غضب سے شاہ جل اٹھا
فسوں سازوں کے چشمہ کی طرح فوراً ابل اٹھا

کہا ناداں خدا تو کس کو کہتی ہے خدا میں ہوں
سبھی محتاج ہیں میرے بس اک حاجت روا میں ہوں

سبھی کو رزق دیتا ہوں سبھی کو پالتا ہوں میں
مصیبت ڈال دیتا ہوں مصیبت ٹالتا ہوں میں

حیات و مرگ انساں ہے فقط میرے اشارے پر
ڈبا بھی دوں جسے چاہوں لگا بھی دوں کنارے پر

فقیری سے امیری مل رہی ہے لے اگر چاہے
ابھی میں بخش دوں تو جس قدر بھی مال و زر چاہے

حرم خاص میں ساتھ اپنے لے کے تجھ کو جاؤں گا
حرم میں اپنے رکھ کے مرتبہ تیرا بڑھاؤں گا

اگر کرنے سے سجدہ تو میری مورت کے منکر ہے
سمجھ لے پھر کہ یہ آتش کدہ روشن ترا گھر ہے

اگر تو سجدہ کرنے سے ذرا بھی ہچکچائے گی
تو بے شبہ دہکتے آتش کدے میں ڈالی جائے گی

مٹا کر تجھ کو ہستی سے یہ جھگڑا پاک کر دوں گا
جلا کر جسم نازک کو اسی دم خاک کر دوں گا

یہ سن کر قوت ایماں اس کی جوش میں آئی
نکل کر خوف کی دنیا سے ملک ہوش میں آئی

ہٹے خاطر سے اس آتش کدہ کی آگ کے شعلے
لگی لو شمع ایماں کی بجھے یہ آگ کے شعلے

سراپا غیرت اسلام سے وہ تھرتھرا اٹھی
بدن کے رونگٹوں سے اک انا الحق کی صدا اٹھی

بپھر کر شیرنی جس شکل سے جنگل کی آتی ہے
کہ ناگن زخم خوردہ جس ادا سے پھنپھناتی ہے

گرج کر شیر کی مانند یوں اس شاہ سے بولی
لب معجز نما کے ساتھ چشم خوں چکاں کھولی

بس ان بے ہودہ لفظوں کی ذرا کر روک تھام اپنے
ارے کم بخت کیا بکتا ہے دے منہ میں لگام اپنے

خدا وہ ہے کہ جس نے کن سے پیدا کر دیئے عالم
فقط ادنیٰ اشارے سے ہویدا کر دیئے عالم

خدا وہ ہے کہ جس نے ماہ و خور و نجم بنائے ہیں
خدا وہ ہے کہ جس نے باغ میں غنچے کھلائے ہیں

عطا سرسبزیاں کیں گلشن ہستی کے جھاڑوں کو
زمیں پر کر دیے قائم ستوں اونچے پہاڑوں کو

اسی نے حسن صنعت کے ہمیشہ گل کھلائے ہیں
اسی نے جا بجا نالے، ندی، دریا بہائے ہیں

اسی کو کائنات ہر دو عالم پر بڑائی ہے
گلستان خدائی میں خدا ہی کی خدائی ہے

ہوائیں جس قدر بھی ہیں زمینوں آسمانوں میں
خدا کی حمد کے نغمے سناتی ہیں ترانوں میں

خدا والے خدا ہی کے ہمیشہ گیت گاتے ہیں
اسی کے نام کو رٹتے اسی کو گنگناتے ہیں

اسی کو سجدہ کرتے ہیں اسی کو سر جھکاتے ہیں
وہی ہے ذات واحد جو پرستاری کے قابل ہے
اگر قرآں میں دیکھے کوئی اخلاص کی سورت
خدا کے ماننے والے کبھی ان سے نہیں ڈرتے
تجھے جاہل سمجھتی ہوں انھیں باطل سمجھتی ہوں
اگر سارے جہاں کا مال و دولت مجھ کو مل جائے
تو پانی میں ڈبو دے یا مجھے اس آگ میں ڈالے
یہ آتش کیا تری کہ دار سے ڈرتی نہیں ہوں میں
سمجھتی ہوں مبارک روح کا تن سے جدا ہونا
جو اتنا بھی نہیں سمجھے وہ جاہل ہے وہ ناداں ہے
محبان وفاکیش موت کو مشکل سمجھتے ہیں
ذرا سی زندگی میں زندہ رہنے کی خوشی کیا ہے
غلام آقا سے پھر جائے کہیں ایسا کبھی ہوتا ہے

تمنا میں اسی کی زندگی کے دن گنواتے ہیں
خدا کے ماسوا جو کچھ ہے دنیا میں وہ باطل ہے
نظر آئیں یہ بت، پارۂ سنگین کی مورت
یہ بت پتھر کے یا ڈھالے ہوئے لوہے کے ہیں ٹکڑے
میں ان سارے بتوں کو جنس لاحاصل سمجھتی ہوں
نہیں ممکن قدم کچھ جادۂ ایماں سے ہل جائے
خدا کی راہ میں حاضر ہوں چاہے سر اتروا لے
سناں سے تیر سے تلوار سے ڈرتی نہیں ہوں میں
حقیقی زندگی کی راہ ہے گویا فنا ہونا
"وفاداری بشرط استواری جزو ایماں ہے"
خیال مرگ کو روح روان دل سمجھتے ہیں
خدا کی راہ میں مرنے سے بہتر زندگی کیا ہے
جو محرم اپنا ہو اس سے کہیں پردا بھی ہوتا ہے

برائی سن کے اپنی اور اپنے ہم نواؤں کی
یہ عورت سخت دل، اس طرح سے کب باز آئے گی
کروں ترکیب اک ایسی کہ یہ ضد چھوڑ دے اپنی
ہر اک ماں اپنے بچے پر ہمیشہ جان کھوتی ہے
کہا بس چھین لو بچے کو اس کی گود سے پہلے
ہوئی تعمیل فوراً ہی تو اس ظالم کے فرماں کی
بچاؤ کی کوئی تدبیر جب اس نے نہیں دیکھی
سوا تھی جان سے اس کو محبت اپنے بچے کی
نہ سمجھی ظالم و بیداد گر ایسے بھی ہوتے ہیں
ہوئی بے تاب چین آیا نہ پھر اس کو کسی پہلو
ادھر جلاد نے بچے کو لے کر آگ میں ڈالا
لپٹ اٹھیں آگ کی معصوم صورت جب نظر آئی
نظر کے سامنے جلتا ہوا بچے کو جب دیکھا
ہوا ہی چاہتی تھی پائے استقلال کو جنبش
کہا اے ماں حواس اپنے سنبھالو ہوش میں آؤ

ستمگر نے یہ سوچا انتہا کر دوں جفاؤں کی
پڑے گا دل پہ جب صدمہ تو فوراً مان جائے گی
وہ ڈوری جو بندھی ہے حق سے باہم توڑ دے اپنی
عزیز ہر شے سے بچوں کی محبت ماں کو ہوتی ہے
پھر اس کو آگ میں ڈالو کہ اس عورت کا دل دہلے
زباں اظہار سے قاصر ہے جو حالت ہوئی ماں کی
تو بچے کی محبت میں وہ ماہی کی طرح تڑپی
منقش دل پہ تھی معصوم صورت اپنے بچے کی
بجز شر کچھ نہیں کرتے بشر ایسے بھی ہوتے ہیں
کلیجہ پھٹ گیا، آنکھوں سے نکلے خون کے آنسو
ادھر اس کے کلیجے پر قیامت کا لگا بھالا
تو پھر دہشت سے اس کا جسم کانپا روح تھرائی
ہوا دل پارہ پارہ اور جگر ٹکڑے ہوا اس کا
کہ دی معصوم بچے نے زبانِ حال کو جنبش
کہیں ایسا نہ ہو راہِ ادب سے تم بھٹک جاؤ

رائے غالب

یہ دھوکا ہے نظر کا ظاہری اسباب مت دیکھو
ذرا چشمِ حقیقت سے خدا کی مصلحت دیکھو
سوئے آتشکدہ جب مومنہ نے غور سے دیکھا
خدا کی پاک قدرت کا نظر آیا اسے نقشہ

جب اُس عورت نے ایوانِ وفا کا باٹ پایا
تو وہ سمجھی کہ بے داری میں ثمرہ خواب کا پایا
شگفتہ گل کی صورت میں ہر اک اخگر نظر آیا
خلیل اللہ کے گلزار کا منظر نظر آیا
وہی آتشکدہ ہے صحن گویا باغِ جنت کا
وہاں آرام سے بیٹھا ہوا ہے گود کا بچہ
خوش و خرم ہے، شاداں ہے، خوشی سے مسکراتا ہے
ملایک پاس ہیں حمد و ثنا کے گیت گاتا ہے
اشارہ کر رہا ہے زود تر آؤ یہاں تم بھی
میسر وصل ہو جائے جہاں میں ہوں وہاں تم بھی
اُٹھو جلدی سے رشتے توڑ دو دُنیائے فانی کے
یہاں آکر مزے لوٹو حیاتِ جاودانی کے
خوشی سے مسکرائی وہ نوید جانفزا سن کر
تنِ بے جاں میں آئی جان بچے کی صدا سن کر
محبت کی تڑپ جذباتِ عفت کوش سے اٹھی
ندا قربان ہونے کی دلِ پر جوش سے اٹھی
فرشتے بہرِ استقبال اترے آسمانوں سے
سُنا الہامِ باری مومنہ نے اپنے کانوں سے
ندا آئی کہ جس کا دل ہم اپنا گھر بناتے ہیں
کسی کو زہر ملتا ہے کسی کا سر کٹاتے ہیں
ہر اک فردِ بشر کو اہل کب اس کا سمجھتے ہیں
اُسی کو آزماتے ہیں جسے اپنا سمجھتے ہیں
ہمارے واسطے جو مست دیوانے مچلتے ہیں
ہم ان کے ساتھ یہ شطرنج کی سی چال چلتے ہیں
کبھی شاہِ زماں پیدل کے ہاتھوں مات کھاتا ہے
کبھی برد اور جو مہری کا نقشہ پیش آتا ہے
اگر دعوئ محبت کا ہمارے کوئی کرتا ہے
کسی کی کھال کھنچتی ہے کسی کا سر اترتا ہے
کوئی سولی پہ چڑھتا ہے کوئی آرے سے چرتا ہے
پھر ابندہ ہمارا راہ سے کوئی نہ پھرتا ہے
جسے ہم دوست رکھتے ہیں جسے ہم پیار کرتے ہیں
اسے میدانِ مقتل میں تہِ تلوار کرتے ہیں
متاعِ سرفروشی جذبۂ کامل سے ملتی ہے
یہ دولت ہے شہادت کی بڑی مشکل سے ملتی ہے

الم بدلا مسرت سے نویدِ خوش اثر پا کر
ہوئے مسرور جان و دل شہادت کی خبر پا کر
ذرا بھی جل کے مرنے سے جھجک اُس کو نہیں آئی
تڑپ کر برق کی مانند آتش کے قریں آئی
قدم لینے بڑھیں حوریں ملایک آئے پر تولے
لپک کر بہرِ استقبال آئے آگ کے شعلے
نظر سے آپ اپنی اس نے یہ توقیر جب دیکھی
خدا کا نام لے کر دھم سے جلتی آگ میں کودی
دہکتی آگ میں زندہ جو پایا اپنے بچے کو
بلائیں لیں کلیجے سے لگایا اپنے بچے کو
اُٹھا کر گود میں بچہ زبانِ فیض اثر کھولی
مخاطب کر کے پھر اس قوم کو اپنی طرف بولی
خدا کی شان دیکھی تم نے اصحابِ ستم رانی
دہکتی آگ کیسی میرے حق میں ہو گئی پانی
خدا کی شانِ رحمت دیکھنے والو ادھر آؤ
وہاں سے کم نصیبو دیکھتے کیا ہو ادھر آؤ
بہارِ خلد ہے میری نظر میں روح شاداں ہے
بجائے آگ یہ آتشکدہ گلزارِ رضواں ہے

ملے گی سستے داموں میں ابھی جنسِ گراں لے لو یہ فانی زندگی دے کر حیاتِ جاوداں لے لو
حقیقی موت ہی گویا حیاتِ جاودانی ہے فنا کا دور دورہ اس میں ہے دنیا یہ فانی ہے
سنے لوگوں نے جب نغمے حیاتِ جاودانی کے تو دستِ شوق سے ٹکڑے کیے دامانِ فانی کے
نوائے جانفزا سنتے ہی سارے آشنا دوڑے چلے جلنے کو آتش میں سوئے آتش کدہ دوڑے
ہتھیلی پر لئے سر شوق میں دیوانے آ پہنچے نثارِ شمع ہونے کے لئے پروانے آ پہنچے
یہودی شاہ نے آتش کی دیکھی جب یہ گلکاری تو بارِ کارِ ذلت سے زمیں میں گڑ گیا ناری
بڑھا تھا شوق حد سے بھی زیادہ جاں نثاروں کا خوشی میں نذرِ آتش ہو گیا جھرمٹ ہزاروں کا
بہت کچھ روکنے پر بھی قدم آگے بڑھاتے تھے نہایت شوق سے آتش کدے میں کودے جاتے تھے
ہزاروں منتیں کر کے بہت لوگوں نے سمجھایا دفورِ شوق کے آگے مگر کچھ بھی نہ کام آیا
جو تھے اللہ کے بندے جو تھے اللہ کے پیارے وہ ہو کر نذرِ آتش حاصلِ حق ہو گئے سارے
حقیقت میں ضرر کچھ بھی نہ اس آتش سے پہنچا تھا یہ جو کچھ ہو رہا تھا ظاہری نظروں کا دھوکا تھا
یہ انساں جلنے والے آگ میں ظاہر تو جلتے تھے حقیقت میں مگر وہ دامنِ رحمت میں پلتے تھے
خدا نے نار میں بھی نور کا جلوہ دکھایا تھا خلیلِ پاک کے گلزار کا نقشہ جمایا تھا
لعینوں نے جب اُن کے نورِ ایماں کی جھلک دیکھی تو اپنی سمت بھی آتش کے شعلوں کی لپک دیکھی
خطابِ آتش سے کر کے یوں وہ شیطانِ لعین بولا جلاتی کیوں نہیں تو ان کو یہ تجھ کو ہوا ہے کیا
کہاں جاتی رہی اب وہ تری فطرت جلانے کی ہوئی کیا سلب تیرے جسم سے قوت جلانے کی
بلا کی مہربانی کر رہی ہے دشمنوں پر تو لپکتی تھی خوشی کے ساتھ اپنے دوستوں پر تو
غضب ڈھاتی نہیں ہے آج کیوں ایمان والوں پر چڑھی ہے کفر کی چربی بہت کچھ تیرے گالوں پر
ترے پیرو ہیں ناری اور ترے در کے بھکاری ہیں ہماری لاج اب رکھ لے کہ ہم تیرے پجاری ہیں
ہماری مانتا ہے تو ہماری مانتا ہے تو ہماری روح کی تسکین دلوں کی مانتا ہے تو

یہودی بادشاہ کی ختم سب تقریر جب ہو لی بھڑک کر پھر بڑے غیظ و غضب سے آگ یوں بولی
ارے ناداں مجھے قاصر مجھے غافل سمجھتا ہے بجانے ماسوا اس کے تو اے جاہل سمجھتا ہے
رہے گی تا ابد میری وہی طاقت جو پہلے تھی تپش بھی ہے وہی میری وہی سوزش وہی گرمی
گھڑی بھر میں مٹا دوں گی ابھی وہم و گماں تیرا اگر شک ہے تو آ، اس وقت کر لے امتحاں میرا
مزا تیری خدائی کا تجھے کیسا چکھاتی ہوں اگر نزدیک تو آتا نہیں تو لے میں آتی ہوں
جہالت کا پڑا ہے فہم و دانش پر ترے پردا ارے کم بخت اتنا بھی کبھی تو نے نہیں سوچا
سگِ دنیا جو غیروں کے لئے خونخوار ہوتے ہیں وہ گھر کے مہمانوں کے تو چوکیدار ہوتے ہیں
خدا ہے میزباں مہماں کی کیا محرم نہیں ہوں میں کچھ ان کتوں سے تسلیم و رضا میں کم نہیں ہوں میں

نہیں چلتی کسی کی بھی خدا کے حکم کے آگے / جلائے وہ جسے چاہے بچائے وہ جسے چاہے
خدا کے حکم کی تعمیل کرنا فرض ہے میرا / کہ بے احکامِ ربی ایک پتا بھی نہیں ہلتا
جلاتی ہوں کسی کو میں نہ جلنے سے بچاتی ہوں / وہی تعمیل کر دیتی ہوں جس کا حکم پاتی ہوں
مرا جلنا مرا بجھنا ہے سب اُس کے اشارے پر / نظامِ کائناتِ دہر ہے جس کے سہارے پر
جلا دینے کی قوت کو نہ کیوں کر میں بجھا دیتی / خُدا کے حکم کے آگے انھیں کیسے جلا دیتی
تجھے "یَا نَارُ کُونِی" کا نہیں احساس کیا اب تک / جو پہلے تھا وہی جاری ہے فرمانِ خدا اب تک
مرے کانوں میں "ظالم" گونجتی ہے وہ ہوا اب تک / نہیں بھولی ہوں میں "بَرْدًا وَّسَلٰمًا" کی صدا اب تک
نہیں کچھ دیر لگتی فضل کرتے پاک یزداں کو / "اُٹھاتا ہے جو طوفاں روک بھی سکتا ہے طوفاں کو"[1]
عصائے موسوی اعجاز جب اپنا دکھاتا ہے / تو پانی قلزم کے بارہ در سے رستے پر لگاتا ہے

نہ دیکھا جب اثر ہوتا ہوا شعلہ بیانی کا / ارادہ کر لیا آتش نے بھی آتش فشانی کا
کھڑا تھا ہر طرف انبوہ شیطانِ لعیں گھیرے / اشاروں پر اشارے تھے کبھی میرے کبھی تیرے
کہا ہشیار ہو جاؤ اثر اپنا بتاتی ہوں / بجوابِ آتشِ قہر و غضب سے میں جلاتی ہوں
اگر وہ عقل و دانش سے ذرا بھی کام لے لیتے / تو ایسے وقتِ نازک میں خدا کا نام لے لیتے
دمِ آخر جو فرعونِ لعیں نے یادِ خالق کی / خدائے ذوالکرم نے جسم کو اُس کے اماں بخشی
مگر شیطان کا ابرِ تسلط اُن پہ چھایا تھا / خودی کو مٹنے ان کی خدا کا قہر آیا تھا
کہیں ٹل جائیں اتنی بھی نہ دی مہلت کمینوں کو / بھڑک کر آگ نے کوسوں جلا ڈالا لعینوں کو
جدھر جاتے تھے وہ اور جس طرف کو رُخ بدلتے تھے / خودی کی آگ روشن تھی تو اپنے آپ جلتے تھے
نہیں چلتی ہے گمراہوں کی خضرِ راہ کے آگے / سدا، لازم ہے بندے کو جھکے اللہ کے آگے

فنا کے رنگ میں خاور نما انجام باقی ہے
خدا کا نام باقی ہے خدا کا نام باقی ہے

---

[1] مولانا سیماب

تبصرے

تاریخ دعوت و عزیمت حصۂ اول | از مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی تقطیع کلاں ضخامت ۳۷۱ صفحات کتابت و طباعت بہتر، قیمت سے چھ روپیہ پتہ :- مطبع معارف اعظم گڈھ۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت سے اسلام میں فتنہ کا جو دروازہ کھلا تھا وہ کبھی بند تو کیا ہوتا عہد بعہد اس میں وسعت ہی پیدا ہوتی رہی اور یہ شگاف سمٹنے کے بجائے پھیلتا ہی رہا۔ اس طرح کا زوال دوسرے مذاہب پر بھی آیا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ دوسرے مذاہب میں تغیر و تبدل، قطع و برید اور حک و فک اس حد تک ہوا کہ اُن کی اصل صورت ہی مسخ ہو گئی اور آج ان کی حقیقی شکل و صورت کا سراغ لگانا بہت مشکل کام ہے لیکن اسلام کا معاملہ اس کے برعکس ہے یہاں خود غرض اور جابر و ظالم بادشاہوں کے دوش بدوش عدل گستر اور پکے مسلمان بادشاہ علمائے سوء کے ساتھ ساتھ علمائے حق اور باطل پرست امراء و رؤساء کے پہلو بہ پہلو صالح اور راسخ العقیدہ امراء اور اعیان ہر دور اور ہر قرن میں برابر پیدا ہوتے رہے ہیں اور اس طرح زہر نے جب کبھی اثر کیا ہے اس کے تریاق کا بھی فوراً یا کچھ دنوں بعد ہی انتظام ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سینکڑوں ہزاروں فتنوں اور فرقِ باطلہ کی اسلام دشمن کوششوں۔ اور غیر اسلامی تہذیب و تمدن کے اثرات کے باوجود اسلام اپنی اصل شکل و صورت میں آج تک موجود ہے اور دوسرے مذاہب و ادیان کی طرح نہ وہ فنا ہو اور نہ مسخ ہو سکا۔ مولانا سید ابو الحسن علی میاں نے اس کتاب میں ایسی ہی ارباب عزیمت و دعوت شخصیتوں کا تذکرہ لکھا ہے جنہوں نے اپنے عہد میں کسی نہ کسی حیثیت سے صالح انقلاب پیدا کیا ہے اور اسلام میں جو فتنہ پیدا ہو رہا تھا اس کو روکنے کی کوشش کی ہے۔

یہ سلسلہ کی پہلی جلد ہے اور اس میں پہلی صدی سے لے کر چھٹی صدی تک کی نامور شخصیتوں یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز۔ امام احمد بن حنبل۔ امام ابوالحسن اشعری۔ امام غزالی وغیرہم کا علماء میں، سلطان نورالدین زنگی۔ اور صلاح الدین ایوبی کا بادشاہوں میں۔ اور مولانا رومی کا صوفیائے کرام میں مبسوط و مفصل تذکرہ ہے اس میں عام حالات سے زیادہ انھیں واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جن کا تعلق اُن کی دعوت و تبلیغ سے تھا۔ زبان و بیان اور استنادِ معلومات کے لئے فاضل مصنف کا نام سب سے بڑی ضمانت ہے۔ عام مسلمانوں کے علاوہ علماء و طلباء جو دعوت و تبلیغ کا جذبہ و ولولہ رکھتے ہیں اُن کے لئے اس کتاب کا مطالعہ خاص طور سے مفید ہوگا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل از جناب سیف فیض بدرالدین طیب جی تقطیع متوسط ضخامت ۵۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۵ر پتہ:۔ رائٹرس امپوریم لمیٹڈ۔ سر فیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی نمبر۱

آج کل مسلمانوں کے ذہن میں عام طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ملک میں اُن کا مستقبل کیا ہے؟ لائق مصنف جو بمبئی کے ایک نامور خاندان کے فرد اور خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بیرسٹر ہیں انھوں نے اسی سوال کے جواب میں بمبئی کے ایک اخبار میں چند مضامین لکھے تھے جو اس کتابچہ میں یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ ان مضامین میں سیف صاحب نے مسلمانوں کو اپنا مستقبل بہتر بنانے کے لئے جو مشورے دیئے ہیں اُن کا حاصل یہ ہے:۔

(۱) کانگرس چوں کہ ملک کی سب سے زیادہ با اقتدار جماعت ہے اور ملک میں اُسی کی حکومت قائم ہے اس لئے مسلمانوں کو اسی میں اس کثرت سے شریک ہونا چاہیئے کہ وہ کانگرس کے عنصر غالب بن جائیں۔

(۲) مسلمانوں کو ہندوستانی تہذیب اختیار کر لینی چاہئے۔ اس تہذیب سے مصنف کی مراد وہ تہذیب ہے جو $\frac{3}{4}$ ہندو تہذیب ہوگی اور $\frac{1}{4}$ اسلامی۔

(۳) مسلمانوں کو اب زیادہ توجہ ٹکنکل تعلیم کی طرف کرنی چاہیئے اور سرکاری نوکریوں کا خیال زیادہ نہیں کرنا چاہیئے۔

(۴) مسلمانوں کو ہندی زبان سیکھنی چاہیئے اور اس میں کوشش کرنی چاہیئے کہ برادرانِ وطن سے پیچھے نہ رہیں۔

جہاں تک نمبر ۳ اور ۴ کا تعلق ہے تو یہ ایسی کھلی اور واضح بات ہے کہ کسی بھی معقول آدمی کو اُس سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔ البتہ نمبر اول پر کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مسلمان کانگرس میں خواہ کتنی ہی بڑی تعداد میں شریک ہوں بہر حال وہ اقلیت میں ہونے کے باعث اُس کا عنصر غالب نہیں بن سکتے اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کانگرس اکثریت کے فرقہ میں مقبول نہیں رہی ہے اور جب اس کی پوزیشن یہ ہو جائے گی تو پھر ظاہر ہے کہ کانگرس نہ حکومت بنا سکتی ہے اور نہ از خود کوئی اور کام کر سکتی ہے۔ رہا نمبر ۲ تو اس بارہ میں گذارش یہ ہے کہ

چمک سورج میں کیا باقی رہے گی   اگر بیزار ہے اپنی کرن سے

بہر حال لائق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے کافی سنجیدگی اور غور و فکر سے لکھا ہے اس لئے کوئی صاحب ان کی رائے سے متفق ہوں یا اُس کے مخالف۔ بہر حال اس کتابچہ کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

حیاتِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حصہ اول از جناب ملا واحدی صاحب تقطیع خورد ضخامت ۲۷۷ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت سے تین روپیہ پتہ:۔ دفتر نظام المشائخ ۱۴۱ جیکب لائنز کراچی ۳

ملا واحدی دہلوی خواجہ حسن نظامی مرحوم کے خاص تربیت یافتہ ہیں اس لئے زبان و بیان میں جو انداز خواجہ صاحب کا تھا۔ شوخی۔ ظرافت اور چلبلاہٹ سے قطع نظر وہی انداز ملا صاحب کا بھی ہے۔ موصوف نے اسی دہلی کی دُھلی دُھلائی زبان میں سیرت میں یہ کتاب لکھی ہے اور اس کتاب کی یہی خصوصیت ہے، واقعات سے نتائج نکالتے گئے ہیں جن سے اخلاقی سبق بھی ملتا ہے۔ یہ کتاب

حاشیہ: اس دلائل سے کہ بچوں اور بچیوں کے نصاب ورسی میں شامل کی جائے۔

بُرہان

جلد ۳۶ شمارہ ۶

جون ۱۹۵۶ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۷۵ھ

فہرست مضامین

۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اول تو ہمارے ملک میں مسلمانوں کے اپنے اخبار ہی کتنے ہیں اور جو گنے چنے ہیں بھی تو اُن کا حال یہ ہے کہ اُن میں آپس میں اتفاقِ خیال اور اتحادِ رائے بالکل نہیں۔ چنانچہ اگر آج کوئی ایک شخص ان تمام مسلم اخبارات کو سامنے رکھ کر یہ معلوم کرنا چاہے کہ بھارت کے مسلمانوں کا حال کیا ہے؟ اُن کے افکار و جذبات کیا ہیں؟ اُن کے مطالبات اور اُن کی شکایتیں کیا ہیں؟ اور اُن کے وہ کون سے معاملات و مسائل ہیں جن کا حل وہ دریافت کرنا چاہتے ہیں؟ تو اس شخص کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔ وہ ان تمام جرائد و رسائل کو دیکھنے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ جو اوروں کا حال ہے وہی مسلمانوں کا بھی ہے۔ یعنی کسی کی رائے کچھ ہے اور کسی کی کچھ۔ پوری مسلمان قوم کا نہ کوئی متحدہ مطالبہ ہے نہ کوئی شکایت ہے اور اُن کا نہ کوئی ایسا اجتماعی احساس ہے جس کو ہم قومی احساس اور ملی شعور کہہ سکیں جہاں تک سیاسیات اور مذہب کے علاوہ دوسرے امور کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ ایک جمہوری ملک میں ان پر سب کا اتفاق نہیں ہو سکتا کیوں کہ ان امور پر فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے غور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے اگر ان معاملات میں مسلم اخبارات باہم متفق نہیں تو یہ نہ افسوس کی بات ہے اور نہ اس سے کوئی برائی لازم آتی ہے۔ لیکن بڑے افسوس اور شرم کی بات تو یہ ہے کہ یہ اخبارات اُن معاملات و مسائل میں بھی متفق نہیں جو مسلمانوں کے خالص دینی اور مذہبی مسائل ہیں اور وہ بھی فروعی اور جزئی نہیں بلکہ اصولی اور بنیادی ہیں۔ مثلاً پچھلے دنوں مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کا ایک بیان گاندھی جی کی پرارتھنا کی نسبت شائع ہوا تھا یقین تھا کہ کم از کم یہ ایک معاملہ تو ایسا ہے جس پر کہیں کسی مسلم حلقہ سے اختلاف کی آواز بلند نہیں ہو گی یہی حال توہینِ انبیاء اور اہانتِ رسول کے دو تین واقعات کا ہے جو ابھی پچھلے دنوں پیش آچکے ہیں، وہ کون بدبخت مسلمان ہو گا جس کے قلب و جگر پر ان واقعات سے نشتر نہیں لگا ہو گا مسلمان تو مسلمان خود ہندو اور سکھ

نے ان واقعات کے خلاف احتجاج کیا اور حکومت سے استدعا کی کہ آئندہ اس طرح کے واقعات کا سدِباب کرنے کے لئے موثر عملی اقدام کرے اور اگر قانون میں کہیں کوئی خلا ہے تو پارلیمنٹ کے ذریعہ اس کا انتظام کیا جائے لیکن بُرا ہو مسلمانوں کے انتشارِ خیال اور ان کی آپس کی پھوٹ کا کہ اس نوع کے زہرہ گداز واقعات کی اشاعت اور ان پر سنجیدہ و معتدل احتجاج بھی ان کے اختلاف کا محاذ اور علمی جولاں گاہ بن گیا۔

جو لوگ مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب کے مذکورہ بالا بیان سے صاف اور کھلے لفظوں میں اختلاف کی جرأت نہیں رکھتے تھے انھوں نے کچھ اور نہیں تو چلتے چلتے یہی ریمارک کر دیا کہ یہ گیت تو عرصہ سے ہندوستان کے قریہ قریہ اور شہر شہر میں گایا جا رہا ہے تو پھر مولانا نے آج تک اس کے خلاف کیوں احتجاج نہیں کیا۔ گویا مقصد یہ ہے کہ مولانا کا کوئی ایک عمل بھی بے داغ اور بے لوث نہ رہے۔ در حقیقت اس طرح کے ریمارک دل کی اس کیفیت کے آئینہ دار ہیں جو جماعتی تحزب اور گروہ بندی کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں اور جس کی وجہ سے افراد میں اس بات کی صلاحیت بالکل مفقود ہو گئی ہے کہ وہ اپنے خالص دینی اور مذہبی معاملات پر بھی خالصۃً لوجہ اللہ غور و فکر کر سکیں۔

یہ دو چار اکا دکا نہیں۔ ایک لادینی حکومت میں مسلمانوں کے سامنے ایسے معاملات برابر پیش آتے رہیں گے جن کے بارہ میں ان کو اپنی مذہبی تعلیمات کو واضح کرنا ہوگا اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان سے متعلق اپنی پوزیشن متعین کر کے دوسروں کو اس سے باخبر کرنا ہوگا۔ مثلاً بجلی کے ذریعہ جانور ذبح کرنا۔ تعددِ ازدواج۔ بین الاقوامی شادی وغیرہ! اب ذرا سوچئے اگر اختلاف خیال کا عالم یہی ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا! کیا آپ کی کوئی ایک بات بھی ایک متفقہ قومی مطالبہ کی حیثیت سے تسلیم کی جا سکے گی آخر انجام یہی ہوگا کہ جس طرح انگریزوں کے زمانہ میں ایسے مولوی اور مفتی پیدا ہو گئے جنھوں نے انگریزوں کے ہر عمل و فعل کے لئے یہاں تک کہ ترکوں سے خود مسلمانوں کو لڑانے کے لئے بھی سندِ جواز پیش کر دی اور ہر فتویٰ کے مقابلہ میں ایک فتویٰ۔ ہر مذہبی تحریر کے مقابلہ میں ایک مذہبی تحریر سامنے لا رکھی۔ اسی طرح اب اس آزادی کے دور میں بھی یہی ہوگا اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کا جو انجام ہوگا وہ ظاہر ہے۔

ان سطور کا مقصد خدانخواستہ نہ کسی پر طعن و تعریض ہے اور نہ کسی خاص فرد یا جماعت کی مذمت! بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کم از کم اپنے خالص دینی معاملات میں ہم آپس کے اختلاف کو سطح پر نہ آنے دیں اور اس سلسلہ میں پبلک میں جو مطالبہ رکھیں وہ متفقہ

ہو۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ سب مسلمان کسی ایک جماعت کو اپنے مذہبی معاملات میں نمائندگی کا حق دے دیں اور اُس پر وہ اعتبار کریں۔ اس قسم کی ایک مذہبی جماعت جمعیۃ علماً کے نام سے پہلے سے قائم ہے۔ یہ کسی ایک خاص مسلک و مشرب کے علمار کی جماعت نہیں ہے۔ اس میں دیوبندی بھی ہیں اور غیر دیوبندی بھی۔ مقلد بھی ہیں اور غیر مقلد بھی۔ ندوی اور فرنگی محلی بھی۔ پھر اس جماعت کی تاریخ ماضی بڑی شاندار رہی ہے اس لئے اگر حکومت کے سامنے مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں نمائندگی کا حق اسی ایک جماعت کو دے دیا جائے اور سب مسلمان اخبارات اُس کی حمایت کریں تو پھر آپ کے مطالبہ کا ایک وزن بھی ہو سکتا ہے اور اُس کی شنوائی بھی ہو سکتی ہے

گذشتہ سال بمبئی میں جو آل انڈیا دینی تعلیمی کنونشن ہوا تھا اگر ہم چاہیں تو اس سے سبق لے سکتے ہیں۔ اس کنونشن میں سنی ۔شیعہ ۔ دیوبندی ۔ بریلوی ۔ مسٹر ۔ مولوی ۔ صوفی غرض ہر ہی قسم کے مسلمان جمع ہوئے اور سب نے دینی تعلیم کی اسکیم کو چلانے اور کامیاب بنانے کے سلسلہ میں جمعیۃ پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا اور یہ خدمت بھی جمعیۃ کے ناظم اعلیٰ کے سپرد کر دی۔

لکھنؤ کنونشن کے بعد سے جمعیت سیاسیات سے تو الگ ہو ہی گئی ہے اس لئے اب اس معاملہ میں آپ کو نہ اس کی قیادت کی ضرورت ہے اور نہ وہ خود اس سلسلہ کی کسی چیز سے متعلق آپ کو کوئی رہنمائی دے سکتی ہے۔ آپ کو اختیار ہے۔ اپنی صوابدید کے مطابق جس راہ کو اچھا سمجھیں اختیار کریں اب صرف مذہبی اور تہذیبی معاملات رہ جاتے ہیں! تو اگر واقعی ایک اجتماعی اور ملی مفاد آپ کے سامنے ہے۔ اور جنت کا مستحق آپ صرف اپنے آپ کو ہی نہیں سمجھ بیٹھے ہیں تو آپ کے لئے صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو اپنے دینی اور مذہبی معاملات و مسائل میں جمعیت علمار کی نمائندگی پر اعتماد کیجئے اور اگر نہیں کر سکتے تو اس کے بالمقابل کوئی اور ایسی جماعت پیدا کیجئے جو سب مسلمانوں کی مذہبی نمائندگی کر سکتی ہو۔ ہر ایک اپنی ڈفلی اور اپنا راگ رہا تو نہ ڈفلی رہے گی اور نہ راگ۔

لیکن الدین النصح کے بحکم یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ جمعیۃ علمائے ہند کا نظام دستوری جس طرح جمہوری اور عوامی ہے اسی طرح اُس کا نظام عملی بھی جمہوری ہونا چاہیئے اور عام طور پر اس جماعت کو جو خاص ایک ہی مسلک کے علمار کی جماعت سمجھا جاتا ہے۔ کوشش ہونی چاہیئے کہ یہ خیال لوگوں کے دماغ سے دور ہو نوجوان علمار کو موقع دینا چاہیئے کہ وہ ذمہ داری کے کام سنبھالیں تاکہ موجودہ اکابر جمعیۃ کی رہنمائی اور نگرانی میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جو کل اپنے بزرگوں کی جانشینی کر سکیں ایک بڑے انسان کا فرض صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ خود بڑے کام کرے بلکہ اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ بڑے آدمی پیدا کرے تاکہ اُس کے بعد اُس کی روایات قائم رہیں اور اُس کے شروع کئے ہوئے کام ملتوی نہ ہوں بلکہ تکمیل پذیر ہوں۔

شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن

از

(سعید احمد)

ابتدائی حالات | شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی دہلی یونیورسٹی نسلاً مسلمان راجپوت تھے۔ آپ کے اسلاف جھجھیڑا ضلع میرٹھ کے قدیم باشندے تھے۔ یہ لوگ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں دکن کی کسی مہم پر گئے ہوئے تھے کہ وہاں کسی بزرگ کے مزار پر کچھ کرامتیں دیکھیں اور مسلمان ہو گئے۔ مرہٹوں کا جب عہد آیا تو انھوں نے ان نو مسلم راجپوتوں کو جھجھیڑے سے نکال دیا یہ لوگ تتر بتر ہو گئے اور مختلف علاقوں میں جا بسے۔ مولوی صاحب کا تعلق راجپوتوں کے خاندان تنور یا تنوار سے تھا۔ جھجھیڑے سے اُجڑنے کے بعد مولوی صاحب کے پردادا اپنے پانچ بیٹوں کو ساتھ لے بلند شہر میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اس لئے آپ کا آبائی وطن بلند شہر ہی ہوا۔

ولادت اور تعلیم | مولوی صاحب کے والد ماجد صاحب جے پور جا کر فوج میں ملازم ہو گئے تھے اور ترقی کرتے کرتے نائب میجر کے عہدہ تک پہنچ گئے تھے۔ شمس العلماء کی پیدائش وہیں جے پور میں ۱۰ر فروری ۱۸۷۳ء کو ہوئی اور اپنی عمر کے تئیس برس آپ نے وہیں گذارے۔ ابتدائی تعلیم مکتب کے طریقہ پر ہوئی اور بعد میں مہاراجہ کالج جے پور میں داخل ہو کر عربی فارسی اور اس زمانہ کے علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ فراغت کے بعد اسی کالج میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔

ملازمت | کچھ دنوں کے بعد یہاں سے جی اُچاٹ ہو گیا تو ۱۹۰۳ء میں لاہور کے رنگ محل ہائی سکول میں عربی اور فارسی کے استاذ یعنی ہیڈ مولوی مقرر ہو گئے لاہور کے قیام میں اسکول میں ٹیچری کرنے کے ساتھ ساتھ پیسہ اخبار میں بھی کام کرتے تھے۔ لکھنے اور مضمون نگاری کی مشق انھیں یہیں

ہوئی۔ اسی سلسلہ میں مقدمہ ابن خلدون کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو غالباً پیسہ اخبار کی طرف سے ہی شائع ہوا تھا۔

سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی سے تعلق

سنہ ۱۹۰۶ء میں نہ صرف دہلی بلکہ شمالی ہند کے مشہور کالج "سینٹ اسٹیفنس کالج"[1] میں عربی کے استاد کی جگہ خالی ہوئی اور اس کا اشتہار اخبارات میں شائع ہوا۔ تو لاہور میں شمس العلماء کا ایک بے تکلف دوست تھا۔ یہ شخص شاید (اب ٹھیک یاد نہیں رہا) پان، سگرٹ کی دکان کرتا تھا اور مولوی صاحب روزانہ اس کی دکان پر شام کے وقت ایک آدھ گھنٹہ کے لئے جاکر بیٹھا کرتے تھے۔ اس شخص کو سینٹ اسٹیفنس کالج کی جگہ کا علم اخبارات کے ذریعہ ہوا تو اس نے مولوی صاحب سے کہا کہ درخواست بھیج دیجئے۔ اچھا موقع ہے۔ لیکن مولوی صاحب ٹھہرے اول تو فطری طور پر قناعت پسند۔ گوشہ گیر اور پھر یہ خیال کہ کالج بڑا نامی گرامی ہے اور میں ایک ہائی اسکول کا ہڈ مولوی۔ بھلا وہاں میری کیا دال گلے گی۔ چپ ہوکر بیٹھ رہے اور درخواست نہیں بھیجی۔ مولوی صاحب کے پنواڑی دوست نے کیا کام کیا! خود مولوی صاحب کی طرف سے درخواست لکھی اور اللہ کا نام لے کالج کے پرنسپل کے نام روانہ کردی درخواست کے ساتھ ایک عقل مندی یہ بھی کی مولوی صاحب نے مقدمہ ابن خلدون کا جو اُردو ترجمہ کیا تھا اس کی ایک جلد بھی نتھی کردی تھی۔

یہاں خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس پوسٹ کے لئے جو درخواستیں آئی تھیں اُن میں عربی کے ایم۔ اے بلکہ پی۔ ایچ ڈی تک کی درخواست تھی۔ آخر انتخابی بورڈ کا جلسہ ہوا۔ مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی مرحوم جو اُردو کے عناصرِ خمسہ میں سے ہونے کے علاوہ عربی زبان کے بڑے فاضل اور ادیب تھے۔ وہ اس بورڈ کے ممبر تھے اور امیدوار کی لیاقت و قابلیت سے متعلق مولوی صاحب

---

[1] یہ وہی کالج ہے جس میں مرزا غالب فارسی کے استاد مقرر ہوتے تھے۔ لیکن چونکہ کالج کا پرنسپل مرزا صاحب کے استقبال کے لئے اپنے دفتر سے باہر نہیں نکلا تھا اس لئے مرزا اس کو اپنی توہین سمجھ کر واپس چلے آئے تھے اور استعفا دے دیا تھا۔

کی رائے ہی حرفِ آخر کا حکم رکھتی تھی۔ اُس زمانہ میں شاید امیدواروں سے انٹرویو کرنے کی رسم بھی نہیں تھی۔ سب درخواستیں مولوی نذیر احمد صاحب کے سامنے رکھ دی گئیں انھیں دیکھتے دیکھتے جونہی مولوی صاحب کی نظر مقدمہ ابن خلدون کے اردو ترجمہ پر پڑی جو شستہ و رفتہ اور سلیس و شگفتہ زبان میں کیا گیا تھا دیکھتے ہی پھڑک اٹھے اور اپنا آخری اور قطعی فیصلہ مولوی عبدالرحمن صاحب کے حق میں دے دیا۔ موصوف کو شاید وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ان کا انتخاب یا آج کل کی بولی میں چناؤ ہو جائے گا۔ اب اچانک تقرر نامہ پہنچا تو حیرت میں رہ گئے اور آخر کار دہلی چلے آئے۔ اُس زمانہ میں روپیہ پورے سولہ آنہ کا ہوتا تھا۔ اور ہر چیز میں برکت تھی۔ آج کل کے سے جان لیوا خرچ اخراجات بھی پیدا نہیں ہوئے تھے اس لئے اُس زمانہ کے پچھتر روپیہ کسی طرح آج کل کے پانسو سے کم نہیں تھے اسکول کے ہڈ مولوی کے درجہ سے ترقی کر کے ایک نہایت وقیع کالج کے پروفیسر ہو گئے اور اطمینان و فارغ البالی کے ساتھ گذر بسر کرنے لگے مولوی صاحب اکثر اس واقعہ کا ذکر کر کے فرمایا کرتے تھے کہ بھئی! ہم تو یہاں خود آئے نہیں لائے گئے ہیں۔ انسان چاہے نہ چاہے جہاں کا آب و دانہ اس کی قسمت میں ہوتا ہے وہ اسے ضرور ملتا ہے، پھر اپنے پنجابی دوست کے احسان کا تذکرہ کرتے اور اپنے جذبۂ احسان شناسی کا اظہار کرتے تھے۔ اس وقت ان کی آنکھیں نم آلود ہو جاتی تھیں۔

۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک یعنی کم و بیش ۳۳ برس اسی کالج سے وابستہ رہے جب دلی یونیورسٹی قائم ہوئی تو چونکہ یونیورسٹی میں باتنخواہ پروفیسر کوئی نہیں تھا اس لئے یونیورسٹی کے آنریری صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو منتخب ہو گئے اور کالج سے ریٹائرڈ ہونے تک وہ برابر اس عہدے پر رہے۔

مولوی صاحب نے یہ زمانہ بڑی آن بان اور شان کے ساتھ گذارا۔ کالج میں اگرچہ تقرر بحیثیت استاذ عربی کے ہوا تھا لیکن فارسی بھی پڑھاتے تھے۔ کالج مشن کا تھا اس لئے بڑی ٹیپ ٹاپ اور قاعدہ قانون کا کالج ہے۔ اسٹاف میں متعدد یوروپین اور طلبا اکثر و بیشتر اونچے گھرانوں کے۔

ایسی فضا اور ایسے ماحول میں ایک عربی کے استاد کو اپنے لئے کوئی وقیع مقام حاصل کرلینا آسان نہیں تھا۔ پرنسپل نہایت مردم شناس تھے۔ لیکن مولوی صاحب جس قابلیت ولیاقت وضع داری اور رکھ رکھاؤ کے انسان تھے اُس کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد کالج میں امتیاز پیدا کرلیا۔ عربی فارسی کے وہ استاذ اور اُس میں باکمال تو تھے ہی اُن کا عہد مغلیہ سلطنت کا مطالعہ بھی بڑا ٹھوس اور وسیع تھا۔ چنانچہ سالہا سال تک تاریخ میں ام۔ اے کے طلباء کو مغل عہد پر لکچر دیتے رہے، ان کے یہ لکچر اس درجہ پُراز معلومات ہوتے تھے کہ صدر شعبۂ تاریخ جو ایک یورپین تھا وہ بھی کسی کسی لکچر میں شریک ہوتا تھا اور پرنسپل صاحب جن کو تاریخ کا خاص ذوق تھا وہ بھی گاہے گاہے آتے تھے۔

مولوی صاحب اگرچہ درسِ نظامی کے باقاعدہ فارغ التحصیل تھے اور اس بنا پر اُن کو سب ہی علوم وفنونِ اسلامیہ سے دلچسپی اور مناسبت تھی لیکن عربی ادب وتاریخ اور اُس میں بھی خاص کر عہد جاہلیت اُن کا خاص موضوع تھا۔ پروفیسر مارگولیوتھ نے عہد جاہلیت کی شاعری پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ سب اختراعی اور عہد بنی عباس کی موضوع شاعری ہے جس کو عہدِ جاہلیت کے شعراء کی طرف منسوب کردیا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ معجم الادباء وغیرہ کے جو بیانات خلف الاحمر اور حماد الراویہ وغیرھما کے متعلق ہیں اُن سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ پروفیسر مارگولیوتھ کے اسی نظریہ کی بنیاد پر اُن کے شاگرد رشید ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری نے پہلے کتاب الشعر الجاہلی اور پھر الادب العربی لکھی۔ شمس العلماء اس نظریہ کے زبردست نقاد تھے اور وہ اگرچہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ خلط ملط ضرور ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی عہدِ جاہلیت کی شاعری اور عہدِ اسلام کی شاعری دونوں کی زبان اور طرزِ بیان میں وہی فرق ہے جو کسی زبان کے ابتدائی عہد اور عہدِ ارتقاء میں ہوتا ہے اور اُسی کی وجہ سے زبان کا ایک نکتہ داں کسی ایک شعر کو سن کر فوراً معلوم کرسکتا ہے کہ وہ کس زمانہ کا شعر ہے، راقم الحروف نے موصوف سے تلمذ کے زمانہ میں دیوان عبید بن الابرص جو ایم۔ اے عربی کے نصاب میں شامل تھا پڑھا ہے۔ اس کو پڑھاتے

وقت وہ اکثر یہی بحث اُٹھاتے تھے اور اُس پر مدلل کلام کرتے تھے۔

سفر یورپ و حج | ۱۹۲۸ء میں آکسفورڈ میں جو بین الاقوامی اورینٹیل کانفرنس ہوئی تھی۔ شمس العلماء نے اُس میں دہلی یونیورسٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی تو اس کانفرنس میں بھی عربی زبان میں اسی موضوع پر مقالہ پڑھا جس میں پروفیسر مارگولیوتھ کے نظریہ پر سخت لیکن نہایت مدلل اور معقول بحث کی تھی۔ کانفرنس میں اس مقالہ کا بڑا چرچا ہوا اور مصر کے اخبارات نے اس کے مختلف اجزا الگ الگ چھاپے اور ان پر نوٹ لکھے۔ کانفرنس سے فارغ ہو کر اور انگلینڈ کی سیر و سیاحت کر کے جب مولوی صاحب مصر پہنچے تو انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُن کی آمد سے پہلے اُن کی شہرت مصر پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ اب مصری اخبارات نے آپ کے فوٹو شایع کئے اور مصر کے بڑے بڑے اربابِ قلم ادبا، اور اخبار نویس یہاں تک کہ خود ڈاکٹر طہٰ حسین ملاقات کے لئے آپ کے ہوٹل میں آئے۔ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ گورنمنٹ کالج لاہور نے جو اُس زمانہ میں لندن میں مقیم تھے اس اورینٹیل کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال معارف اعظم گڈھ میں لکھا تھا اور اُس میں مولوی صاحب کی عربی سج دھج۔ اور مقالہ کا خاص طور پر تذکرہ کیا تھا۔ مولوی صاحب نے واپسی میں ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی اور سب سے آخر میں حج و زیارت حرمین شریفین سے سرفراز ہو کر دلی واپس ہوئے۔ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا۔

چلے ہیں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے ۔۔۔ وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

لیکن شمس العلماء نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا کہ دنیا میں جو صاحبِ نظر بھی ہوتے ہیں اور صاحبِ ذوق بھی وہ خدا کی شان کو مبتدا بنا کر خدا کے گھر کی زیارت کو اُس کی خبر بناتے ہیں اور اس طرح زندگی کے جملہ کو جملۂ تام کرتے ہیں " ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن "

اس پورے سفر میں نو ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ تین ہزار یونیورسٹی نے دئے تھے باقی چھ ہزار شمس العلماء نے اپنے پاس سے خرچ کئے۔ پورا سفر غالباً تین ماہ میں طے ہوا تھا۔

اندازِ تحریر | اُردو کے عناصر خمسہ میں سے مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی نذیر احمد دہلوی سے غیر معمولی

طور پر متاثر تھے اور ان کے اندازِ نگارش اور انشاء پردازی کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ اسی کا غالباً یہ اثر تھا کہ خود شمس العلماء کی تحریر ان دونوں بزرگوں کے اندازِ تحریر کا سنگم ہوتی تھی اور اس وجہ سے اُس میں زندہ رہنے کی صلاحیت نسبتہً زیادہ ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات کو یہ فقرہ کچھ الو کھا معلوم ہو اس لئے اس کی کسی قدر تشریح ضروری ہے۔

اصل یہ ہے کہ مولوی محمد حسین آزاد کے طرزِ نگارش کی خصوصیت ان کی استعارہ پیمائی ہے۔ وہ معمولی سے معمولی بات بھی کہتے ہیں تو تشبیہ و استعارہ کے پیرایہ میں کہتے ہیں۔ اس سے بلاشبہ معقولات محسوسات کے پیکر میں جلوہ نما ہو کر نظر کے سامنے چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ عبارت میں حسن اور دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے اور کلام کی قوتِ تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن ہر چیز کا ایک محل موقع ہوتا ہے۔ آزاد کی بڑی خامی یہ ہے کہ وہ اس کا بالکل لحاظ نہیں رکھتے جو مطلب دو سادہ لفظوں میں بڑی بلاغت کے ساتھ ادا ہو سکتا ہے اسے بھی ایک داستان بنا دیتے ہیں۔

مولوی نذیر احمد دہلوی کی خصوصیت محاورات بندی ہے۔ لیکن اول تو یہ دلی کے ٹکسالی محاوروں کے ساتھ عربی کے موٹے موٹے اور بھاری بھرکم الفاظ اور بندشوں کا پیوند لگاتے چلے جاتے ہیں جس سے ان کی عبارت گنگا جمنی ہو جاتی ہے اور پھر محاوروں کی بھرمار بھی اس غضب کی ہے کہ اُس میں نہ اعتدال و توازن ہے اور نہ موقع محل کی رعایت ہے۔ سنجیدہ علمی مباحث پر بھی گفتگو کریں گے تو اسی انداز میں اور مذہبی احکام و مسائل سنائیں گے تو وہ بھی دلی کی اسی گھریلو بولی میں۔ اس طرز کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی نذیر احمد دونوں اپنے اپنے طرز کے موجد بھی تھے۔ اور خاتم بھی۔ ان کے بعد نہ کوئی شخص ان کی پیروی کر سکا اور نہ مقبولیت عام کے دربار میں ان کو بقائے دوام کا خلعت مل سکا۔ یہ دونوں طرز ایک خاص عہد کی پیداوار تھے اور اس عہد کے ساتھ وہ بھی ختم ہو گئے! گویا اُس ایک پھل کی مانند تھے جو اپنے موسم میں ہی اچھا اور لذیذ لگتا ہے۔ بے موسم اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ آج لوگ ان کی کتابیں پڑھتے ہیں

تو اُن کو کلاسکل لٹریچر سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ اس کے برخلاف شبلی اور حالی کی کتابوں پر ابھی قدامت کی ٹوٹی لگنی شروع نہیں ہوئی۔ وہ آج بھی ایسی ہی تازہ ہیں جیسی کہ کل تھیں۔

مولوی عبدالرحمن صاحب نے آزاد اور نذیر احمد دونوں کی پیروی کی۔ لیکن اس طرح کہ استعارہ کی زبان ایک سے لی اور محاورہ بندی دوسرے سے اور پھر دونوں کو مناسب مقدار میں لے کر ان کے امتزاج سے اپنا ایک ایسا طرز ایجاد کیا جس میں توازن بھی تھا اور اعتدال بھی حسن بھی تھا اور نغمگی بھی۔ خوش آہنگی بھی تھی اور صوتی جمال بھی۔ چھوٹے چھوٹے فقرے ترشے ترشائے۔ ہلکے پھلکے الفاظ سہل وسلیس اور نرم و رواں لیکن باوقار و تمکنت افسوس ہے کہ موصوف نے ادبی کاوشوں کا کوئی بڑا ذخیرہ اپنی یادگار نہیں چھوڑا۔ البتہ ۱۹۲۲ء میں اردو شعر وشاعری پر دلی یونیورسٹی میں کچھ توسیعی لکچر دئے تھے انھیں کو بعد میں دوستوں اور شاگردوں کے اصرار، "مرآۃ الشعر" کے نام سے ایک ضخیم کتاب کی شکل میں چھپوادیا تھا جن لوگوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے انھیں یاد ہوگا کہ جب یہ کتاب چھپ چھپا کر منظر عام پر آئی ہے تو ایسا معلوم ہوا کہ ادبی دنیا میں ایک بھونچال سا آگیا ہے۔ فنِ شعر، اس کے اصولِ بلاغت اور اردو شاعری کے مزاج اور خصوصیات پر جس دقتِ نگاہ اور تحقیق کے ساتھ اس کتاب میں مبسوط مفصل اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے اُس کے پیشِ نظر یہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ خواجہ الطاف حسین حالی کے مقدمۂ شعر وشاعری کے بعد اردو فنِ شعر وشاعری پر اگر کوئی عہد آفریں کتاب لکھی گئی ہے تو وہ یہی تھی۔ اخبارات میں بڑے شاندار تبصرے ہوئے۔ اس کتاب کے مختلف ابواب بہت سوں نے اپنے ہاں نقل کئے۔ لاہور کا اخبار انقلاب جو غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک کی ادارت میں بڑے طمطراق سے نکلتا تھا اور جس کی اخباری حیثیت کے علاوہ ادبی اہمیت اور حیثیت بھی مسلم تھی اُس نے مرآۃ الشعر کو ادب و زبان کا ایک بلند پایہ ادبی شاہکار لکھا اور اس کا ایک باب "مصور اور شاعر" بہت نمایاں طریقہ پر شائع کیا اس خاکسار کو مولوی صاحب سے پہلا غائبانہ تعارف انقلاب کے اسی مضمون سے ہوا تھا جب کہ میں دارالعلوم دیوبند

میں طالب علم تھا۔ علی گڈھ کے سہ ماہی ادبی رسالہ مستقبل اور معارف اعظم گڈھ ایسے بلند پایہ رسالوں نے بھی بڑی کشادہ دلی کے ساتھ اس کتاب کے مصنف کو خراج تحسین و آفریں پیش کیا۔ پنجاب یونیورسٹی نے آنرز ان اردو و ادیب فاضل کے نصاب میں شامل کیا۔ معلومات تحقیق اور وسعت بحث کے علاوہ جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کتاب کا اسلوب نگارش ۔ طرفگی بیان ۔ اور حسن زبان تھا۔ لیکن مصنف چونکہ ایک کالج کا پروفیسر تھا اور صحافت یا ادب کی اخباری دنیا کا انسان نہیں تھا اور پھر اس کے بعد اس کا کوئی اور ادبی کارنامہ سامنے بھی نہیں آیا اس بنا پر اس کتاب کا اور اس کے مصنف کا کچھ دنوں تو چرچا رہا پھر لوگ اس حیثیت سے جلد ہی بھول گئے ۔ گویا

"خوش درخشید و لے شعلہ مستعجل بود"

جہاں تک تصنیفی یادگار کا تعلق ہے اس کے سوا کوئی اور لائق ذکر کتاب نہیں ہے البتہ مغلیہ سلطنت کے نظام منصب داری" پر اُن کا ایک بڑا قابل قدر مقالہ اورینٹل کالج میگزین میں بہت دنوں تک نکلتا رہا تھا۔ اس کے علاوہ ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور۔ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن اور اورینٹل کانفرنس کے جلسوں میں برابر شریک ہوتے تھے اور کوئی نہ کوئی مقالہ کبھی عربی میں اور اکثر و بیشتر اُردو میں پڑھتے تھے۔ اس سلسلہ میں اُن کا مشہور مقالہ وہ ہے جو ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے جلسہ میں جزیہ پر پڑھا تھا اور جو بعد میں ادارہ کی روئداد میں شائع بھی ہوگیا تھا۔ برہان میں بھی ایک مضمون "متحدہ قومیت اور اسلام" کے عنوان سے نکلا تھا اور کئی قسطوں میں تمام ہوا تھا۔ مولوی صاحب کے صاحبزادہ رشید صاحب کا بیان ہے کہ حضرت مرحوم نے اپنے ابتدائی زمانہ میں مقدمہ ابن خلدون کے علاوہ "الحصون الحمیدیہ" کا بھی ترجمہ کیا تھا اور ان کے نام سے چھپ بھی گیا تھا۔ لیکن خاکسار کی نظر سے نہیں گذرا۔ اس کے علاوہ جبل پور میں "العروس البدیعہ فی علم الطبیعہ" نامی کتاب کا بھی ترجمہ کیا تھا لیکن دہلی پہنچنے کے بعد کوئی "تلمیذ رشید" اسے لے اُڑا اور پھر وہ کتاب واپس نہیں ملی۔

انگریزی کی قابلیت | دہلی آنے تک انگریزی سے بالکل ناآشنا تھے۔ لیکن یہاں کی سوسائٹی اور ماحول
متاثر ہو کر انگریزی سیکھنے کا ارادہ کیا تو ایک صاحب سے باقاعدہ پڑھنی شروع کی۔ تین چار کتابیں
ہی پڑھی تھیں کہ وہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور اب خود انگریزی لغت اور قرآن مجید کے انگریزی تراجم
کے ذریعہ انگریزی کا مطالعہ کرتے رہے آخر اس زبان میں اتنی استعداد بہم پہنچ گئی تھی کہ انگریزی تقریر
سمجھ لیتے تھے کتاب پڑھ کر اس سے مطلب نکال لیتے تھے البتہ خود انھیں انگریزی لکھنے اور
بولنے میں تکلف ہوتا تھا۔ جس زمانہ میں میں ام۔ اے کا طالب علم تھا بعض اوقات عجب لطف
آتا تھا میں انگریزی میں کوئی مقالہ لکھ کر لے جاتا تھا اور انھیں سناتا تھا تو کبھی وہ کسی لفظ یا کسی
جملہ کو ناموزوں اور نامناسب بتاتے اور خود مجھ سے پوچھتے کہ اچھا بتاؤ اس کے علاوہ اور کون
سے الفاظ ہو سکتے ہیں۔ میں بتاتا اور وہ ان میں سے کسی ایک کو پسند کر لیتے اور پہلے لفظ کو کٹوا کر
یہ دوسرا لفظ لکھوا دیتے اور کبھی یہ فرماتے کہ یہ جملہ جو تم نے لکھا ہے یہ تو یقیناً غلط ہے۔ لیکن اب
اس کے بجائے ہونا کیا چاہیے میں یہ بھی نہیں بتا سکتا ہوں۔ کل کالج میں انگریزی کے پروفیسر
سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ اور کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ خود فی البدیہہ اصلاح دے دیا کرتے تھے میں نے
تو وہ زمانہ دیکھا نہیں ہے لیکن لوگوں سے سنا ہے کہ جب ولایت سے واپس آئے تھے تو انگریزی
بولنے کی خاصی مشق ہو گئی تھی اور روانی کے ساتھ گفتگو کر لیتے تھے۔

شمس العلماء کا خطاب | مولوی صاحب طبعاً گوشہ نشین اور کم آمیز تھے اور حکام بالادست کی خوشامد
درآمد اور اُن کی دربار داری سے تو اُن کو کوئی واسطہ ہی نہیں تھا لیکن ان کے علم و فضل کی
شہرت جو حکومت تک بھی پہنچی تو انھیں "شمس العلماء" کے خطاب سے نوازا گیا۔ جس ملک میں
پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل جیسے لوگوں کو بھی شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز کیا جاتا ہو بھلا وہاں
مولوی صاحب کو اس اعزاز کی کیا خوشی ہو سکتی تھی۔ لیکن انھوں نے یہ سمجھ کر کہ اس کے واپس
کرنے میں بھی ایک طرح کا دکھاوا اور نمائش ہے۔ اس کو قبول کر لیا۔ لیکن وہ نہ کبھی اس کا تذکرہ
کرتے تھے اور نہ اس پر فخر کرتے تھے البتہ کالج کی خاص خاص تقریبات کے موقع پر اور اساتذہ

اپنی اپنی یونیورسٹیوں کے گاؤن اور ہڈ پہن آتے تھے اور مولوی صاحب اپنے عمامہ اور چوغہ میں جو شمس العلماء کے خطاب کے ساتھ بہ طور خلعت دیا جاتا ہے۔ آتے تھے اور اس میں بڑے بھلے لگتے تھے۔

۳۹ء میں کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو دہلی یونیورسٹی کے طلبائے قدیم کی طرف سے مولوی صاحب کو ایک بڑی شاندار الوداعی پارٹی دی گئی جو یونیورسٹی کے لان پر ہی منعقد ہوئی تھی اس پارٹی میں وائس چانسلر کالج کے پرنسپل۔ اُن کا یورایورپین اور ہندوستانی اسٹاف۔ شہر کے بڑے بڑے لوگ شریک تھے۔ وائس چانسلر نے اپنی تقریر میں مولوی صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا اور پھر اُن کو اڈریس پیش کیا گیا۔ پرانے پرانے لوگوں کا بیان تھا کہ اس طرح کی پارٹی کبھی کسی پروفیسر کو اُس کے اپنے عہدہ سے سبکدوش ہونے کے موقع پر اس سے قبل نہیں دی گئی تھی۔

مدرسہ عالیہ رام پور کی پرنسپلی

اب مولوی صاحب کا پکا ارادہ تھا کہ نوکری کہیں اور نہیں کریں گے لیکن نواب صاحب رام پور اور ریاست کے وزیر اعظم کرنل بشیر حسین صاحب زیدی جو مولوی صاحب کے شاگرد بھی تھے۔ ان کو مدرسہ عالیہ رام پور کے لئے ایک ایسے پرنسپل کی ضرورت تھی جو تعلیمی اور انتظامی اعتبار سے مدرسہ میں نئی اصلاحات جاری کر کے اُس کو ترقی دے سکے۔ اب اس کام کے لئے اُن کو مولوی صاحب سے اچھی اور کون شخصیت مل سکتی تھی۔ آخر نواب صاحب اور ان کے وزیر اعظم دونوں سر ہو گئے۔ مولوی صاحب نے ہر چند عذر و معذرت کی اپنے بڑھاپے کا بہانہ کیا لیکن راج ہٹ کے سامنے ذرا پیش نہ چلی۔ مولوی صاحب نے اس سلسلہ میں اپنی تنخواہ اور اختیارات کے بارہ میں جو شرائط پیش کی تھیں وہ سب مان لی گئیں۔ اور آپ ۴۹ء میں رام پور چلے گئے۔

مدرسہ عالیہ رام پور صوبہ اتر پردیش کی دیرینہ درس گاہ ہے۔ منطق اور فلسفہ میں اس کی بڑی شہرت رہی ہے اور یوں بھی لائق و قابل اور اچھے اساتذہ سے وہ کبھی خالی نہیں رہی۔ مولوی صاحب کا کام اگرچہ بحیثیت پرنسپل کے صرف انتظام تھا۔ لیکن مدارسِ عربیہ کے لوگ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کے متعلق یہ خیال عام طور پر رکھتے ہیں کہ یہ لوگ تھوڑے بہت عربی زبان کے ادب اور تاریخ سے ضرور واقف ہوتے ہیں۔ لیکن فنون میں کورے ہوتے ہیں اور

درسِ نظامی کی فنی کتابیں نہیں پڑھا سکتے۔ اس بنا پر مدرسہ میں اپنی ساکھ قایم کرنے کے لئے مولوی صاحب نے ضروری سمجھا کہ ضعف و پیری علالت اور انتظامی مصروفیتوں کے باوجود درس وتدریس میں بھی کچھ حصہ لیں چنانچہ انھوں نے شرح مواقف اپنے نام لکھ لی اور اسے پڑھانا شروع کردیا یہ کتاب مولوی صاحب نے کیسی پڑھائی؟ اس کا حال تو مدرسہ کے اساتذہ اور طلبا سے ہی معلوم ہوسکتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ مولوی صاحب نے اپنی برج میں یہ کتاب لے لی تھی مگر اُن کو اس میں زحمت کافی ہوئی۔ مجھ سے فرماتے تھے۔ چالیس پنتالیس برس کے بعد کتاب اُٹھا کر دیکھی تھی اس لئے اُس کا مطالعہ کرنا اور درس کے لئے اُس پر حاوی ہونا۔ اور طلبا کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے پہلے سے تیار ہونا ان سب چیزوں کا ان کی صحت پر بہت بُرا اثر ہوا۔

جون ۱۹۴۵ء تک اس مدرسہ سے تعلق رہا۔ لیکن میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ مولوی صاحب خوش نہیں رہے کیوں کہ ایک تو نواب صاحب اور وزیر اعظم سے خاص تعلق کی وجہ سے وہ سرکاری آدمی سمجھے جاتے تھے اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے اصول میں بڑے سخت قسم کے انسان تھے انھوں نے جاتے ہی مدرسہ میں نصاب کی اصلاح اور انتظامی امور کی دیکھ بھال اس سختی اور شدت کے ساتھ کی کہ اساتذہ اُس کے متحمل نہیں ہوسکے اور باہمی تعلقات میں بدمزگی کی سی صورت پیدا ہوگئی۔ ۱۹۴۵ء میں ایک مرتبہ مجھ کو بھی رام پور اس غرض سے بلایا تھا کہ میں مدرسہ کے اساتذہ اور طلبار کے سامنے ایک تقریر عربی میں کروں جس میں نصاب کی تبدیلی کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہو اور دوسری تقریر مدرسہ ہی میں شب کے وقت ایک عام جلسہ میں سیرت کے موضوع پر کروں۔ حسبِ ارشاد میں رام پور پہنچا لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ جس روز دن کے دس بجے میری تقریر عربی میں ہونے والی تھی اُس سے پہلی شب میں مسٹر چرچل نے فتح اور جنگ کے بند ہو جانے کا اعلان کردیا اور اس خوشی میں سرکاری طور پر تمام دفتروں کے ساتھ ساتھ مدرسہ کی بھی چھٹی ہوگئی اور یہ جلسہ نہیں ہوسکا البتہ شب میں عشار کی نماز کے بعد خواجہ غلام السیدین کی صدارت میں عام جلسہ ہوا۔ سیدین صاحب اس زمانہ میں ریاست کے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن

تھے۔ میری تقریر سے پہلے مولوی صاحب نے ایک تقریر کی جس میں پہلے میرا تعارف کرایا اور اس کے بعد مدارسِ عربیہ کے مروجہ نصاب کی خامیوں اور کوتاہیوں کا ذکر اس قدر جذباتی انداز میں کیا کہ پندرہ بیس منٹ بولنے کے بعد ہی اُن کی آواز بھرا گئی اور وہ ہانپنے لگے تھے۔ گفتگو اگرچہ عام تھی لیکن مدرسہ کے احاطہ میں اور اُس مدرسہ کے سب اساتذہ اور طلبار کے سامنے ہر شخص یہ سمجھ سکتا تھا کہ گوشہ خاطر کس طرف ہے اس لئے میرا احساس یہ تھا کہ مدرسہ کے اساتذہ پر اس کا اثر اچھا نہیں ہوا ہوگا۔ چنانچہ میں نے اس تاثر کا اظہار کر بھی دیا تھا۔ لیکن وہ اپنے اصول اور اپنی رائے میں بہت سخت تھے مصلحت کوشی یا کسی ایسی بات پر مصالحت جو اُن کے نزدیک غلط ہو اُن کے لئے بالکل ناممکن تھی۔ غرض کہ معاملات سجھتے ہی رہے اور مولوی صاحب کو وہاں چین سے رہنا نصیب نہیں ہوا البتہ اس قیام رام پور کے زمانہ میں یہ ایک مفید کام ہو گیا تھا کہ مدرسہ کے لئے ایک جامع اور قدیم و جدید ضروریات پر حاوی ایک نصاب بنا کر پیش کر دیا تھا اور مدرسہ کے انتظام کے سلسلہ میں ایک نئے دستور کی تشکیل بھی کی تھی۔ معلوم نہیں ان دونوں کا کیا انجام ہوا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا جون ۱۹۴۷ء تک رام پور میں قیام رہا۔ اس کے ڈیڑھ ماہ بعد ملک کا بٹوارہ ہو گیا۔ مولوی صاحب کے صاحبزادہ گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازم تھے۔ انھوں نے پاکستان کے لئے اپنا نام دیا تھا۔ مولوی صاحب کے آگے پیچھے سوائے اس ایک بیٹے اور اس کی اولاد اور بیوی کے کوئی اور تھا ہی نہیں۔ اس لئے اس بڑھاپے اور ضعیفی میں اگر یہاں رہتے بھی تو کس کے سہارے رہتے۔ اس لئے اپنا ذاتی مکان اور جائداد چھوڑ چھاڑ پاکستان چلے گئے۔ پہلے کچھ دنوں راولپنڈی میں قیام رہا۔ اس کے بعد ، دسمبر ۱۹۴۸ء کو کراچی پہنچے۔ اور آخر اگست ۱۹۵۴ء میں یہیں راہیٔ ملک عدم ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

حلیہ | مولوی صاحب نسلاً راجپوت تھے اس لئے ویسی قد و قامت اور ڈیل ڈول تھا۔ لانبا قد۔ سانولا سلونا رنگ۔ کشادہ پیشانی۔ بڑا سر۔ بھری ہوئی اور گنجان ڈاڑھی ہنسلی چوڑی سینہ

کشادہ۔ دوہرا بدن۔ آنکھیں روشن۔ نہ بہت بڑی اور نہ بہت چھوٹی۔ دہانہ فراخ۔ جسم ورزشی اور کسرتی معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ کسرت تو کیا کرتے ٹہلنے تک کے عادی نہیں تھے۔ ممکن ہے جوانی میں عادت رہی ہو۔ بڑھاپے میں بھی جوانوں کے سے دم خم رکھتے تھے۔ طبعاً ہنسوڑ تھے قہقہہ لگاکر ہنستے تھے۔ وضع کے نہایت پابند تھے۔ گھر میں قمیص اور پاجامہ پہنے بیٹھے رہتے تھے۔ کالج ہمیشہ اس طرح جاتے کہ سر پر سیاہ رنگ کی اونچی باڑھ کی قلباق ٹوپی۔ جسم پر شیروانی اور پاؤں میں کبھی بوٹ اور کبھی گرگابی یا پمپ۔ میں نے جب سے دیکھا ہے ہاتھ میں چھڑی ضرور رکھتے تھے موسم سرما میں فلالین کا چھوٹی مہریوں کا پاجامہ اور چسٹر بھی پہنتے تھے۔ مجموعی حیثیت سے وجیہہ اور چہرہ بارعب تھا۔

عام اخلاق و عادات کشمیری گیٹ دہلی میں کالج کی پرانی عمارت کے پاس گلی راجایان کے نام سے ایک چھوٹی سی گلی ہے اس میں ایک مکان لے رکھا تھا جس کو بعد میں خرید بھی لیا تھا اس مکان میں گلی کی جانب ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ بس مولوی صاحب کا کھانے کا کمرہ۔ ملاقات کا کمرہ۔ سونے کا کمرہ۔ مطالعہ کا کمرہ۔ جو کچھ بھی تھا لے دے کے یہی ایک کمرہ تھا۔ باقی سارا مکان زنانخانہ تھا بیوی کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے بعد کوئی اور شادی نہیں کی۔ زنانخانہ بیٹے اور بہو کے لئے وقف تھا۔ اس چھوٹے سے کمرہ میں ایک کافی چوڑی چارپائی پڑی رہتی تھی اور کونہ میں دو کرسیاں اور صوفہ نما تخت سا بچھا رہتا تھا۔ چارپائی کے داہنی طرف ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر بجلی کا لمپ اور کتابیں رہتی تھیں اس کے علاوہ اوپر تلے تین چار تختے اور تھے ان پر بھی کتابیں اور کاغذات بے ترتیبی کے ساتھ رکھے رہتے تھے۔ ایک طرف ایک تپائی پر پاندان رہتا تھا کوئی آگیا یا پان کھانا ہوا تو اٹھ بیٹھے ورنہ وہیں پلنگ پر لیٹے لیٹے کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ حد یہ ہے کہ سخت گرمی کے دنوں میں بھی رات کو اسی کمرہ میں بجلی کے پنکھے کے نیچے سوتے تھے دیوار سے لگا ایک تختہ کھڑا رہتا تھا جو ان کا مصلی تھا۔ نماز پڑھنی ہوئی اسے بچھا لیا اور پھر کھڑا کر دیا کھانے میں زیادہ تنوع نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جو کچھ کھاتے تھے اچھا کھاتے تھے خالص گھی کا اہتمام

کرتے تھے کھانا پکا ہوا عمدہ قسم کا ہوتا تھا۔ خود بھی اس فن کے ماہر اور نقاد تھے اور کبھی کبھی شوقیہ پکاتے تھے۔ میووں کا بہت شوق تھا۔ ہر موسم کا میوہ خود بھی خوب کھاتے اور بچوں کو بھی کھلاتے تھے اس طرح ایک متوسط درجہ کی صاف ستھری زندگی بڑے چلن اور قرینہ سے بسر کرتے تھے۔ لیکن باہر یہ حال تھا کہ کالج میں جب کبھی کسی بات کے لئے چندہ ہوتا تھا تو فہرست میں پروفیسروں میں زیادہ سے زیادہ رقم جس کے نام کے آگے ہوتی تھی اپنے نام کے آگے بھی وہی رقم لکھتے تھے ریل کا سفر کرتے تو فرسٹ سیکنڈ سے کم میں نہیں کرتے تھے۔ دلی میں کہیں جاتے تو پورا تانگہ کرایہ کر کے جاتے تھے نماز روزہ کے بڑے پابند تھے زکوٰۃ ہر سال پابندی سے نکالتے تھے اور صدقہ خیرات بھی کرتے تھے لیکن اس طرح کہ ایک ہاتھ کی خبر دوسرے کو نہیں ہونے پاتی تھی اور کالج کے اندر بھی اسلامی شعائر کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے تھے کالج میں ہر بدھ کو شب میں اسٹاف ڈنر ہوتا ہے جس میں باہر کے تین چار مہمان بھی بہت اونچی حیثیت کے مدعو ہوتے ہیں مولوی صاحب اس قسم کے مواقع پر کھاتے تو تھے کانٹے اور چھری سے ہی لیکن انگریزوں کے برخلاف اس طرح کہ کانٹا داہنے ہاتھ میں رکھتے تھے شروع شروع میں بعض لوگوں کو یہ بات کھلی ہوگی لیکن بعد میں جب دیکھا کہ امریکن بھی اسی طرح کھاتے ہیں تو پھر کوئی تعجب نہیں ہوتا تھا۔

وضع داری اور شرافت | وضع داری اور شرافت میں یہ عالم تھا کہ اس طرح کے لوگ دنیا میں کم ہی ہوں گے خواجہ عبدالمجید صاحب دہلوی سے بڑا دوستانہ تھا ہفتہ میں منگل کے دن مولوی صاحب خواجہ صاحب کے ہاں جاتے تھے اور جمعہ کو خواجہ صاحب یہاں آتے تھے۔ گرمی ہو۔ برسات ہو۔ جاڑا ہو کوئی موسم اور کوئی حال ہو بغیر کسی ناگزیر مانع کے ناممکن تھا کہ مولوی صاحب دلی میں ہوں اور اُن کے اس معمول میں فرق آجائے فرماتے تھے کہ میں دوستی بہت کم کرتا ہوں۔ کیوں کہ جانتا ہوں کہ اس کے فرائض و واجبات کا نباہنا آسان نہیں ہے۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی عید بقر عید پر تو لازمی طور پر مولوی صاحب کے ہاں جاتے ہی تھے یوں تیسرے چوتھے مہینہ بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کے لئے ضروری تھا کہ اُس کے جواب میں وہ خود بھی آئیں چنانچہ وہ بھی

اسی رفتار سے دفتر ندوۃ المصنفین میں تشریف لاتے تھے۔ شرافت کا یہ عالم تھا کہ پیٹھ پیچھے بھی کسی کا تذکرہ کرتے تو اُس کی حیثیت کے مطابق القاب و آداب کے ساتھ اُس کا نام لیتے تھے مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انھوں نے کبھی مجھ سے مولانا عتیق الرحمن صاحب کی خیریت پوچھی ہو اور بغیر لفظ "جناب" کے صرف "مفتی صاحب" کہا ہو علماء کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے اور اُن سے بہت نیاز مندی سے ملتے تھے۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خاص تعلق تھا۔ آمد و رفت کی راہ و رسم نہیں تھی لیکن جب کبھی ملتے تھے جھک کر فروتنی سے ملتے تھے اُمرا اور رؤسا سے ملنے میں تکلف ہوتا تھا۔ ارباب علم سے مل کر انھیں حقیقی راحت اور خوشی ہوتی تھی۔

طبیعت بے حد غیور اور خود دار واقع ہوئی تھی۔ مجال نہیں تھی کہ کبھی کسی نازک سے نازک موقع پر بھی اپنی حاجت یا ضرورت کسی پر ظاہر کریں اور اُس سے مدد کے خواستگار ہوں کراچی پہنچنے کے بعد ان کو مکان کے سلسلہ میں کافی تکلیفیں ہوئیں اگرچہ وہاں اُس زمانہ میں وزیر مہاجرین ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھے جو خود مولوی صاحب کے بڑے سعادت مند شاگرد تھے اور ان کے علاوہ سینکڑوں شاگرد اور دوست ادر تھے جو مختلف محکموں میں بڑے بڑے عہدوں پر تھے لیکن مولوی صاحب ان سے مدد تو کیا مانگتے انھوں نے سرے سے ان لوگوں سے ملنا جلنا ہی بند کر دیا تھا کیوں کہ اُن سے ملنے کے معنی بھی امداد طلبی کے مرادف تھا۔ کوئی معاملہ یا مشورہ ہوتا تو اُس پر کافی غور و خوض کرتے اور آخر جب ایک رائے قائم کر لیتے تو پھر اُس سے ہٹنا اُن کے لئے ممکن نہ تھا کالج کی اسٹاف میٹنگ۔ یونیورسٹی کی اکاڈمک کونسل یا کسی اور میٹنگ میں جو بات اپنے نزدیک حق ہوتی تھی اُسے برملا اور پوری قوت کے ساتھ کہتے تھے اور اس بارہ میں بڑی سے بڑی شخصیت کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اُن کی صاف گوئی بسا اوقات اُن کے لئے مشکلات کا باعث بن جاتی تھی لیکن وہ مردانہ وار اُس کا مقابلہ کرتے تھے اور اپنے طریق عمل پر پشیمان نہیں ہوتے تھے۔

اپنے مرتبہ اور علم کا وقار ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ عمر بھر کبھی ٹیوشن نہیں کیا ایک مرتبہ پرنسپل صاحب کی درخواست پر ایک سول آفیسر انگریز کو ہفتہ میں تین دن عربی پڑھانی منظور کرلی

تھی۔ جب مہینہ پورا ہوا تو انگریز نے کہا میں کیا دے دوں۔ مولوی صاحب نے کچھ لینے سے انکار کیا۔ لیکن جب اُدھر سے اصرار زیادہ ہوا تو انھوں نے کہا اچھا ایسا ہی ہے تو سو روپیہ دے دیجئے۔ یہ سُن کر انگریز بہت خوش ہوا اور بولا کہ آج آپ پہلے شخص ملے ہیں جو اپنے علم کے قدر داں ہیں ورنہ آپ سے پہلے کسی مولوی نے ۲۰ - ۲۵ روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں مانگا۔

ان کے پاس متعدد یونیورسٹیوں کے مختلف امتحانات کے پرچے ہمیشہ رہتے تھے اور اس سلسلہ میں سفارشوں کی بھرمار بھی رہتی تھی لیکن وہ سفارش پر کسی کو پاس کرنا بدترین اخلاقی معصیت سمجھتے تھے اور اس سے ہمیشہ مجتنب رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب تشریف لائے بڑی عقیدت اور ارادت سے ملے اور عطر کی چند شیشیاں بطور تحفہ پیش کیں۔ مولوی صاحب نے ہر چند معذرت کی لیکن نہ مانے۔ آخر لے کر رکھ لیں۔ پانچ چھ دن کا غوطہ دے کر یہ صاحب پھر دوبارہ حاضر ہوئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ایک امیدوار کی سفارش کی۔ یہ سنتے ہی مولوی صاحب فوراً اُٹھے عطر کی شیشیاں لا کر ان کو واپس کیں اور فرمایا " لیجئے! یہ ہے آپ کا تحفہ! کیا اس کے بدلہ میں آپ میری امانت اور دیانت خریدنی چاہتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا " بس فوراً تشریف لے جائیے میں آپ سے مزید گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا۔

میرا تعلق | سنہ ۳۱ء میں مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی کے تعلق سے جب میں دلی آیا تو چوں کہ مولوی صاحب سے ادبی اور علمی ارادت و عقیدت پہلے سے تھی اس لئے اُن کی خدمت میں آنا جانا شروع کر دیا۔ سنہ ۳۲ء میں جب میں نے بی۔ اے پاس کر لیا تو میمن عبدالعزیز صاحب سے استفادہ کی غرض سے ارادہ کیا کہ علی گڈھ جا کر ایم۔ اے عربی میں داخلہ لے لوں لیکن مولوی صاحب سے اس کا ذکر آیا تو بڑی شفقت فرمایا کہ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب سے پڑھ لینے کے بعد اب تم کو عربی میں اور کس سے پڑھنا ہے۔ اب تم مطالعہ کرو اور اُس میں لگے رہو تم خود میمن بن جاؤ گے۔ اس کے بعد فرمایا کہ میں دو سال کے بعد کالج سے سبکدوش ہو رہا ہوں اگر تم دہلی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کر لو تو میں تم کو اپنی جگہ رکھا دوں گا اور مجھ کو بھی خوشی ہو گی کہ میرا جانشین کوئی نااہل نہیں ہو گا۔ مولوی صاحب نے یہ بات کچھ ایسی محبت

اور سوز سے کہی تھی کہ دل میں اُتر گئی اور میں نے ہاں کرلی۔ اس کے بعد وہ مجھ کو سینٹ اسٹیفنس کالج کے پرنسپل اس۔کے سین صاحب کے پاس لے کر پہنچے اور اُن سے اُسی وقت صاف کہہ دیا کہ یہ کے کالج کے ایم۔اے میں صرف ڈگری لینے کی غرض سے داخلہ چاہتے ہیں ورنہ ان کو پڑھنا وڑھنا کچھ نہیں ام۔اے کلاس کو اب بھی پڑھا سکتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ میں نے ہی خود اس کو اس پر آمادہ کیا ہے۔تاکہ کل میرے بعد یہ میرا جانشین ہو سکے۔پرنسپل سین صاحب ہنسے بھی اور خوش بھی ہوئے اور اب میں باقاعدہ مولوی صاحب کا شاگرد ہو گیا۔مولوی صاحب نے جو بات شروع میں کہی تھی وہ برابر ان کے دل کو لگی رہی اور انھیں اس وقت تک چین نہیں آیا جب تک کہ انھوں نے میرا تقرر اپنی جگہ پر کروا نہیں لیا۔میرا تعلق اگرچہ استادی شاگردی کا تھا لیکن میں کیا کہوں کہ وہ کس درجہ مجھ پر شفیق تھے اور کس طرح میری ایک ایک بات کا خیال رکھتے تھے ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں، ستمبر کو جب میرا سب کچھ لٹ گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ انھیں دنوں میں مجھ کو کپکپی کے ساتھ بخار آ گیا تو میں اور مولانا عتیق الرحمٰن صاحب دونوں میں سے کسی کے پاس ایک چادر تک نہیں تھی کہ میں اُس لرزہ کی حالت میں اوڑھ لیتا۔بالآخر مولانا عتیق الرحمٰن صاحب ایک دوست سے چادر مانگ کر لائے اور مجھ کو اڑھائی مولوی صاحب کا محلہ اس لوٹ مار سے محفوظ رہا تھا۔کچھ دنوں کے بعد مولوی صاحب مجھ سے ملے تو مجھ کو دیکھ کر اُن کا جی بھر آیا۔سینہ سے لگا لیا اور اسی وقت تانگہ میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئے وہاں پہنچ کر زنان خانہ میں پردہ کرایا اور ایک بڑے سے کمرہ میں جہاں اُن کا سب سامان اسباب رکھا تھا۔لے جا کر کھڑا کر دیا اور آبدیدہ ہو کر فرمایا۔اب یہ سب سامان اور گھر تمہارا ہے۔تم ہرگز خیال مت کرنا کہ تمہارا گھر لٹ گیا ہے۔میں نے بچشم نم اُن کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔سب انتظام ہو جائے گا وہ نہ مانے اور چلتے چلتے پھر بھی چند چیزیں میرے ساتھ کر دیں۔انھیں چیزوں میں شیروانی کا ایک عمدہ باوضع کپڑا بھی تھا جو انھوں نے اپنے لئے خرید رکھا تھا کیا عجیب اتفاق ہے کہ اس واقعہ کے ٹھیک چھ سال کے بعد جب مجھ کو حضرت مرحوم کی وفات کی اطلاع کا خط ملا ہے تو میں اُس وقت انھیں کے عطا فرمودہ کپڑے کی شیروانی پہنے دفتر میں بیٹھا تھا اور ایک صاحب اس کپڑے کی تعریف

کر رہے تھے تو میں اُن کو وہی واقعہ سنا رہا تھا کراچی میں اُن کو میرے کلکتہ آنے کی خبر ملی تو مبارک باد کا خط لکھا اور ساتھ ہی تحریر فرمایا کہ تم سر ڈینی سن راس کی کرسی پر بیٹھے ہو۔ لیکن ڈینی سن راس دوسروں سے کام لینا خوب جانتا تھا اور خود کام کم کرتا تھا۔ تم سے امید ہے کہ خود بھی کام خوب کروگے اور دوسروں سے بھی کام خوب لوگے۔ آخر میں بالکل معذور ہو گئے تھے لیکن اس پر بھی صرف خیریت طلبی کے لئے ایک سطری خط برابر لکھتے رہتے تھے۔ محض اُن سے ملنے کی غرض سے بارہا کراچی کا ارادہ کیا لیکن مجھ کو تو کراچی جانا آج تک نصیب نہیں ہوا اور وہ ملکِ عدم کو چل بھی دیئے

شاہراہِ عدم چہ ہموار ست   چشم بر بستہ میتواں رفتن

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

تفسیر مظہری

عربی کی ایک لاجواب تفسیر

تفسیر مظہری اپنی غیر معمولی خصوصیات کے لحاظ سے بہترین تفسیر سمجھی گئی ہے۔ اس عظیم الشان تفسیر کے مطالعہ کے بعد تفسیر کی کسی کتاب کے مطالعہ کی ضرورت نہیں رہتی اس میں وہ سب کچھ ہے جو دوسری تفسیروں میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے مدلول کلامِ الٰہی کی تسہیل و تفہیم تاریخی واقعات کی تحقیق و تدقیق۔ احادیث کے استقصاء۔ احکام فقہی کی تفصیل و تشریح اور لطائف و نکات کی گل پاشی میں "تفسیر مظہری" کے درجہ کی کوئی کتاب عربی زبان میں موجود نہیں امام وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کے کمالات علمی کا یہ عجیب و غریب نمونہ ہے۔ الحمد للہ کہ اب اس بے مثال تفسیر کی تمام جلدیں طبع ہو گئی ہیں۔ قیمت تا بحد امکان کم سے کم رکھی گئی ہے پوری کتاب کی دس ضخیم جلدیں ہیں۔

ہدیہ غیر مجلد:۔ جلد اول سات روپے۔ جلد ثانی سات روپے۔ جلد ثالث آٹھ روپے۔ جلد رابع پانچ روپے۔ جلد خامس سات روپے۔ جلد سادس آٹھ روپے۔ جلد سابع سات روپے۔ جلد ثامن سات روپے جلد تاسع پانچ روپے۔ جلد عاشر پانچ روپے۔ ہدیہ کامل چھیاسٹھ روپے۔ رعایتی ساٹھ روپے

جاحظ کی کتاب الحیوان

(متوفی ۲۵۵ھ)

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق

(استاذ ادبیات عربی - دہلی یونیورسٹی)

(۲)

بلعنبر کا سانپ

بلعنبر[1] کے ریگستان میں ایک قسم کا سانپ تھا جو عجب طریقہ سے چڑیوں اور چھوٹے پرندوں کا شکار کرتا تھا۔ دوپہر کے وقت جب گرمی خوب تیز ہوجاتی اور ریت آگ کی طرح جلنے لگتی تو یہ سانپ اپنی دم ریت میں چھپالیتا اور پھر نیزے یا لکڑی کی طرح سیدھا کھڑا ہوجاتا، چھوٹے پرندے اور ٹڈیاں آتیں اور چوں کہ بظاہر ان کے سامنے ایک کھڑی ہوئی لکڑی ہوتی اور جلتی ریت پر بیٹھنا ممکن نہ ہوتا وہ سانپ کے سر پر بیٹھ جاتیں، سانپ ان کو پکڑ لیتا، اگر ٹڈی ہوتی یا کوئی چھوٹا پرندہ جس سے اس کا پیٹ نہ بھر سکتا تو وہ اس کو نگل جاتا اور بدستور کھڑا رہتا اور اگر کوئی چڑیا بیٹھتی جس سے اس کا پیٹ بھر سکتا تو وہ اس کو کھالیتا اور لوٹ جاتا۔[2]

صقلبی ترکوں کے ملک میں دیکھا گیا ہے کہ سانپ گائے کے پاس آتا ہے اور اس کی ران اور گھٹنوں سے کونچوں تک لپٹ جاتا ہے، پھر گائے کے سینہ سے ہوتا ہوا اس کے تھنوں تک منہ لے جاتا ہے اور گائے بے حرکت مبہوت کھڑی رہتی ہے، سانپ اس کے تھن چوستا رہتا ہے، جب گائے کی جان پر آبنتی ہے تو وہ تھن چھوڑتا ہے، کہتے ہیں کہ ایسی گائے جس کے

---

[1] معجم البلدان یاقوت میں بلعنبر نامی ریگستان کا ذکر نہیں ہے غالباً یہ کسی دوسرے لفظ کی بگڑی ہوئی شکل ہے

[2] کتاب الحیوان ۴/۸۳۔

تھنوں سے سانپ نے دودھ پیا ہو یا تو مر جاتی ہے، یا اس کے تھنوں میں ایسا روگ لگ جاتا ہے جو مشکل سے اچھا ہوتا ہے۔ سانپ کو دودھ بہت پسند ہے، جب کھلے برتن میں سانپ دودھ دیکھتا ہے تو اس میں منہ ڈال کر پیتا ہے۔ کبھی پیا ہوا دودھ پیٹ سے اُلٹ کر برتن میں گر پڑتا ہے ایسے دودھ کو اگر کوئی پئے تو اس کو نقصان پہنچتا ہے۔ سانپ سے ملتے جلتے جتنے جانور ہیں سانپ ان سب سے طاقت میں بہت زیادہ ہوتا ہے اگر وہ تھوڑا سا بھی بل میں گھس جائے تو ایک طاقتور آدمی دونوں ہاتھوں سے دُم پکڑ کر اس کو باہر نہیں کھینچ سکتا، اس کے جسم کی گرفت زمین پر اتنی سخت ہوتی ہے، حالانکہ اس کے نہ پیر ہوتے ہیں، نہ ناخن، نہ پنجے، کبھی اُس کی دُم کا ایک حصہ ٹوٹ کر کھینچنے والے کے ہاتھ میں رہ جاتا ہے، اُس کی دُم پھر نکل آتی ہے۔ عجب بات یہ ہے کہ اگر اُس کی کچلی کاٹ دی جائے تو تین دن سے کم میں پھر نکل آتی ہے...... سانپ کی زہریلی کچلی کو بے اثر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بڑے لیمو یا چکوترہ کا گودا (حماض الاترج) ڈال کر دونوں جبڑوں کو بھینچا جائے، اُس کے زیر اثر کافی دن تک سانپ کے کاٹنے سے آدمی نہیں مرتا ہے...... سانپ نہ آنکھیں گھما سکتا ہے نہ کسی چیز کو چبا سکتا ہے۔ اگر کھائی ہوئی چیز میں ہڈی ہوتی ہے تو درخت کے تنہ یا باہر اُبھرے ہوئے پتھر پر لپیٹ جاتا ہے، جس سے وہ ہڈی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے......

اس کے جسم کی گرفت اور دبانے کی غیر معمولی قوت اور ریڑھ کی ہڈیوں کی سختی کا راز یہ ہے کہ اس کے تیس ۳۰ پسلیاں ہوتی ہیں۔ سانپ قدرتی موت کبھی نہیں مرتا، اور اس سے زیادہ کوئی جانور بھوکا رہنے پر قادر نہیں ہے...... لوگوں کا خیال ہے کہ تین قسم کے سانپوں کے کاٹے کو نہ جادو سے فائدہ ہو سکتا ہے نہ علاج سے اور یہ ہیں ثعبان، اَفعی اور ہندی (کوبرا)، ان کے علاوہ سانپوں کے کاٹنے سے جو موت ہوتی ہے اس کا سبب اعصابی خوف ہوتا ہے [1]

---

[1] کتاب الحیوان ۶ / ۳۸، ۱۸۱، ۱۶۴

(د) شتر مُرغ

شتر مرغ عجیب خصائص کا مظہر ہے، اس کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ وہ پتھر کھاتا ہے جو اس کے معدہ میں پانی کی طرح پگھل جاتا ہے، پتھر کھاتے وقت اس کو یقین ہوتا ہے کہ وہ مزے دار چیز ہے اور یہ کہ وہ اس کو ہضم کرے گا اور اس سے غذا حاصل کرے گا، شتر مرغ کے اس فعل میں دو[2] اعجوبے ہیں: ایک تو ایسی چیز کو غذا بنانا جو غذا بننے کی صلاحیت نہ رکھتی ہو، دوسرے ایک ایسی چیز کو مزے دار خیال کرنا اور ہضم کر لینا جو اگر کھلنے کی کسی چیز کے ساتھ ابد تک پکائی جائے تو گلے نہ حل ہو...... اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ انگارا کھاتا ہے جو پیٹ میں جا کر بجھ جاتا ہے لیکن اس کو جلاتا نہیں۔ ابو اسحاق نظام[1] کا بیان ہے اور اس لئے شبہ سے بالاتر کہ انھوں نے محمد نامی شخص کو دیکھا کہ وہ پتھر آگ میں سرخ کر کے شتر مرغ کے سامنے ڈالتا تھا اور شتر مرغ اس کو نگل جاتا تھا، نظام کہتے ہیں کہ میں نے محمد سے کہا تھا کہ لکڑی کا انگارہ ہلکے اور ڈھیلے اجزا کا ہوتا ہے اور جب حلق کی تری سے مل کر ایک ایسی جگہ منتقل ہوتا ہے جہاں ہوا نہ پانی جائے تو جلد بجھ جاتا ہے اس کے برخلاف پتھر چونکہ بھاری اور ٹھوس اجزا سے مرکب ہوتا ہے بہت دیر تک گرمی کو روکے رکھتا ہے اور دیر میں بجھتا ہے، لہذا تم پتھر سرخ کر کے شتر مرغ کے سامنے ڈالو۔ شتر مرغ نے پہلا سرخ کیا ہوا پتھر کھا لیا پر مجھے اطمینان نہ ہوا، میں نے دوسرا اور پھر تیسرا پتھر سرخ کرا کے ڈلوایا، شتر مرغ نے وہ بھی کھا لیا۔ میں نے کہا لاؤ ایک تجربہ اور کریں، دیکھیں اس کو لوہا بھی ایسا ہی مرغوب ہے جیسے پتھر، بعض احمق اور بدحواس تک اس تجربہ سے مجھے روکتے رہے، میں نے عزم کر لیا تھا کہ شتر مرغ کو ذبح کر کے اس کے پیٹ اور معدہ کا جائزہ لوں گا، بہت ممکن ہے لوہا وہاں موجود ہو، نہ تحلیل ہوا ہو نہ براز کے ساتھ نکلا ہو، محمد کے ایک دوست نے چھری لی، اس کو گرم کیا اور شتر مرغ کے سامنے ڈال دیا، وہ کھا گیا مگر نگلتے

---

[1] مشہور معتزلی لیڈر

میں چھری کا نکیلا سرا اس کے نرخے سے نکل پڑا اور وہ مر کر زمین پر آ رہا۔[۱]

شتر مرغ کی ایک اور عجیب خصوصیت یہ ہے کہ باوجودیکہ اس کی ہڈیاں موٹی ہوتی ہیں اور وہ نہایت تیز بھاگتا ہے۔ اس کی ہڈیوں میں گودا نہیں ہوتا ..... لوگ اس کو پالتے بھی ہیں، اس میں بڑا خطرہ رہتا ہے، کیوں کہ گھر کی لڑکیوں کے کان یا گلے میں بندا بالی یا قیمتی پتھر کا زیور دیکھ کر شتر مرغ کھانے کے لیے اس کو نوچ لیتا ہے اور ان کے کان اور گردن زخمی کر دیتا ہے۔[۲]

(۵) ہاتھی

اگر کسی عورت کو شہد میں ملا کر ہاتھی کی لید دی جائے تو اس کے کبھی بچہ نہیں پیدا ہوتا جیسا کہ اگر لید کسی درخت پر لٹکا دی جائے تو اس سال پھل نہیں آتے۔ ہند کی رنڈیاں حمل سے بچنے اور شبانہ ملاقاتیوں کو برقرار رکھنے کے لئے لید کھاتی ہیں ..... لید کے اس عمل کو حیرت کی نظر سے نہ دیکھنا چاہیے، اس سے زیادہ حیرتناک باتیں کہی گئی ہیں مثلاً یہ کہ جس شخص کے پتھری ہو وہ اگر گدھے کی گرم گرم لید نچوڑے اور اس کا عرق پیے تو اکثر دبیشتر اس کی پتھری پیشاب کے ساتھ نکل جاتی ہے ..... ہمارے وقت کی عورتیں حیض کے زمانہ میں ایک مثقال سرمہ کھا لیتی ہیں تو بچہ نہیں ہوتا، مگر میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ اس نے سرمہ کھایا اور پھر بھی اس کے بچہ ہوا۔ کتے کا پاخانہ اگر سفید رنگ کا ہو اور اس نے صرف ہڈی کھائی ہو اور گوشت نہ کھایا ہو تو حلق کی بیماری ذبحہ کے لئے بہت مفید ہے، انسان کا پاخانہ بھی اس مرض میں مفید ہے۔ چوہے کی مینگنی اگر قبض میں بچوں کی آنکھ میں لگائی جائے تو قبض جاتا رہتا ہے ..... سارے زبان دار جانوروں کی زبان کی جڑ اندر کی طرف ہوتی ہے اور سرا باہر کی طرف، مگر ہاتھی کی زبان کا سرا اندر کی طرف ہوتا ہے اور جڑ باہر کی طرف۔ اہل ہند کہتے ہیں کہ ہاتھی کی زبان پلٹی ہوتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا اور اس کو بول چال کی مشق

---

[۱] کتاب الحیوان ۴/ ۱۰۷ [۲] کتاب الحیوان ۴/ ۱۱۰ -

کرائی جاتی تو وہ بولنے لگتا۔ میٹھے پانی میں جو مچھلی رہتی ہے اس کے زبان اور دماغ ہوتا ہے لیکن کھاری پانی والی مچھلی کے نہ زبان ہوتی ہے نہ دماغ، ہر چبانے والا جاندار نچلا جبڑ ہلاتا ہے، لیکن مگر مچھ اوپر کا جبڑا ہلاتا ہے۔ تمام حیوانات کے صرف بالائی پلک ہوتے ہیں، مگر انسان کے اوپر نیچے دونوں پلک ہوتے ہیں، ہر سینہ والے حیوان کا سینہ تنگ ہوتا ہے مگر انسان کا کشادہ ہوتا ہے اور صرف مرد انسان اور نر ہاتھی ایسے جاندار ہیں جن کے دودھ ہوتے ہیں..... ہاتھی سب سے چوڑا چکلا جانور ہے اور باوجود بڑی جسامت کے نہایت دل کش، خوش قامت اور وجیہ ہوتا ہے..... بوجھ اٹھانے اور ڈھونے کی اس میں سارے جانوروں سے زیادہ توانائی ہوتی ہے اس کی ایک حیرت ناک خصوصیت یہ ہے کہ اس قدر بھاری بھرکم ہونے کے باوجود وہ اگر کسی کے پیچھے سے گذر جائے تو اس کو آہٹ تک نہیں ہوتی...... ہاتھی اور گینڈے (کرگدن) سے زیادہ کسی جانور کا زمانہ حمل نہیں ہوتا۔ صفوان بن صفوان کی روایت ہے کہ ہند کے لوگ طرح طرح سے ہاتھی کو سدھاتے ہیں اور جنگی تربیت دیتے ہیں مثلاً وہ چوڑے پھل والی نہایت تیز بڑی تلوار اس کی سونڈ میں باندھ دیتے ہیں اور اس کو تلوار سے آگے پیچھے، اوپر نیچے، مارنے کی مشق کراتے ہیں اور وہ تلوار اتنی اونچی کر لیتا ہے کہ دوسرے ہاتھیوں کے فیل بان تک اس کی زد میں آجاتے ہیں..... کہا جاتا ہے کہ حیوانات میں ہاتھی کا عضوِ تناسل سب سے بڑا ہوتا ہے اور ہرن کا سب سے چھوٹا، ہاتھی کی سونڈ عجائبات میں سے ہے، وہ اس کی ناک بھی ہے ہاتھ بھی، اس کے ذریعہ کھاتا ہے پیتا ہے، اس کے ذریعہ لڑتا اور مارتا ہے، اسی سے چیختا ہے گو کہ اس کی چیخ اس کی جسامت کے لحاظ سے ہلکی ہوتی ہے..... ہاتھی پانی میں خوب تیرتا ہے اس کی عمر سو سے دو سو سال تک ہوتی ہے صاحب المنطق (ارسطو) نے اپنی کتاب الحیوان میں لکھا ہے کہ ہاتھی کا بچہ ماں کے پیٹ سے مع دانت کے نکلتا ہے کیوں کہ وہ بہت عرصہ تک پیٹ میں رہتا ہے، یہ رائے صحیح ہو سکتی ہے

بعض مشہور عورتوں کے بچے مع دانتوں کے پیدا ہوئے ہیں"۔

(و) ظربان

ظَرِبَان نامی قطبی بلی کا گوز نہایت متعفن ہوتا ہے، بلی کو اس بات کا شعور ہوتا ہے اس لئے وہ گوز کو بطور ہتیار استعمال کرتی ہے، جس طرح کہ (حُبَارٰیؔ) باز کے مقابلہ میں بیٹ کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ظربان گوہ کے بل میں جہاں اس کے بچے یا انڈے ہوتے ہیں گھس جاتی ہے اور بل کے سب سے تنگ حصہ میں پہنچ کر اس کو اپنے ہاتھوں سے بند کردیتی ہے، پھر اپنا پچھلا حصہ گوہ کی طرف کرکے تین گوز مارتی ہوگی کہ گوہ کو چکر آنے لگتے ہیں اور وہ بے ہوش ہوکر گر پڑتا ہے، ظربان پہلے اس کو کھاتی ہے، پھر اس کے سب بچوں کو چٹ کرجاتی ہے۔ عربوں کا کہنا ہے کہ وہ اگر کبھی اونٹوں کی آرام گاہ میں آگھسے تو اس کے دو تین گوزہی سے اونٹ آرام گاہ چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور بڑی مشکل سے لوٹائے جاتے ہیں۔[۵۳]

۶۔ جن جن جانوروں کا کتاب میں ذکر ہوا ہے ان کے بارے میں مصنف کو جو شعر یاد تھے یا ہم عصر علماء سے ان کو مل سکے، وہ انھوں نے بیان کردئے ہیں، ان اشعار کی تعداد بہت ہے اور میرا خیال ہے کسی دوسری مطبوعہ کتاب میں جانوروں سے متعلق اشعار کا اتنا بڑا ذخیرہ شاید یکجا نہ مل سکے گا۔ ان اشعار میں جانوروں کی بناوٹ یا قدرتی زندگی پر تو کوئی روشنی ڈالی نہیں گئی ہے، زیادہ تر ایسا ہوا ہے کہ ان کی کسی انفرادی صفت، یا مخصوص عادت میں کسی انسان کو ہجو، تحقیر یا تعریف کے لئے شریک بنایا گیا ہے، یا شاعر نے جانور کی کسی انوکھی صفت، صورت یا آواز سے متاثر ہوکر شعر کہے ہیں۔ یا اس کا مقصد جانور کے ذریعہ خالق کی حکمت وعظمت ظاہر کرنا ہے۔ اشعار کے علاوہ کتاب میں ایسی بہت سی ضرب الامثال بھی موجود ہیں جن کا موضوع جانور یا ان کی کوئی نمایاں صفت ہے بہت سے شعر ایسے بھی ہیں جن میں نہ جانوروں کا ذکر ہے، نہ ان کی کسی صفت کا اظہار، بلکہ

---

[۵۲] یہ مرغابی کے برابر زرد و سیاہ پرندہ ہے جو عربستان کے صحراؤں میں پایا جاتا ہے۔ [۵۳] کتاب الحیوان ۱/۱۰۸

جانور کا صرف نام آگیا ہے، اس کے علاوہ مصنف کسی قصیدہ، نظم یا قطعہ کے وہ اشعار ہی قلم بند نہیں کرتا جو براہ راست جانور سے متعلق ہوتے ہیں بلکہ بہت سے غیر متعلق شعر بھی نقل کر دیتا ہے۔ بیان کردہ اشعار عام طور پر غریب الفاظ اور مشکل معانی پر مشتمل ہوتے ہیں، اور مصنف ایسے الفاظ اور معانی کو واضح کرتا جاتا ہے اور اپنے بیان کردہ مطلب کی توثیق کے لئے بہت سے دوسرے شعر بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں اشارہ کیا، کتاب میں جانوروں کے علاوہ بہت سا مواد ایسا ہے جس کو ادبی، لُغوی، اجتماعی عنوانوں کے تحت رکھا جا سکتا ہے، مثلاً مصنف نے رسول اللہ، صحابہ، اور تابعین کی آراء بیان کی ہیں، اختلافی، کلامی اور عقلی مسائل سے بحث کی ہے، بہت سی دلچسپ حکایتیں، لطیفے، مضحک قصے، بہت سے بصیرت افروز حقایق، خاصی تعداد جنسی و مبتذل واقعات کی پیش کی ہے۔ اس گوناگوں مواد کا مشکل ہی سے کوئی جزء ایسا ہوگا جس کے لئے مصنف کے پاس اشعار نہ ہوں، ہر جزء کے سلسلہ میں شعر بیان ہوئے ہیں، کہیں یہ اشعار برمحل ہیں اور بیان کردہ بات سے موافقت رکھتے ہیں کہیں بیان کردہ بات سے ان کا دور کا تعلق ہوتا ہے، اور کہیں قاری محسوس کرتا ہے کہ پیش کردہ اشعار بھرتی کے ہیں، واقعہ سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتے۔ مصنف روایتِ نثر ہی کا حافظ نہیں، روایتِ شعر کا بھی خزانہ ہے اور پھر ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ادیب بھی ہے اور ادیب بھی کیسا، ایک مؤسس ادیب جو ادب کی بنیاد رکھتا ہے، جس کا کوئی پیش رو نہیں، جو خود جادہ بنا رہا ہے، اور علاوہ بریں جس کے ذہن کا دھارا اور قلم کی زبان دونوں بہت تیز ہیں۔ ہم اگر اعتراض کریں کہ یہ شعر بھرتی کے ہیں، یہاں توازن اور اعتدال، یہاں اختصار و اجمال، یہاں احتیاط و مصلحت، یہاں ترتیب و تنظیم، یہاں سیاق و سباق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا، تو مصنف کے پاس ان سب کا جواب موجود ہے، مگر یہ جواب ممکن ہے مصنف کے ہم عصر ذہن کو مطمئن کر سکے، بیسویں صدی کی تراش خراش کا دماغ مشکل ہی سے اس کو تسلیم کر سکتا ہے۔

۷۔ جاحظ پہلے مصنف ہیں جنہوں نے اجتماعی مسائل پر قیمتی مواد چھوڑا ہے، ان کی بہت سے رسالوں میں اجتماعی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اجتماعی مسائل عربی کتابوں میں عام طور پر ضمناً بیان ہوتے ہیں، جاحظ نے ان کو اپنے رسالوں میں مستقل موضوع قرار دے کر بحث کی ہے۔ کتاب الحیوان میں بہت تو نہیں تاہم خاصہ اجتماعی مواد موجود ہے، جس چیز کی نمایاں کمی ہے وہ تاریخی حقایق ہیں۔ البیان والتبیین خالص ادبی تصنیف ہے اور حجم میں حیوان سے کم، پھر بھی اس میں تاریخی حقائق زیادہ ہیں، اور ابن قتیبہ کی عیون الاخبار اور مبرد کی کامل اس اعتبار سے البیان اور حیوان دونوں پر بھاری ہیں۔ یہاں دو مثالیں پیش کرتا ہوں جن کو کتاب کی تاریخی جان کہا جا سکتا ہے

(الف) مسیلمہ کذّاب کی شعبدہ بازیاں

نبوت کے دعوی سے پہلے مسیلمہ، اُبلہ، انبار، اور حیرہ کے بازاروں میں جہاں عرب اور غیر عرب آباد تھے گھوما کرتا تھا، اس آوارہ گردی سے اس کا مقصد شعبدہ بازی کے گُر، نجوم اور جھوٹے نبیوں کے ہتھکنڈے سیکھنا تھا۔ اس نے سادنوں، سپیروں کاہنوں پرندوں کی اڑان سے شگون لینے والوں، جادوگروں اور ان لوگوں کی حیلہ بازیوں میں مہارت حاصل کر لی تھی جو جنوں کو اپنا تابع بتاتے ہیں، مثلاً اس کی ایک شعبدہ بازی یہ تھی کہ وہ انڈے کو تیز سرکہ میں ڈالتا تھا، اور انڈا اگر دیر تک سرکہ میں پڑا رہے تو اس کے اوپر کا چھلکا نرم ہو جاتا ہے اور اگر دبایا جائے تو ایسا انڈا لمبا اور پتلا ہو جاتا ہے، جب وہ انڈے کو مرضی کے مطابق بڑھا لیتا، تو اس کو ایک تنگ منہ کی شیشی میں ڈال دیتا اندر جا کر جب انڈا خشک ہو جاتا اور چھلکے کے کھنچے اجزاء سکڑ جاتے اور آہستہ آہستہ وہ قدرتی انڈے کی طرح گول ہو جاتا تو وہ یہ بوتل بنو حنیفہ کے سردار مجاعہ اور اپنے بدو عربوں کے سامنے پیش کرتا اور کہتا: "یہ ہے میرا معجزہ جو خدا کی طرف سے میری نبوت کی دلیل ہے، گول انڈا

تنگ سر کی بوتل میں خدا نے میرے ہاتھ سے ڈلوایا ہے۔" یہ دیکھ کر مجاعہ اس پر ایمان لے آیا۔

مُسیلمہ کی دوسری شعبدہ بازی

مُسیلمہ کے پاس کبوتر کے پر تھے، مجاعہ کے گھر میں پر بریدہ کبوتروں سے بازی لگائی جاتی تھی، انڈے کا معجزہ دکھانے کے بعد مسیلمہ کبوتروں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے مجاعہ سے کہا: تم خدا کی مخلوق کو کب تک پر قینچ کرتے رہوگے، اگر خدا کو ان کا اڑنا منظور نہ ہوتا تو ان کے پر نہ لگاتا، میں نے کبوتروں کا پر قینچ کرنا ممنوع کر دیا ہے" مجاعہ نے خطاوارانہ انداز سے کہا: تو براہِ کرم خدا سے دعا کیجئے جس نے انڈے کا معجزہ آپ کو عطا کیا کہ وہ اسی وقت کبوتر کے پر نکال دے۔" مُسیلمہ:- اگر میں خدا سے التجا کروں اور وہ پر نکال دے اور یہ پرند تمہارے سامنے اڑ جائے تو کیا تم کو میرے نبی ہونے کا یقین آجائے گا؟ مجاعہ نے وعدہ کیا۔

اب مُسیلمہ نے کہا: میں اپنے رب سے مناجاۃ کرنا چاہتا ہوں، مناجاۃ کے لئے تنہائی ضروری ہے، لہٰذا تم سب یہاں سے چلے جاؤ، اور جاتو اس کبوتر کو اس کمرہ میں کر دو اور اس کے ساتھ مجھے بھی، اور میں ابھی تمہارے سامنے اس کو بال و پر سے اڑتا لا نکالوں گا۔"

ایسا ہی کیا گیا، مُسیلمہ نے تنہا ہو کر وہ پر نکالے جو اس کے پاس شعبدہ کے لئے تیار تھے اور پروں کی نوکیں کبوتر کے ان خلوں میں ٹھونس دیں جہاں سے پر کاٹے گئے تھے، جب سارے خلوں میں پر فٹ ہوگئے اور دونوں بازو درست، تو اس نے باہر آکر لوگوں کے سامنے کبوتر اڑا دیا، اب کیا تھا، جو لوگ پہلے سے ایمان لا چکے تھے، ان کا ایمان پختہ ہوگیا، جو نہیں لائے تھے، ایمان لے آئے اور جو اس کو جھوٹا سمجھتے تھے، انھوں نے اس کے خلاف پروپگنڈا بند کر دیا۔

تیسری شعبدہ بازی

اس کے بعد ایک اندھیری رات میں جب کہ ہوا تیز تھی اس نے کہا: میرے پاس

فرشتہ آنے والا ہے، فرشتے اڑتے ہیں، جو لوگ باہر ہیں گھروں میں چلے جائیں، اگر کوئی فرشتہ کو دیکھنے کی کوشش کرے گا تو اس کی آنکھوں پر بجلی گر پڑے گی اور وہ اندھا ہو جائے گا؛ اس کے بعد اس نے ایک دُم دار پتنگ بنائی جیسا کہ بچے بناتے ہیں اور جن کو گھنگرو باندھ کر تیز ہوا میں مضبوط دھاگے سے اُڑاتے ہیں۔ لوگ گھروں میں فرشتہ کے نزول کا انتظار کرتے اور آسمان تکتے، مسیلمہ دیر کرتا رہا حتی کہ یمامہ (اس کا وطن) کے اکثر لوگ اکتا کر اٹھ گئے اور ہوا بھی تیز ہو گئی۔ اب مسیلمہ نے پتنگ اڑائی، اندھیرے کی وجہ سے نہ دھاگا نظر آتا تھا نہ پتنگ، جب لوگوں نے آسمان پر دھندلی سی چیز اڑتے دیکھی اور گھنگرو کی آواز سنی وہ چیخ اٹھے فرشتہ، فرشتہ۔ مسیلمہ نے بآواز بلند کہا: جو لوگ فرشتہ کی طرف سے نظر ہٹالیں گے اور گھروں میں چلے جائیں گے صرف ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ جب صبح کو لوگ اٹھے تو مسیلمہ کی مدد اور اس کے لئے خون بہانے کو تیار تھے[1]۔

(ب) عبد اللہ بن سوار بصرہ کے ایک حیرت انگیز قاضی

"بصرہ میں ہمارے ایک قاضی تھے جن کا نام عبد اللہ بن سوار تھا۔ لوگوں نے کبھی نہ تو ان جیسا کارگزار اور مستعد ذمی حاکم دیکھا تھا، نہ ان جیسا سنجیدہ، باوقار، بردبار اور اپنے اوپر قدرت رکھنے والا مسلمان حاکم۔ فجر کی نماز باوجود مسجد قریب ہونے کے گھر میں ادا کرتے، اس کے بعد مجلس عدالت میں آجاتے اور بغیر تکیہ لگائے دوزانو ہو کر بیٹھتے، بالکل سیدھے، نہ ان کا کوئی عضو ہلتا تھا نہ اِدھر اُدھر نظر اٹھتی تھی، نہ زانو بدلتے تھے۔ نہ جسم کے کسی حصہ کا سہارا لیتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی عمارت ہو یا مضبوط چٹان۔ اسی ہیئت میں مقدمے سنتے رہتے حتی کہ ظہر کا وقت آجاتا، اٹھتے اور نماز سے فارغ ہو کر پھر اپنی جگہ آجاتے، پھر عصر کے لئے اٹھتے اور نماز سے فارغ ہو کر مجلس میں اسی شان سے آبیٹھتے

---

[1] کتاب الحیوان ۴/ ۱۲۰ - ۱۲۱

اور نماز مغرب تک مقدمے فیصل کرتے ۔ نماز سے فارغ ہو کر گھر چلے جاتے لیکن اگر عہد نامے، شرطیں اور وثیقے باقی رہتے تو پھر مجلس میں آجاتے اور عشار پڑھ کر گھر لوٹتے ۔ اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ وہ جب تک قاضی رہے، نہ تو کبھی مجلس سے وضو کے لئے اُٹھے، نہ پانی پیا، نہ اور کوئی چیز، چاہے دن بڑے ہوتے، چاہے چھوٹے، چاہے موسم گرمی کا ہوتا یا جاڑے کا، اور پھر وہ نہ تو کبھی ہاتھ ہلاتے تھے، نہ سر سے اشارہ کرتے تھے، بس زبان استعمال کرتے تھے ۔ ایک دن کی بات ہے کہ ان کے ماتحت دو رویہ قطاروں میں ان کے سامنے بیٹھے تھے کہ ایک مکھی ناک پر آکر بیٹھی اور دیر تک بیٹھی رہی، پھر اُڑ کر آنکھ کے کوئے پر چلی گئی، قاضی صاحب نے ضبط کیا، نہ نتھنا ہلایا نہ سر جھکایا، نہ ہاتھ کو حرکت دی، مکھی کوئے میں سونڈ گڑوتی رہی، جب دیر تک وہ نہ ہٹی اور قاضی صاحب کے جلن ہونے لگی تو انھوں نے آنکھ جھپکی، مکھی اب بھی نہ ہٹی، قاضی صاحب جلد جلد آنکھ جھپکنے لگے، مکھی اب ذرا ہٹ گئی، اور جوں ہی آنکھ جھپکنا بند ہوئی پھر کوئے پر آگئی، اور پہلے سے بڑھ چڑھ کر۔ اس نے سونڈ اس جگہ گڑو دی جو پہلے دکھا چکی تھی، قاضی صاحب نے پہلے سے زیادہ زور سے آنکھ جھپکائی اور برابر ایسا کرتے رہے، مکھی اس وقت تک ہٹی رہی جب تک آنکھ جھپکی، اس کے بعد پھر اپنی جگہ آگئی اور کوئے پر اس بری طرح چپٹی کہ قاضی صاحب کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا، اور ان کو مکھی اُڑانے کے لئے ہاتھ اُٹھانا پڑا، حاضرین نظریں چرا چرا کر یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے ۔ ہاتھ کے رُکتے ہی مکھی پھر اپنی جگہ آگئی، مجبور ہو کر قاضی صاحب نے اب آستین سے اس کو اُڑایا اور کئی بار ایسا کیا ان کو شدید احساس تھا کہ یہ سب ان کے ماتحتوں اور معاونوں کے سامنے ہو رہا ہے ۔ ان سے رہا نہ گیا اور بولے: میں شہادت دیتا ہوں کہ مکھی، گبریلا (خُنفسار) سے زیادہ ڈھیٹ اور کوے سے زیادہ خود بیں ہے، خدا کی پناہ، بہت سے لوگ کتنے خود نگر ہوتے ہیں ان کی کمزوریاں جو اُن سے اوجھل ہوتی ہیں خدا اُن پر آشکار کر دیتا ہے، اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میں کمزور ترین انسان

ہوں، اس کی حقیر ترین مخلوق نے مجھ پر قابو پالیا اور رسوا کر دیا، پھر یہ آیت تلاوت کی: "وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْهُ، ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ"۔ قاضی صاحب بڑے قادر بیان آدمی تھے، بااین ہمہ ایک لفظ بے ضرورت نہ بولتے تھے، ماتحتوں میں ان کا بڑا رعب اور وقار تھا، ان کی دیانت مسلم تھی اور ان کے ماتحت تک رشوت خوری کے الزام سے پاک تھے۔"[۱]

۸۔ کتاب کا موضوع اگرچہ اختلافی مسائل نہیں ہیں جن پر مصنف پر بہت لے دے ہوئی، پھر بھی جگہ جگہ ایسے مباحث آ گئے ہیں جن میں نظریات کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ مباحث تفسیر و حدیث علم حیوان، علم کلام، علم اعتزال، علم لغة، علم درایت اور روایت سب کو سمیٹے ہوئے ہیں مصنف کے لئے ان مباحث سے قطع نظر ناممکن ہے اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ جس دور میں وہ تھے اس میں اختلافی بحث اور اختلافی حس بہت شدید تھی، اور دوسرے وہ نقاد، معتزلی اور مفکر بھی تھے اور ان کے لئے مشکل تھا کہ جس نظریہ کو ان کی وسیع معلومات اور فکر نے غلط پایا ہو اس کی نشان دہی یا تردید کئے بغیر رہ سکیں۔ انھوں نے اختلافیات کا مطالعہ ہی نہیں کیا تھا، اس موضوع پر علماء وقت سے تبادلہ خیال بھی کیا تھا اور پھر ان پر مستقل رسالے قلم بند کئے تھے جس سے نقد و جرح ان کی طبیعت میں رچ گئی تھی۔ امام شافعی رح کے "ام" نقد و جرح کی پہلی کتاب تھی اور اس کتاب کا انداز بعد کے متکلموں اور معتزلیوں نے اپنا لیا تھا، یہی شان جاحظ کے ہاں بھی موجود ہے مگر ادبیت میں ڈوبے ہوئے انداز بیان نے ان کی نقد و جرح کو خوبصورت اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم بات یہ ہے کہ جاحظ نقد و جرح میں قلم کو تعصب کے زہر یا حزبی میلانات سے ملوث نہیں کرتے، وہ سلجھے ہوئے اور روشن خیال نقاد ہیں، اپنے حریف کو برا بھلا کہنے کی بجائے اس پر ترس کھاتے ہیں اور خدا سے اس کی اصلاح کی دعا مانگتے ہیں۔

---

[۱] کتاب الحیوان ۳/ ۱۰۶-۱۰۷

۹۔ بحیثیت مسلمان، جاحظ تقلیدی یا سطحی مذہبیت سے بہت پرے تھے، اسلام اور اسلامی تصورات کو تنگ کرنا اور الگ الگ خانوں میں مقید کرنا ان کے لئے ناممکن تھا، انھوں نے مختلف مذہبی اور علمی حلقوں میں تعلیم پائی تھی اور بہت سے گھاٹوں کا پانی پیا تھا، اس لئے ان کی نظر میں وسعت کے ساتھ توازن بھی پیدا ہو لیا تھا، وہ اس مذہبیت کے قائل نہ تھے جس کا خارج ہو باطن نہ ہو، جس کی آبیاری بصیرت سے نہیں عقیدت سے ہوئی ہو۔ ایک جگہ غلط مذہبیت پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ "اہل نقص" کی ہر صنف کا عقیدۂ خدا پرستی جس کو وہ خدا کی اطاعت اور ثواب کا موجب خیال کرتا ہے، الگ الگ ہوتا ہے۔ ان متکلم علماء کی "خدا پرستی" جو خود عقائد کی شبہات میں گرفتار ہیں یہ ہے کہ دوسروں کے عقائد پر طعن کریں، ان کو متشکک ٹھہرائیں اور اس طرح اپنے تشکک کو دوسروں پر حملہ کر کے مخفی رکھنے اور اپنی آبرو بنائے رکھنے کے لئے جس مرض میں خود مبتلا ہیں دوسروں کو اس میں مبتلا قرار دیں "خارجی" کی خدا پرستی جس پر وہ نازاں ہے یہ ہے کہ ارتکاب گناہ کو سنگین ترین جرم قرار دے۔ مگر خود قانونِ الٰہی توڑے اور ظلم وستم ڈھائے، یہ بات بالکل نظر انداز کر دے کہ خدا کو پسند نہیں کہ بڑے سے بڑے ظالم پر بھی ظلم کیا جائے نیز یہ کہ حق بات اور راستی میں سب لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔

"خراسانی" کی خدا پرستی یہ ہے کہ حج کرے اور چیت لیٹ کر سوئے، سرکاری عہدوں سے محروم رہے، مگر مقدموں میں شہادت دینے کو آمادہ ہو، اور لوگوں کے افعال پر محتسبانہ نقد کرے۔ "کوفی اور سپاہی" کی خدا پرستی یہ ہے کہ سرکاری نوکری سے الگ ہو جائے اور اربابِ حکومت کی ملاقات سے گریز کرے۔ "عراق کے زمینداروں" کی خدا پرستی یہ ہے کہ آگ پر جوش دی ہوئی شراب نہ پئیں "خصی" کی خدا پرستی یہ ہے کہ طرسوس (سرحد شام) پر بازنطینی فوجوں سے جہاد کے لئے اڑا جالے۔ "رافضی" کی خدا پرستی یہ ہے کہ نبیذ سے پرہیز کرے "باغبان" کی خدا پرستی یہ ہے کہ باغ سے پھل نہ چرائے "گویوں" کی خدا پرستی یہ ہے کہ باوجود خوب پینے

کے، نماز باجماعت کا پابند رہے، خوب تہلیل و تسبیح کرے اور رسول اللہ پر کثرت سے درود بھیجے "صوفی" کی خدا پرستی یہ ہے کہ جب اس کو نوکری نہ ملے یا کسی پیشہ میں ناکام ہو تو مسلمانوں میں زہد (ترک دنیا) کا پرچار کرے اور سعی معاش ترک کر کے کمانے کو حرام اور توکل کے خلاف قرار دے اور بھیک مانگنے لگے اور بھیک کے ذریعہ لوگوں کی نظر میں عزت و وقار کا خواہاں ہو۔

۱۰۔ جاحظ محدث نہ تھے، مگر حدیث کا علم رکھتے تھے، ان کی کتابوں میں حدیث کی خاصی تعداد موجود ہے، خاص طور پر اختلافی مسائل پر بحث کے دوران میں عقلی دلیلوں کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں وہ اکثر حدیثیں پیش کرتے ہیں اور حدیث سے وہ بے نیاز ہو بھی نہیں سکتے تھے، ان کے وقت میں معتزلہ کا زوال شروع ہو چکا تھا اور خلیفہ متوکل عباسی کے عہد یعنی ۲۳۲ھ سے احترام و اہتمام حدیث کی بڑی وسیع تحریک پیدا ہو گئی تھی جس کو حکومت کی پوری تائید حاصل تھی، حدیث سے صرف نظر کے معنی تھے خود کو ملحد و زندیق قرار دینا اور اپنی کتابوں کی قیمت کھونا۔ حدیث کے بارے میں جاحظ کا مسلک معتدل تھا، حدیث کو درایت کے اصول پر پرکھتے تھے، اس کے خاص و عام کو سمجھتے تھے ایسی حدیثوں پر جو قدرتی قوانین کے منافی یا شان نبوی سے بعید ہوتیں، نقد کرتے تھے۔ اسی بنا پر قاضی ابن قتیبہ جو ان کے ہم عصر اور ادب میں ان کے مقلد تھے، ناراض ہوئے اور اپنی ایک کتاب میں جس کا موضوع حدیث ہے، جاحظ پر سخت لعن طعن کی ہے۔ کتاب الحیوان میں ایک جگہ انھوں نے اپنے مسلک حدیث کے بعض گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ رسول اللہ کی متعدد حدیثیں پیش کی ہیں جن میں کتا نہ پالنے، اس کو قتل کرنے، یا چند شرطوں کے ساتھ پالنے کا حکم ہے۔ پہلے رسول اللہ نے کتوں کو قتل کرنے کا عام حکم دیا، اس کے بعد عام حکم میں ترمیم کی اور فرمایا کہ صرف سیاہ کتوں کو مار اجائے جس کی آنکھ پر دو نکتے ہوں کیوں کہ ایسا کتا شیطان ہوتا ہے روایت ہے کہ رسول اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص کتا پالے اور وہ نہ تو شکار کے لئے پالا گیا ہو نہ

---

۵ کتاب الحیوان ۱/۱۰۳

مویشیوں کی حفاظت کے لئے تو ایسے شخص کا اجر ہر دن دو قیراط کم ہوتا رہے گا۔

پورے ادیبانہ جوش سے یہ واضح کرنے کے بعد کہ کتا بحیثیت نگہبان گھر کی عورتوں دوکانوں اور گوداموں کو چوروں اور بدمعاشوں سے محفوظ رکھنے کے لئے شکار اور مویشیوں کی حفاظت سے کہیں زیادہ اہم ہے، جاحظ قتل کلاب والی حدیث پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں: بہت ممکن ہے رسول اللہ کے عہد میں چوروں اور اہل فساد کا مدینہ میں خطرہ نہ ہو، اور مدینہ کے اکثر کتے کٹ کھنے ہوں، اور وہاں کے اکثر جوان کتے لڑاتے ہوں، یا کتوں کے ذریعہ بازی لگاتے ہوں (کٹ کھنا کتا اس بھیڑیے سے جس کے قتل کا صریح حکم ہے زیادہ مضرت رساں ہے۔۔۔۔) بہت ممکن ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ کہا کہ کتا شیطان ہوتا ہے تو یہ ان کی ذاتی رائے نہ ہو بلکہ عام خیال کی ترجمانی ہو، یا قتل کلاب کے حکم کے خاص اسباب ہوں جن کو بعد کے لوگوں نے نظر انداز کر کے حکم عام کر دیا ہو، ممکن ہے حدیث سننے والے نے رسول اللہ کے قول کا صرف آخری حصہ سنا ہو اور اول حصہ نہ سنا ہو، ممکن ہے رسول اللہ اور صحابہ کے درمیان کتے کے بارے میں گفتگو ہوتی ہو اور آپ نے خاص ان کے لئے یہ حکم دیا ہو[1]

---

[1] کتاب الحیوان ۱/۱۴۱ و ۱۴۸

العلم والعلماء

یہ جلیل القدر امام حدیث علامہ ابن عبدالبر کی شہرۂ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا نہایت صاف اور شگفتہ ترجمہ ہے۔ مترجم کتاب مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی اس دور کے بے مثال ادیب و مترجم سمجھے جاتے ہیں۔ موصوف نے یہ ترجمہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا تھا جو ندوۃ المصنفین سے شائع کیا گیا ہے۔ علم اور فضیلت علم کے بیان، اہل علم کی عظمت اور ان کی ذمہ داریوں کی تفصیل پر خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے آج تک کوئی کتاب اس مرتبہ کی شائع نہیں ہوئی اس کتاب کی ایک ایک سطر سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق ہے۔ ایک زبردست محدث کی کتاب اور ملیح آبادی صاحب کا ترجمہ، موعظوں اور نصیحتوں کے اس عظیم الشان دفتر کو ایک دفعہ ضرور پڑھئے۔ صفحات ۳۰۰ بڑی تقطیع قیمت چار روپے آٹھ آنے، مجلد پانچ روپے آٹھ آنے

عربی شاعری و خیالات کا اثر بروفنسا اطالیہ کی شاعری پر

از
جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی
(پروفیسر یونی ورسٹی الہ آباد)

(۲)

اس میں شاعر ایک پہاڑ پر جاکر خاموش کھڑا ہوجاتا ہے اور اس کے اوپر کبھی نیلے آسمان کو دیکھتا ہے اور کبھی اس کے نیچے بہتے ہوئے دریا پر نظر ڈالتا ہے موجوں کی تھپیڑوں کی آواز، ہواؤں کے جھونکوں کی سنسناہٹ اور کبھی خشکی اور دریا کی مخلوط آواز کو سنتا ہے ان دونوں آوازوں کو ملأ اعلیٰ کی طرف جاتے ہوئے محسوس کرتا ہے جو آواز دریا سے نکل کر جاتی ہے اس میں فرحت و سرور پاتا ہے اور جو آواز خشکی سے پیدا ہوتی ہے اس میں حزن وملال، رنج والم کی آمیزش پاتا ہے امواج کی آواز کو حمد باری کی تسبیح سمجھتا ہے اور خشکی کی آواز کو زمین کا رونا اور انسان کے شور و واویلا کی آواز تصور کرتا ہے ان دونوں آوازوں میں سے ایک کا نام "طبیعت" اور دوسرے کا نام "انسانیت" رکھتا ہے اس دل کش منظر پر غور کر کے بے خود ہوجاتا ہے اور اتھاہ گہرائی میں پہنچ کر اپنے نفس سے سوال کرتا ہے کہ ہم یہاں کیوں ہیں؟ ان سب کا کیا مقصد؟ آیا زندگی بہتر ہے یا موت؟ پھر خدائے وحدہٗ لاشریک کی ذات گرامی کی قسم کھاکر کہتا ہے کہ صرف خدائے قدوس ہی جانتا ہے کہ یہ طبیعت کا سرور وغنا جنسِ بشری کے حزن و بکا سے دوامًا کیوں ممزوج ہے اور پھر دریائے حیرت میں غرق ہوجاتا ہے:-

اس طرح فیکتور ہوگو Victor Hugo نے اپنے دوسرے قصیدہ "الشموس الغاربۃ" (The Setting suns.) میں غروبِ آفتاب، شفق کا ظہور

اوراُفق پر گھنگور گھٹاؤں کا چھاجانا نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے اوراس سے مخلوقات میں وجودِ خالق کے نظریہ پر بالکل اسی طرح دلیل لایا ہے جیسے معری نے اپنے حسب ذیل اشعار میں اس کو پڑھئے اور حیرت انگیز یگانگت سے لطف اندوز ہوجئے اشعار یہ ہیں :-

ادى الخلق فى امرين ماض ومقبل　　وظرفين ظرفى مدة ومكان

اذا ما سألناعن مراد الهنا　　كنى عن بيان فى الاجابة كان

یا جیسے قرآن میں ہے " اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ " اور اسی " الشموس الغاربات " (The setting suns) کے عمدہ اشعار میں سے یہ ہے " هذه[1] السحب الملونة بالوان الرصاص والذهب والنحاس والحديد تستكن فيها الزوبعة والاعصار والساعقة والجحيم وتدمدم دمدمة خفية نهر الله الذى يعلقها جميعا فى السموات العميقة كما يعلق الفارس على اوتاد البيت اسلحته المتصلصلة " یہ بھی بالکل ویسے ہی ہے جیسے قرآن کے سورہ نبا میں " اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَّجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا وَّبَنَیْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا " اسی دیوان میں ہوگو نے ایک اعلیٰ درجہ کا قصیدہ لکھا ہے جس کا نام " الدعاء للجميع " (Prayer To all.) ہے یہ قصیدہ قواعد انسانیہ اور فلسفہ اجتماعیہ کا مظہر ہے اس دعاء میں جو کچھ طریقہ اختیار کیا ہے یا خیالات کا اظہار کیا ہے اور جس طرح اس میں لڑکی کو مخاطب کر کے طالب دعا ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بالکل ذیل کی حدیث کی پیروی کی ہے جس کو ابوہریرہؓ نے

---

[1] تاریخ الادب بین الافرنج والعرب

رسول کریم صلعم سے روایت کیا ہے

"قیل یا رسول اللہ من احق الناس بحسن الصحبۃ - قال - امک ثم امک ثم اباک ثم ادناک ثم ادناک"

جو قرآن میں ہے اس کو بھی دیکھئے:۔

"واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا"

اور پھر لزومیات میں معری کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

واعط اباک النصف حیا ومیتاً	وفضل علیہ من کرامتھا الاما
اقلک خفا اذ اقلتک مثقلا	وارضعت الحولین واحتملت تما
والقتک عن جھد والقاک لذۃ	وضمت وشمت مثل ما ضم اوشما

اگر معری اور دوسرے شعرائے عرب کے کلام کو بنظر غائر ملاحظہ کیا جائے تو ہوکو کے اس "الدعاء للجمیع" کے اکثر خیالات میں مماثلت نظر آئے گی۔

فرانس والے جو اسلوب کی روانی اور شان و شوکت کو شاعری کا جوہر اور جزو اعظم سمجھتے تھے انھوں نے شہسواروں کے قصے حادثے اور داستانوں کو جو حیرت واستعجاب اور مسرت کو پیدا کرسکیں اپنے یہاں لے لیا اور اس کو اشعار میں نظم کیا حالانکہ دوسری قوموں نے اس کو نثر میں جگہ دی ہندی قصے Dolopathos (on king and seven wise men) کا لاطینی ترجمہ ہوگیا یہ تروفیر Trouveres کا پہلا خزانہ ہے اور عربی قصے مراقشیوں نے قشتالیوں کو دیا اور قشتالیوں catalans نے فرانس کو دیا اس کا بھی نظم میں ترجمہ ہوا Raymond Berenger اور اس کے جانشینوں نے بروفنسا Provence میں آزادی اور اولو العزمی کی روح کے ساتھ ساتھ زیب و زینت و آرائش کا ذوق مع تمام علوم عربیہ کے رائج کیا ان دونوں لطیف اشیاء کے باہمی اتحاد نے ایک نئی شاعری کی روح پھونک دی جو اس تاریک زمانہ میں بروفنسا بلکہ تمام جنوبی یورپ میں بجلی کی طرح چمکی اور ان کو منور کردیا ہے

وہ زمانہ تھا جب شیفالیہ، chivalry بروفنسا میں وجود میں آئی یہ قدیم تصورات سے بالکل مختلف تھی اس کی اصل خصوصی عورتوں کی خدمت و احترام تھی گیارہویں صدی کے اخیر میں جنوبی فرانس میں اسی قسم کی شاعری کا ظہور ہوا جس کے مضامین نئے معاشرتی اصول نئے اصطلاحات نئی شاعری کی اس جدید ترقی کی طرف رہنمائی کرنے والی کوئی چیز فرانس کے پرانے ادب میں نہیں پائی جاتی ہاں اس نئی شاعری میں عرب اندلس کے بعض مستحکم اثرات پائے جاتے ہیں جو نمایاں طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ ابتدائی بروفنسال شاعر عربی نمونہ شاعری سے ضرور متاثر ہوا تھا اور جس طرح عربی علوم و فلسفہ کے اثرات سے ڈیپیر ریمان۔ لبنان وغیرہم کے اقوال پر ہیں اسی طرح عربی شاعری کے اثرات بروفنسال شاعری پر سسمنڈی (Sismondi) کی مشہور کتاب "جنوبی یورپ کے ادب کا تاریخی جائزہ" Historical view of the literature of south of Europe مملو و مشحون ہے[1]۔ افسانوی داستان یا شہسوارو

---

[1] انیسویں صدی کے نصف میں اس کے خلاف آواز سنائی دیتی ہے یہ ناقد اندلس اور بروفنسا کے درمیان اختلاط کی ایک مستند تحریری شہادت چاہتا ہے جس کو اپنے حسب خاطر خواہ نہ پاکر دوسرے گوشہ پر جا پہنچتا ہے اغسطس ولیم شلیگل Augustus William Schlegel. ایک کتاب "On the language and literature of Provence" مطبوعہ ۱۸۱۸ء میں بروفنسال کی شاعری اور تہذیب پر عربی اثرات کا انکار کرتے ہوئے زمانہ وسطیٰ کے اندلس کے مذہبی تعصب و تنفر کا ذکر کرتا ہے حالانکہ تاریخ مراقشی اور اندلسیوں کے درمیان اس قسم کے تنفر و عناد کا پتہ نہیں دیتا قشتالیہ کے انفانسو Alphonso of Castile کے زمانہ تک کوئی حکومت ایسی نظر نہیں آتی جہاں عیسائی شاہزادہ مراقشی دربار میں پناہ گزیں نہ رہا ہو یا مراقشی حاکم عیسائی حکومت کے زیر سایہ نہ رہا ہو ڈیڑھ سو سال ہم دور دو جہ۔ two Williams of Sicily سسلی کے دو ولیم اور two Rogers بلکہ فریڈرک دوم Fredrick II کے دربار میں ہم دیکھتے ہیں کہ عرب اٹلی کے باشندہ سے ملتے تھے دونوں سسلی two Sicilies کے صوبوں میں قاضی judges عرب ہی منتخب ہوتے تھے تقریباً ۵ صدی دونوں قومیں جنوب یورپ میں گہرے دوستانہ طریقہ سے ملے جلے رہے M. Raynouard نے کافی ثبوت دیا ہے کہ رومانس زبان پرتگال میں ۷۳۴ھ میں Alloacem کے عمارت کے کسی حصہ میں تحریراً موجود تھی اس وقت جنوبی فرانس کے تمام صوبہ جات عبدالرحمٰن کے قبضے میں آچکے تھے طلیطلہ Toledo کی فتح جو ۱۰۸۵ء میں ہوئی یہ بروفنسال کی شاعری کی تاریخ نہیں قرار دی جاسکتی جیسا کہ Abbé Andres M. Ginguené نے اس کو بروفنسا شاعری کا سال مقرر کیا ہے طلیطلہ کی

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کے نظم میں عمدہ نازک خیالات - افلاطونی محبت - عزت واحترام کا جذبہ قوی کا کمزور کی مدد کا
خیال بلند کرداری کی اُمنگ فرانس کے قدیم تردفیر Troubadours کے یہاں نہیں ملتی
شہ سواروں کے داستان Romances of chivalry کے موجدین نے اپنے ہیرو کی تصویر
کھینچنے میں جرمن کی وفاداری، فرانس کی بہادری اور عرب کی بلند خیالی سے کام لیا جب
شہ سواروں کی داستان کی ترقی ہوئی تو اس وقت عرب کی اخلاقی حالت اوجِ کمال پر تھی
نیکی پارسائی میں سرگرم تھے زبان کی پاکیزگی اور ان کے مصنفین کی نازک خیالی سے یورپ
والے کسی قدر ندامت محسوس کرتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ تمام یورپ سے زیادہ اولوالعزم
emulsa moatchi nalusi اندلسی تھے جو عرب ہی کے تعلیم یافتہ علماء و فضلاء تھے عرب ہی اسپین
میں شہ سواروں کی داستان کے موجد تھے انھیں کے شہ سواروں کی حیرت انگیز داستان
نے دلوں پر بہت اثر کیا عربوں کا دستور تھا کہ روزانہ شام کے وقت اپنے خیموں میں جمع ہوکر
حیرت انگیز داستانوں کو سنتے تھے غرناطہ میں تو اس داستان کے ساتھ رقص و سرود بھی
ہوتا تھا اسپین کے تاریخی قصائد ان کے "موالیا" عربی ہی شاعری سے ماخوذ ہیں جس طرح
یورپ عربی ادب وافسانہ سے بلا نکیر پورے طور سے متاثر ہے مثلاً مقدس پیالہ Holy
Grail کے افسانے بے شبہ شامی سرچشموں سے لئے گئے حکیم بیدپا کے اخلاقی قصے الف
لیلہ کی کہانیوں نے جو اثر کیا وہ ناقابل رد ہے چاسر Chaucer کی کہانی اسکوائرز ٹیل
Squire's Tale اصل میں الف لیلہ ہی کی ایک کہانی ہے بوکاشیو Boccaccio نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی فتح کے معنی یہ ہیں کہ بہت سے مشہور کالج جو عرب کے قبضہ میں تھے عیسائیوں
کے قبضے میں آگئے اور ان کالجوں نے درباروں کے ان باہمی اختلاط کے بہت زمانہ بعد تک جس نے ان
کی شاعری کو مانوس کرایا تھا۔ سلسل علوم عربیہ کو مغرب میں پھیلانے کا سلسلہ جاری رکھا مراقشی کا
اثر لاطینی پر سائنس۔ فلسفہ۔ ادب۔ تجارت۔ زراعت اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے صاف نمایاں
ہے لہٰذا یہ کس قدر تعجب خیز ہے کہ اس نے ان گانوں اور گیتوں پر اثر نہ ڈالا ہو جو تہواروں میں کی روح
رواں تھے جس میں دونوں قومیں آپس میں ملتی جلتی تھیں جب کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دونوں قومیں گانے اور
شاعری پر کس قدر فریفتہ تھیں۔

قصے سن کر اپنی کتاب De Cameron کی صورت میں پیش کیا بالکل اسی طرح فرانس والے شہسواروں کے داستان سے بہت متاثر ہوئے جب شارلیمان Charlemagne نے فتوحات عظیمہ کے بعد شاہنشاہ کا لقب اختیار کیا اور نصاریٰ کے حجاج کے لئے بیت المقدس کی زیارۃ کی اجازت عباسی خلیفہ سے حاصل کرلی تو اس کی بڑی شہرت ہوئی اس کی شان میں اس کے متعلق قصے اور اشعار پڑھے جانے لگے جیسے عرب والے ہارون الرشید کے لئے کیا کرتے تھے "اغانی رولاں" Chanson de Roland "حج شارلیمان" Voyage of Charlemagne نظم کئے گئے اسی فرانسیسی زبان میں جس کو اس زمانے والے بولتے تھے عرب کی اس تقلید میں ان کے علاوہ اور بہت سے قصائد حروب صلیبیہ کے متعلق لکھے گئے جن کا مطالعہ عرب کی تاریخ کے محققین کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ یورپین محققین کو اپنے تاریخی غوامض کے اکتشاف کے لئے عربی کتابوں کی چھان بین کی ضرورت ہے بارہویں صدی کے اخیر میں اور تیرھویں صدی کے ابتدا میں شمالی شعرا جنوبی شعرا کی تقلید کرکے محسنات شعریہ - رقت غزل - عربی قوافی اور الحانِ موسیقیہ کا استعمال کیا اور اسی کے زیر اثر بہت سے دیوان مرتب کئے اور پھر اشعار ہجویہ ہزلیہ اور نکاہات کلیلہ دمنہ کے طریقہ پر اور کچھ حکایات حیوانات کی زبان سے بیان کرتے ہوئے لکھے گئے مثلاً رومان روز Romance of Rose اور رومان ثعلب Roman de Renart وغیرہ

شہسواری کی وہ روح جو قرون وسطیٰ میں چھائی ہوئی تھی جس نے جنگ جوئی کی وحشت و بربریت کو شہسواری کے ورزشی کھیلوں سے بدل دیا اور عشق و محبت نے جو ادب العالیہ پیدا کیا اور عورت سے جو محبت تراشا وہ اسی روح کا فیض تھا جو عربی شاعری نے پیدا کی تھی اور موشحات کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کیا آٹھویں صدی میں اسلیبشی زبان میں غیر نفسانی بے لوث پاک یعنی افلاطونی محبت کی تحریک کا آغاز ہوا

تھا اس پر عربی شاعری کا اثر قطعی طور پر نمایاں ہے اس کا اثر بروفنسال شاعری پر اس حد
تک ہوا جس کو پروفیسر حتی اپنی کتاب "عرب اور اسلام" میں یوں بیان کرتے ہیں "گیارہویں
صدی کے اخیر میں جنوبی فرانس کے اولیں پروانسی Troubadour شعراء عشق و محبت کی
شعلہ سامانیوں کو عجیب و غریب پر بہار تخیل کے سانچوں میں ڈھالتے بڑے پر زور شور کے
ساتھ نمودار ہوتے ہیں قرون وسطیٰ کے غزل گو شاعر جنہیں بارہویں صدی میں فروغ حاصل
ہوا تھا اپنے جنوبی "غزل سرا" Minnesanger معاصروں ہی کے پیرو تھے عربی مثالوں
کو بھی اپنے سامنے رکھ کر جنوبی یورپ میں "مسلک ظرافت" Cult of Dame یکایک
نمودار ہوئی ابتدائی یورپ کی سب سے بڑی یادگار جاں سن دی رولاں" Chanson de Roland
جو ۱۰۸۰ء میں لکھی گئی جس طرح ہومر Homer کی نظموں سے تاریخی یونان کے آغاز کا
پتہ چلتا ہے بالکل اسی طرح جان سن رولاں سے بھی ایک نئے مغربی یورپ کے تمدن کے
آغاز کے آثار و علامات کا سراغ ملتا ہے یہ کتاب اپنی تخلیق کے لحاظ سے ایک ایسے فوجی
ربط کی رہین منت ہے جو اہل یورپ نے اس زمانہ میں اسلامی اسپین سے قائم کیا تھا" سچ
تو یہ ہے کہ بقول پروفیسر حتی "یورپی ادب پر عربی زبان کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ اس نے
اپنی طرز انشاء کا جو اثر ڈالا اس کی بدولت معمولی تخیل کو سخت ترین ذہنی بندشوں سے
رہائی نصیب ہوئی جن میں وہ روایات کے ہاتھوں گرفتار تھے" اسپینی ادب کے اعلیٰ مزاج
میں جس طرح عربی نمونوں کی جھلک صاف نظر آتی ہے مثلاً سروانٹس کی کہانی "دان کوشیوٹ"
دکوئیک راٹ Don Quixote کی ظرافت اور بذلہ سنجی میں یہی رنگ دکھائی دیتا ہے بالکل
اسی طرح یہ افلاطونی محبت بھی اسپین میں عرب ہی کے اثرات ہیں جس نے بروفنسال شاعری
میں اپنا گھر کر لیا۔ یہ مسحور کرنے والی محبت نازک و لطیف جذبات زیب و زینت و آرائش
اور ادبی محاسن سے معمور وہ محبت نہیں ہے جس کو معمولی یا جذباتی محبت سے تعبیر کیا جائے
یہ ایک درد انگیز اصول ہے عجیب و غریب نازک طریقہ ہے ایک فطری حالت ہے جو اپنے

کمال کا نمونہ عام عورتوں میں نہیں پاتا بلکہ بیوی میں پاتا ہے جس کی عزت و احترام اور حفاظت کی پاسداری اور حسن کی بے لوث محبت کا خیال ایک اخلاقی قوت پیدا کرتا ہے جس سے شاعر کی زندگی نہایت پُرشان و شوکت ہو جاتی ہے یہ فنِ محبت یہ عورت کا ادب لعالیہ یہ خاتونی محبت کا طریقہ کہاں سے آیا بروفالساوالے اپنی ابتدائی شاعری میں اس سے بالکل نابلد تھے ان کے تروبادور Troubadours کی تحریریں بالکل غنائی تھیں lyrical رزمیہ epic نہ تھیں یہ ضرور بروفنسا کی شاعری کے لئے باعث فخر ہے کہ انھوں نے اولوالعزمی اور نازک خیالی کے محاسن کا خیال رکھا اور زمانہ میں برائیوں کے باوجود بلند خیالی کے عزت و احترام کی حفاظت کی جذباتِ محبت اور رموزِ محبت میں تروبادور کو عرب کی شاعری سے جو گہرا تعلق ہے وہ بروفنسا کی شاعری میں روزِ روشن کی طرح نمایاں ہے مسلمان کے نزدیک عورت ایک دیوی ہے اور غلام بھی اور اس کا حرم مندر بھی ہے اور قید خانہ بھی اس کا حرم ان تمام آراستگی اور نازک خیالات کا مجموعہ ہے جو حماسی شاعری میں نمایاں ہے اسی کی وجہ سے عربی و فارسی قصائد بروفنسال کے گانوں کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے یہ پاک بے لوث اور افلاطونی محبت اس زمانہ کے اخلاق سے نہیں پیدا ہوئی جس کی تصویر اس زمانہ کے ادب میں نمایاں ہو عورت بقول Brunetière قرون وسطیٰ کی متوسط زندگی میں حد درجہ کی ذلیل اور ہر قسم کی قوت اور وحشیانہ برتاؤ کے لئے سرنگوں ہوتی تھی اور نہ ہی یہ خیال شیفالیہ نظموں chansons کے نمونہ کمال میں پائی جاتی ہیں جس کی ابتدا صرف امرار کے خوش کرنے کے لئے ہو رہی تھی یہ ضرور ہے کہ یورپ میں جابجا کسی قدر عورتوں کے احترام کا جذبہ تھا وہ حضرت مریم کی پاکیزہ زندگی کا لحاظ کرتے ہوئے بعض عورتوں کو فرشتہ صفت دیوی سمجھتے تھے مگر اصولی حیثیت سے تو یہ بات تھی لیکن عمل اس کے بالکل خلاف تھا اس قسم کا نازک خیال و فطری جذبات یہ عورت کا نیا ادب لعالیہ و ذہنی فطری محبت اور پاکیزہ خیالی کنیسہ کی پاک دامن اور اچھوت عورتوں کے نمونہ کمال سے بالکل مختلف تھا یونانی اور لاطینی ادب چاہے وہ عہد زریں ہی کا ہو مگر اس کی روحانی بنیاد کا پتہ نہیں دیتی

مگر اس کا وجود یقینی طور پر ان کی شاعری میں نمایاں ہے جس کا واحد ذریعہ اور ممکن سرچشمہ عرب اندلس کی شاعری ہی ہو سکتی ہے گیارہویں صدی سے پہلے بلکہ بہت پہلے عرب کی شاعری اوجِ کمال پر تھی اور عرب کے قدیم زمانہ بلکہ ہر زمانہ کی شاعری کبھی بھی اس قسم کی پاکیزہ محبت اور فطری جذبات سے خالی نہ تھی کہ زمانہ جاہلیت میں اس بے لوث افلاطونی محبت کا ذکر نہایت صیقل زبان میں نادر استعارات و دل کش تشابیہ میں عمدہ عروض کے بحر و اوزان اور بے عیب قوافی لوازمات کے ساتھ ساتھ (کیوں کہ یہ عنصر صرف عرب میں قدیم سے پایا جاتا ہے) بیان کیا جاتا تھا ہر ہر غزل و قصائد میں نسیب و تشبیب کا ذکر لابدی تھا شاعر اپنی معشوقہ سے جدائی و ہجر کا غمگین خیال اور پاکیزہ محبت ہر اس موقع پر جب وہ اپنی معشوقہ کے مکانات کے کھنڈرات سے گذرتا تھا تو ضرور کرتا تھا نظم کی ابتدا ہی اس سے کرتا تھا کیوں کہ محبت کا تقاضا بھی یہی تھا جو ان کی تمام شاعری میں نمایاں ہے مثال کے لئے چند اشعار زمانہ جاہلیت کے درج کرتا ہوں:—

قفا نبك من ذكرى حبيب و منزل ۔۔۔ بسقط اللوى بين الدخول فحومل

كانى غداة البين يوم تحملوا ۔۔۔ لدى سمرات الحى ناقف حنظل

(امرء القیس)

عوجو فحيوا لنعم و منة الدار ۔۔۔ ماذا تحيون من نوى و احجار

و قد ارانى و نعما لاهيين بها ۔۔۔ و الدهر و العيش لم يهمم بامرار

ايام تخبرنى نعم و اخبرها ۔۔۔ ما اكتم الناس من حاج و اسرارى

(نابغہ)

ما بكاء الكبير بالاطلال ۔۔۔ و سوالى و ما ترد سوالى

دمنة قفرة تعاورها الصيف ۔۔۔ بريحين من صبا و شمال

لا تاتى ذكرى بجيرة ام من ۔۔۔ جاء منها بطائف الاهوال

(اعشی)

یا دار عبلة بالجواء تکلمی　　　وعمی صباحا دار عبلة واسلمی

(عنترہ)

اذ ننتنا ببینها اسماء　　　رب ثاو یمل منه الثواء

(حارث بن حلزہ)

لخولة اطلال ببرقة ثهمد　　　تلوح کباقی الوشم فی ظاهر الید

وقوفا بها صحبی علی مطیهم　　　یقولون لا تهلک اسی وتجلد

(طرفہ)

امن ام اوفی دمنة لم تکلم　　　بحومانة الدراج فالمتثلم

فلما عرفت الدار قلت لربعها　　　الا انعم صباحا ایها الربع واسلم

(زہیر)

اور دیکھیے

سلی البانة الغیناء بالاجرع الذی　　　به البان هل حییت اطلال دارک

وهل قمت فی اظلالهن عشیة　　　مقام اخی الباساء واخترت ذلک

وهل هملت عینای فی الدار غدوة　　　بدمع کنظم اللولوء المتهالک

اری الناس یرجون الربیع وانما　　　ربیعی الذی ارجو نوال وصالک

اری الناس یخشون السنین وانما　　　سنیتی التی اخشی حروف احتمالک

لئن ساءنی ان نلتنی بمساءة　　　لقد سرنی انی خطرت ببالک

لیهنک امساکی بکفی علی الحشا　　　ورقراق عینی رهبة من زیالک

جب شاعری شہروں میں پھیلی محبت کا عنصر زیادہ مضبوط ہونے لگا بلکہ نئی نئی ترکیبیں اور لطیف جذبات شامل ہوتی گئیں شعر غنائی کا دور دورہ ہوا شاعری اپنی ذاتی عواطف اور فطری محبت کا مظاہرہ کرتی رہی پھر درباری شعراء کے یہاں بھی شعر غنائی ایک خاص قسم کے راگ نغمۂ لحن و ترنم رقص و سرود اور ادبی لچک قوافی و اوزان کے ساتھ ساتھ اصل عواطف کو جوش میں لائے

اور جذبات کو اُبھارنے کے لئے استعمال کیا گیا صوفیوں میں بھی اسی عشق مجازی کے لباس میں روحانی
محبت کا ذکر ہونے لگا تاکہ وہ اس طرح سے معشوقِ حقیقی کی اطاعت بحسن و خوبی انجام دے
سکیں یہی وہ فطری اور پاکیزہ محبت ہے جس کا گہرا اثر پروفنسا کی شاعری پر پڑا اس نئی غنائی شاعری
Provençal poetry کی ایک خصوصیت یہی افلاطونی محبت کی بنیاد ہے جس میں محبت کے
معاشرتی اصول اور اخلاقیات بھی شامل ہو گئے جو عرب کی ایک نمایاں خصوصیت اور قابلِ داد
اور لایقِ دید خدمت ہے آٹھویں صدی کے اخیر میں بغداد کے دربار میں کچھ شعرا اپنے گانے کی دیوی
خیالات و جذبات [illegible] کو بالکل اسی فنِ محبت کے لئے استعمال کر رہے تھے ابن داؤد
نے [illegible] کتاب الزہرہ Book of Venus میں محبت کے تمام نظریات، اس کی
فطرت، اصول، تاثرات کے اصول اس نمونۂ کمال کے مطابق مرتب کیا جس کو حدیث میں
ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے "من یحب ویکتم حبہ[1] ویحیی عفیفا ویموت فھو شہید"
whoso loves and conceals his love, remains chaste and dies, that one by a martyr —
مسلمانوں کی تہذیب کی وسعت اور ان کی مفتوحہ حکومتوں کا باہمی اختلاط سے اس قسم کی شاعری
اندلس میں نمودار ہوئی اور یہاں شمال کے عیسائیوں سے مسلسل لڑائیوں کی وجہ سے جو باہمی ارتباط
ہوا اس سے اس فن نے زیادہ فروغ پایا عرب کی شاعری اور محاسن کا یہیں مظاہرہ ہوا یہاں
شعرا میں سعید بن جوزی Said ibn Judi بقولِ ڈوزی شعرِ غنائی کی ایک بین مثال ہے
یہاں بھی افلاطونی اور غیر نفسانی محبت کے نمونۂ کمال کو عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ ابنِ حزم
Ibn Hazm جو نہایت متقدر مذہبی آدمی تھا جس کی عزت و احترام مذہب کے تقابلی علوم کے
بانی ہونے کی حیثیت سے تمام مغرب میں کی جاتی تھی وہ بھی اس کی دوسری شاندار مثال ہے
انھوں نے بھی محبت پر ایک رسالہ لکھا جو کتاب الزہرہ Book of Venus سے بھی سبقت لے
گیا وہ محبت کے افلاطونی اصول سے بالکل متفق ہے اس نے محبت کی ایسی عمدہ تشریح کی ہے
جو اس کے بعد میں آنے والی صدی میں تروبادور Troubadours کے یہاں پائی جاتی ہے اگرچہ یہ
لوگ اس بلندی تک نہ پہنچ سکے اسی درباری شعرا کے تروبادور بہت متاثر ہوئے۔ لیکن
یہاں ایک دشواری اور اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ متقدمین ترابادور عربی نہیں جانتے تھے تو پھر
کون وہ درمیانی حضرات تھے جنہوں نے اس فن کو اندلس سے پروفنسا کی طرف منتقل کیا۔

[1] حدیث کا عربی ترجمہ ہے۔ جو محبت کرتا ہے اور اپنی محبت کو چھپا لیتا ہے اور عفت کی ساتھ زندہ رہ کر مر جاتا ہے وہ شہید ہے

عروج وزوال کے الٰہی قوانین

از

(جناب مولوی محمد تقی صاحب امینی)

(۸)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو برہان بابت ماہ اپریل)

حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے

ان اللہ تعالیٰ فرض علی الاغنیاء فی اقواتھم بقدر ما یکفی فقراءھم فان جاعوا اوعروا اوجھدوا فبمنع الاغنیاء وحق علی اللہ ان یحاسبھم ولیعذبھم

اللہ تعالیٰ نے مالداروں پر غریبوں کی معاشی ضروریات بقدر کفایت پوری کرنا فرض کر دیا ہے اگر وہ ننگے بھوکے یا اور کسی معاشی مصیبت میں مبتلا ہوں گے تو محض اس وجہ سے کہ مالدار ان کا حق نہیں دیتے ہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حساب لے گا اور انھیں عذاب دے گا۔

حالات ومقامات کے اختلاف کی بناء پر زمین وجائداد کے فیصلے بھی مختلف ملتے ہیں کہیں رسول اللہ نے زمین تقسیم کر دی ہے اور کہیں نہیں تقسیم کی صحابۂ کرام نے کبھی کسی کو زمین بطور عطیہ دیا ہے اور کبھی دے کر واپس لے لیا ہے اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لئے کتاب "اسلام کا زرعی نظام" مطالعہ کرنا چاہیئے۔

حالات کی تبدیلی ہی کی بناء پر رسول اللہ کے دئے ہوئے بہت سے عطیے صحابہ نے واپس لے لئے تھے اور بہت سے نہیں لئے تھے۔ اسی طرح کہیں رسول اللہ نے سختی برتی اور کسی شی کی اہمیت پر بہت زور دیا صحابہ نے وہاں نرمی برتی اور اس کی جگہ دوسری شی کی اہمیت

پر زیادہ زور دیا۔ اس قسم کی مثالیں تاریخ میں بکثرت ملتی ہیں۔

تاریخ کو جب تک اس حیثیت سے سمجھنے کی کوشش نہ ہوگی نہ اسلام کا مزاج سمجھ میں آئے گا اور نہ ہی اس دور میں کوئی مفید اور قابلِ قدر خدمت انجام دی جا سکے گی۔

قرآن حکیم کے بیان کی تفصیلات سے عمل صالح پر استدلال

قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں۔ معاشرتی و معاشی اخلاقی و سیاسی تہذیبی و تمدنی وغیرہ تمام چیزوں کے احکام موجود ہیں اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ قیام و بقاء کے سلسلہ میں ان سب کو خاص اہمیت حاصل ہے اور دوسری یہ کہ قرآن کی نظر میں صاحب صلاحیت قوم وہی ہو سکتی ہے جس نے مجموعی حیثیت سے اس کی بیان کردہ چیزوں میں اہلیت و صلاحیت پیدا کی ہو۔

اگر زندگی کے صرف ایک گوشہ میں جدوجہد کرنے سے قرآنی صلاحیت کا "سرٹیفکیٹ" مل جاتا تو پھر اسے اس قدر تفصیل سے بیان کرنے اور تمام گوشوں کے احاطہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

چوں کہ دنیا مادی لحاظ سے ترقی کرتی جارہی ہے اس لئے قرآنی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے زمانہ کے تقاضے کی مناسبت سے جدوجہد کرنا ضروری ہے۔

صلاحیت پیدا کرنے کے لئے رسول اللہ کے مختلف انتظامات

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس صالح سوسائٹی کے قیام و بقاء کی ضمانت لے کر آئے تھے اخلاقی تربیت کے ساتھ اس زمانہ کے لحاظ سے تہذیب و تمدن کی تمام ضرورتوں کو لازمی قرار دیا تھا مثال کے طور پر چند یہ ہیں:-

(۱) آپ نے تعلیم پر بہت کافی زور دیا اور اس کو عام کرنے کے لئے مختلف انتظامات کئے۔ قرآن حکیم میں علم کے بارے میں بے شمار آیتیں ملتی ہیں اور تقریباً یہ سب آیتیں مکی دور کی ہیں جو قومی زندگی میں صلاحیت پیدا کرنے کا ابتدائی زمانہ تھا۔

(۲) آپ نے صحابیوں کو دوسری زبانیں سیکھنے کا حکم دیا چنانچہ حضرت زید بن ثابت نے فارسی۔ حبشی۔ عبرانی اور رومی (یونانی) زبانیں سیکھ لی تھیں اور حضرت عبد اللہ بن زبیر

کثیر زبانوں کے ماہر تھے۔

اسی طرح مختلف علوم وفنون سیکھنے کی تاکید فرمائی ریاضی۔ طب۔ علم ہیئت۔ علم انساب۔ علم تجوید وغیرہ۔ نشانہ بازی۔ تیراکی۔ شہ سواری۔ تلوار چلانا وغیرہ۔

(۳) فنونِ حرب کی ترقی پر آپ نے خصوصیت کے ساتھ توجہ فرمائی اور اس سلسلہ میں ہر اچھی چیز جہاں سے ملی اختیار کرنے کا حکم دیا۔ صف بندی کو نہایت منظم کیا اور نماز کے ذریعہ صف بندی کی تربیت کی روزے کے ذریعہ ہر موسم میں بھوک پیاس برداشت کرنے کی مشق کرائی حج کے ذریعہ کوچ کرنے اور قیام کرنے کی عادت ڈلوائی زکوٰۃ کے ذریعہ خرچ کرنے کی اسپرٹ پیدا کی فوجوں کی مشقیں، گھوڑوں اونٹوں اور گدھوں کی دوڑ تیر اندازی کا مقابلہ فوجی اسپورٹ سرکاری اصطبل اسلحہ خانہ وغیرہ سب کا ذکر تاریخ میں محفوظ ہے۔

(۴) نوجوانوں کی تربیت اور ان کی حوصلہ افزائی کو آپ نے بہت زیادہ اہمیت دی اور اُن کی ذاتی صلاحیتوں کو دیکھ کر یک فنی مہارت کا موقع بہم پہنچایا چنانچہ کوئی حساب میں ماہر تھا اور کوئی سپہ سالاری میں کوئی قانون سازی وتاریخ میں اور کوئی تجارت و زراعت میں کوئی صنعت وحرفت میں اور کوئی سیاست میں کوئی کاروبار میں اور کوئی نظم ونسق کے چلانے میں غرض زندگی کے تمام شعبوں میں نوجوانوں نے حصہ لیا اور حتی الامکان آپ نے اس کا انتظام فرمایا نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کے سلسلہ میں اسپورٹ مردانہ کھیل کشتی اور انعامی مقابلہ وغیرہ کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

(۵) معاشی تنظیم کی طرف آپ نے سب سے پہلے توجہ فرمائی چنانچہ مکہ میں نومسلموں کے درمیان بھائی چارہ کا نظام قائم کیا اور مدینہ پہنچنے کے بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان اس نظام کو قائم کیا یہ عملی طور پر باہمی تعاون واشتراک کا نظام تھا۔

(۶) عورتوں کی تعلیم وتربیت کا آپ نے علیحدہ انتظام کیا اور مختلف مشغلوں کی طرف جو ان کے لئے موزوں تھے آپ نے انھیں توجہ دلائی۔

اسلام سے پہلے دنیا کی ترقی صرف مردوں کی اخلاقی و دماغی قوتوں کی کرشمہ سازی تھی پیغمبر اسلام نے دونوں کو وسائل ترقی میں شریک ٹھہرایا اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جنت میں جس وقت حضرت آدمؑ کی ٹریننگ ہو رہی تھی اس وقت حضرت حواؑ بھی ان کے ساتھ تھیں یعنی ابتدا ہی سے یہ پالیسی متعین ہو چکی تھی کہ دنیا کے گلشن کو سجانے میں عورت و مرد دونوں اپنی اپنی حیثیت و صلاحیت کے مطابق شریک ہوں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پالیسی کو عملاً نافذ کیا اور حدود و قیود متعین کر کے زندگی کی جد و جہد میں انھیں حصہ لینے کا موقع دیا چنانچہ بہت سی صحابیات کپڑے بُنتی جو اُن کے گھر کے لئے کافی ہوتا بعض دباغت (رنگائی) و دستکاری اور سینا پرونا وغیرہ کرتی تھیں بعض معلمہ تھیں اور بعض جراحی اور طب میں ماہر تھیں بعض فقہ و حدیث و تفسیر کی امامہ تھیں غرضا اس طرح مختلف کاموں کے ذریعہ ایک طرف تو وہ زندگی کو خوش حال بنانے میں مددگار ثابت ہوتیں اور دوسری طرف عضو معطل بن کر سوسائٹی کے لئے بار نہ بنتی تھیں۔ اس کے علاوہ زنانہ رضاکار کی حیثیت میں جنگ کے موقع پر وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں انھیں پانی پلاتیں تیر بیا چُن کر اپنے ساتھیوں کو دیتیں اور ضرورت پڑنے پر خود تلوار کھینچ کر میدان میں اتر آتی تھیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ فنونِ مدافعت عورتوں کو ضرور سکھائے جاتے رہے ہوں گے۔ مقررہ حدود و قیود کی پابندی کرتے ہوئے مسلم خواتین کے عملی سیاسی علمی و مذہبی اتنے شاندار کارنامے تاریخ میں محفوظ ہیں کہ اس ترقی یافتہ آزادی کے دور میں مشکل سے اس کی نظیریں ملتی ہیں۔

زمانۂ خلافت میں دینی اور قومی خصوصیات کو محفوظ رکھتے ہوئے مفید چیز جہاں سے بھی ملی لے لی گئی تھی

(۷) قیام و بقاء کی جد و جہد کے سلسلہ میں قومی زندگی میں صلاحیت پیدا کرنے کے لئے اگر کچھ چیزیں دنیا کی دوسری قوموں سے لینی پڑیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے اس میں کسی قسم کا دریغ نہیں فرمایا۔ مثال کے طور پر چند یہ ہیں۔

خیبر کی لڑائی میں منجنیق سے دشمن کے قلعے پر پتھر برسائے گئے تھے طائف کے محاصرہ میں دبابہ اور غرادہ کا استعمال کیا گیا تھا یہ لڑائی کے ہتھیار یونانیوں اور ایرانیوں سے لیے گئے تھے منجنیق کی ترقی یافتہ شکل موجودہ دور میں حرکت کرنے والی ٹینک کی صورت میں نظر آتی ہے غرادہ ۔ منجنیق ہی کی طرح پتھر وغیرہ دور پھینکنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

دبابہ ۔ ایک پہیے والی گاڑی ہوتی تھی جس کے اوپر کوئی موٹا چمڑا منڈھ دیا جاتا تھا تاکہ تیروں سے اندر رہنے والے آدمیوں کو تکلیف نہ پہنچائی جا سکے ۔ غرادہ فصیلوں کو اکھاڑنے وغیرہ کے کام میں استعمال کیا جاتا تھا۔

غزوۂ خندق میں خندق کھود کر پناہ لینے کی ترکیب ایرانیوں سے لی گئی تھی ۔ خندق فارسی لفظ کندہ کا معرب ہے ملکی نظم ونسق اور طریقۂ جنگ کے سلسلہ کی بہت سی باتیں یونان اور ایران سے لی گئی تھیں۔

خراج اور جزیہ کے قوانین میں نوشیرواں کے مرتب کردہ قانون سے استفادہ کیا گیا تھا فوج اور خزانہ کا دفتر قائم کرنے میں رومیوں سے استفادہ کیا گیا تھا ارسطو اور بقراط کی طب جو آج مسلمانوں کی طب سمجھی جاتی ہے وہ یونان سے لی گئی تھی۔

اسی طرح جنازہ رکھنے کا تابوت حضرت زینب کی وفات میں حبشہ سے لیا گیا تھا۔

لباس کے سلسلہ کی بعض چیزیں بھی دوسروں کی رائج ہوگئی تھیں[1]

حاصل یہ ہے کہ زمانۂ خلافت میں دینی اور قومی خصوصیات کو محفوظ رکھتے ہوئے جہاں سے جو مفید چیز ملی اس کے اختیار کرنے میں کسی قسم کا تامل نہیں ہوا اور یہی چیزیں بعد میں اسلامی تہذیب وتمدن کا جزو بنیں الغرض اس طرح زندگی کے تمام گوشوں میں صلاحیت پیدا کرکے قیام وبقا کی جدوجہد ہوئی تھی جب کہیں جاکر مسلم قوم دنیا میں اتنے دن زندہ رہنے کے قابل

---

[1] ان تمام تفصیلات کے حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو جمع الجوامع مؤلفہ سیوطی تحت عنوان علموا ۔ تعلموا ۔ تعلمن علموا اور علموا الصبیان وغیرہ از "عہد نبوی میں نظام حکمرانی" باب عہد نبوی میں نظام تعلیم ۔ نیز سیر الصحابیات اور مقالات شبلی ج اول۔

بن سکی تھی۔

یہ چیزیں بطور نمونہ کے پیش کی گئی ہیں جن سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قومی زندگی میں کیسی صلاحیت ہونی چاہیئے اور قیام وبقار کے لئے کس قسم کی جدوجہد درکار ہے۔ نیز زمانۂ خلافت میں حالات کے پیشِ نظر صلاحیت کا کیا معیار تھا اور آج کیا ہے؟

(۳) تواصی بالحق

قیام وبقار کا تیسرا بنیادی اصول تواصی بالحق ہے جس نظریۂ حیات کو حق مان کر قبول کیا ہے جماعت کا ہر فرد علمی اور عملی حیثیت سے اس کا مبلغ ہو اور اسی کے مطابق باہمد گر تعلیم و تربیت کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہو۔

اس کے مفہوم میں تعاون واشتراک کے ذریعہ ایک دوسرے کو تقویت پہنچانے اور آگے بڑھتے بڑھانے کا جذبہ بھی شامل ہے۔

تفصیل یہ ہے:۔

تواصی کی لغوی صرفی اور اصطلاحی تحقیق اور اس موقع پر مادہ وصیت لانے کا نکتہ

تواصی "وصیت" سے بنا ہے وصیت کا مادہ عام اصطلاح میں اس کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو انسان کہہ کر مرجاتا ہے لیکن قرآن حکیم کی خاص اصطلاح میں ہر تاکیدی اور واجبی حکم کے لئے مستعمل ہوتا ہے[1] مثلاً "ووصینا الانسان بوالدیہ احسانا" یہ عربی گرامر کے مطابق باب تفاعل سے ہے جس کی خاصیت تشارکت ہے جو مصدر اس باب سے آتا ہے اس میں بالعموم شرکت کے معنی پائے جاتے ہیں اور وہ شرکت ایسی ہوتی ہے کہ ہر فرد سے فعل کا صادر ہونا ضروری ہوتا ہے۔

باب مفاعلت کی خاصیت بھی مشارکت بیان کی جاتی ہے جس کے معنی باہمی شرکت کے ہیں لیکن ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ تفاعل میں صورۃ اور معناً ہر فرد فاعل ہوتا ہے اور مفاعلت میں معناً ہر ایک فاعل ہوتا ہے صورۃً نہیں صورۃ اور معنی کا مذکورہ فرق غالباً

[1] تفسیر عزیزی

اس لئے ہے کہ جس شدت اور یکسانیت کے ساتھ ہر فرد کی جانب سے فعل کا صدور اول الذکر میں ہوتا ہے ثانی الذکر میں وہ شدت اور یکسانیت ملحوظ نہیں ہوتی ہے اگرچہ اس میں بھی ہر ایک سے فعل صادر ہوتا ہے اور ہر ایک کے ساتھ دوسرا شریک ہوتا ہے۔

یہاں وصیت کا مادہ لانے میں نکتہ یہ ہے کہ قیام و بقاء کی جدوجہد اس وقت تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی ہے جب تک انسان اپنے مفاد کو اپنی مرغوبات کو فناء کرکے ترک و اختیار کی کسوٹی پر پورا نہ اترے، چوں کہ ایسی صورت میں کسی مقصد کے حصول کے لئے گویا اپنے آپ کو فناء کرنے والا ہوتا ہے اس لئے اس کے قول و فعل کی نوعیت یکسر بدل جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں اعضاء و جوارح زبان و قلم عقل و دماغ غرض سب کچھ دوسرے کے بقاء کا سامان فراہم کرنے کے لئے وقف ہو جاتے ہیں اور اس طرح ساری جدوجہد دوسروں کے مفاد سے متعلق ہو جاتی ہے جس طرح وصیت کرنے والے کی وصیت کا تمام تر تعلق دوسروں سے وابستہ ہوتا ہے اور موصی (وصیت کرنے والا) کی ذات کا سوال نہیں باقی رہتا ہے[1]

اس کے علاوہ ایک اور بات یہاں خاص اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ وصیت بالعموم عزیز قریب رشتہ دار وغیرہ کے لئے کی جاتی ہے جن سے نہایت قریبی تعلق ہوتا ہے اور جن کی مصیبت و تکلیف برداشت کے قابل نہیں ہوتی ہے اس لفظ کے لانے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہی حال بالکل قومی اور جماعتی زندگی کا ہے کہ آپس میں افراد کا تعلق اتنا گہرا ہو کہ ایک کی تکلیف کے تصور سے دوسرا بےچینی محسوس کرے اور اس کے لئے جو کچھ کہہ سکتا ہو یا کرسکتا ہو آخر دم تک کہتا اور کرتا رہے۔

تواصی میں ذمہ داری اور نگرانی کا مفہوم پایا جاتا ہے

لفظ وصیت میں ایک اور بات خصوصی توجہ کی مستحق ہے وہ یہ کہ دوسرے کے لئے کرنے اور کہنے میں اپنی ذمہ داری محسوس کرے یعنی اندر کے ابھار اور قلبی میلان کے باوجود یہ بھی سمجھے کہ میں اس کا ذمہ دار ہوں اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنا میرا فرض منصبی ہے کلام عرب میں یہ مادہ جہاں کہیں استعمال ہوا ہے اگر بطور کنایہ استعمال نہیں

[1] تفسیر عزیزی

کیا گیا ہے تو مذکورہ مفہوم کا ضرور لحاظ رکھا گیا ہے اسی بنا پر " وصی " اس کو کہتے ہیں جسے ذمہ دار بنایا جاتا ہے اور جس کے سپرد معاملہ کیا جاتا ہے۔

" والوصی اسم یقع علی من تکل الیہ امرک " محاورہ ہے " کن وصی نفسک " تو اپنا وصی (ذمہ دار و نگراں) بن جا " کن من توصی الیہ بنفسک "

اسی ذمہ داری اور نگرانی کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ (الحدیث)	خوب غور سے سن لو ہر شخص تم میں کا راعی ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں بازپرس ہوگی۔

رعی کے معنی " حفظ الغیر لمصلحتہ "[1] دوسرے کی مصلحت کے پیش نظر اس کی حفاظت و نگہبانی کرنا اس لحاظ سے راعی اس کو کہتے ہیں جو کسی کا منتظم اور نگراں ہو " الراعی " کل من ولی امر قوم "[2]

چونکہ قومی اور جماعتی زندگی میں ہر فرد دوسرے کا ذمہ دار اور نگراں ہوتا ہے اس لئے جب تباہی و بربادی آتی ہے تو سب اس کی زد میں آجاتے ہیں ظالم و بدکار تو اس بنا پر کہ وہ مجرم ہیں اور غیر ظالم و بدکار اس لئے کہ انھوں نے ظالم کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑا جس طرح آگ جب محلہ میں بھڑک اٹھتی ہے تو صرف لگانے والے ہی کو نہیں جلاتی بلکہ سبھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں اور اس لئے آجاتے ہیں کہ ان لوگوں نے لگانے والے کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑا یا جب وہ لگا چکا تھا تو بروقت بجھانے کی کوشش کیوں نہ کی۔ درج ذیل آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ واعلموا ان اللہ شدید العقاب ۸۵	اور اس فتنہ سے بچتے رہو جس کی زد صرف انھیں پر نہ پڑے گی جو تم میں سے ظلم کرنے والے ہیں بلکہ سبھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں اور یاد رکھو

[1] بیضاوی۔ [2] المنجد

کہ بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

اس آیت میں اجتماعی زندگی کے تمام ان چھوٹے بڑے خطرات کی طرف اشارہ ہے جو آگے چل کر ہلاکت وبربادی کا موجب بنتے ہیں، ابتداء میں ان کی حیثیت چوں کہ معمولی ہوتی ہے اس بنا پر ان کی طرف توجہ کرنے کی بظاہر ضرورت نہیں محسوس ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ اس درجہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ ان کی وجہ سے پوری قوم بھسم ہو کر رہ جاتی ہے [۱]

قرآن حکیم کا یہ کارنامہ نہایت شاندار اور معجزانہ ہے کہ اس نے نہ صرف ایمان اور عملِ صالح کا جامع نظام پیش کر کے خطرات کے انسداد کا انتظام کیا بلکہ "تواصی بالحق" کے ذریعہ اس نے ہر فرد کو ذمہ دار ٹھہرایا۔

الحق کی لغوی تحقیق | الحق - حق یحق کا مصدر ہے جس کے معنی ثبوت اور قیام کے ہیں۔ اور حق کے لغوی معنی ثابت۔ قائم۔ اٹل۔ امٹ کے ہیں کلام عرب میں یہ لفظ جہاں کہیں استعمال ہوتا ہے وہاں ثبوت۔ قیام۔ نہ ٹلنا۔ نہ مٹنا وغیرہ الفاظ کے مفہوم کا پایا جانا یقینی ہے،

---

[۱] اس مفہوم کے سمجھنے میں ذیل کی دو حدیثیں مدد پہنچاتی ہیں۔

قیل یا رسول اللہ انہلک وفینا الصالحون قال نعم اذا کثر الخبث — رسول اللہ سے لوگوں نے سوال کیا کہ کیا ہم لوگ ایسی حالت میں بھی ہلاک کر دئے جائیں گے جب کہ صالحین ہم میں موجود ہوں گے تو آپ نے فرمایا کہ ہاں جب خباثت زیادہ ہو جائے گی۔

ایک اور حدیث میں ہے

ما من قوم یعمل فیھم بالمعاصی ھم اکثر ممن یعمل فلم ینکروا الا عمھم اللہ بعذاب — جس قوم میں لوگ معاصی کا ارتکاب کرتے ہیں اور وہ زیادہ ہو جاتے ہیں اور دوسرے لوگ ان پر نکیر نہیں کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا عذاب سب کو عام ہوتا ہے یعم الجمیع من العاصین ومن لم یعص اذا لم ینکرہ

(احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۶۱)

اسی بنا پر جو کپڑا نہایت مضبوط اور پائیدار بنا جاتا ہے اسے "ثوب محقق" ای ثوب محکم نسجہ کہتے ہیں[1] مفسرین کی تشریح اور عربی زبان کے ماہرین کی تحقیق سے یہی حقیقت مترشح ہوتی ہے، چنانچہ قاضی بیضاوی کہتے ہیں

الحق الثابت الذی لا یسوغ انکارہ[2]	الحق وہ حقیقت ثابتہ ہے کہ جس کا انکار کرنا آسان نہ ہو۔

امام راغب اصفہانی کہتے ہیں

اصل الحق المطابقۃ والموافقۃ[3]	"الحق" کی اصلیت مطابقت اور موافقت ہے یعنی جب کہا جاتا ہے کہ یہ قول وفعل یا یہ شی حق ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حقیقت اور نفس الامر کے مطابق و موافق ہے

تفسیر مدارک اور تفسیر مظہری میں بھی بیضاوی جیسی تشریح کی گئی ہے[4]

البتہ مظہری میں قاضی ثناء اللہ نے لا یسوغ کا مطلب لا یجوز سے بیان کیا ہے اور بیضاوی کے محشی نے اس کا ترجمہ لا یصح سے کیا ہے

قرآن حکیم میں "سائغ" شرابہ آیا ہے جس کے معنی "سہل انحدارہ" (اس کا اترنا آسان ہے) کے ہیں۔

اس لئے مذکورہ "لا یسوغ انکارہ" کا ترجمہ "انکار کرنا آسان نہ ہو" سے کیا گیا ہے ورنہ اس موقع پر لا یصح اور لا یجوز وغیرہ سب درست ہیں۔

---

[1] حاشیہ بیضاوی ص۵۳ و روح المعانی ص۱۹۱۔

[2] بیضاوی ص۵۳

[3] مفردات القرآن از حاشیہ بیضاوی ولغات القرآن۔

[4] مدارک تفسیر سورۃ والعصر اور مظہری ص۳۲۴۔

ادبیات

غزل

(جناب الم مظفر نگری)

ذرا گرمیٔ پیغامِ وفا کا امتحاں کرلے
اثر کو جستجو رہتی ہے جس کی وہ فغاں کرلے

باحساسِ خودی ہستی کو اپنی رائگاں کرلے
جو کرنی ہے تو یوں حاصل حیاتِ جاوداں کرلے

قیامت ہیں تحمل سوز جلوے شمعِ محفل کے
کہاں تک ضبطِ غم پروانۂ آتش بجاں کرلے

فقط سجدوں سے تکمیلِ نیازِ عشق ناممکن
جبینِ شوق کو بھی نذرِ سنگِ آستاں کرلے

نہیں ممکن مجالِ گفتگو جب ان کی محفل میں
زبانِ خامشی میں داستانِ دل بیاں کرلے

امینِ راز اپنا دل بھی الفت میں نہیں ہوتا
تو پھر کس طرح کوئی اعتبارِ رازداں کرلے

بہل جائے اسیری میں ذرا دم بھر کو دل اپنا
قفس میں ہم نوا کچھ گفتگوئے آشیاں کرلے

طلب میں جامِ جم کی تابکے یہ سعیٔ لاحاصل
تو اپنے دل کے آئینے میں سیرِ دو جہاں کرلے

یہ حسرت اور بھی قیدِ قفس کو تلخ کردے گی
چمن سے چلتے چلتے طوفِ خاکِ آشیاں کرلے

نہ جانے کل تغیر کیا ہو رنگ و بو کی دنیا میں
ہر اک برگِ چمن محفوظ اپنی داستاں کرلے

کوئی حملہ بھی طوفاں کا ڈبو سکتا نہیں اس کو
مہیا جو نئے ساحل پہ ہر موجِ رواں کرلے

غنیمت ہے یہ تاراجیٔ گلشن کا زمانہ بھی
مرتب داستانِ انقلابِ گلستاں کرلے

بعافیت اگر صحنِ چمن میں تجھ کو رہنا ہے
کلی کو پھول کو شبنم کو اپنا ہم زباں کرلے

اس اوجِ کہکشاں کی کیا حقیقت ہے جو تو چاہے
ہر اک ذرے کو پھیلا کر جوابِ آسماں کرلے

الم ہستی میں عرفانِ توکل اس کو حاصل ہے
جو اپنی زندگی کو بے نیازِ دو جہاں کرلے

غزل

(سعید احمد)

غزل کے ساتھ جو خط میرے نام آیا ہے اُس میں تحریر ہے "ایک تازہ غزل ارسال کرتا ہوں اس میں خطاب آپ سے ہی ہے اور آپ کو اختیار ہے چاہے برہان میں دیں یا اپنے پاس ہی رکھیں آج کل ہندوستان میں مسلمانوں کی جو حالت ہے قلب پر اُس کا بہت اثر ہے اور نظم میں گھوم پھر کر کے انھیں احساسات کا اظہار ہو جاتا ہے" قدرے تامل کے بعد رجحان کچھ یہی ہوا کہ اڈیٹر برہان کے ان تاثرات سے ناظرین برہان کو بھی واقف ہی ہونا چاہیئے۔ (عتیق الرحمٰن عثمانی)

اب دید کا کچھ شوق نہ ارمانِ ملاقات — اب حرفِ تمنا نہیں ممنونِ کنایات

کہہ دو نہ کریں صیقلِ ابرو کی وہ تکلیف — منسوخ ہوئیں عشق کی دیرینہ روایات

اب وہ نہ کریں زحمتِ آرائشِ گیسو — اب دل نہ رہا غمزہ کا محتاجِ مدارات

کل تک تھا جسے حوصلۂ دعوتِ مژگاں — اب وہ ہے فقط منتظرِ مرگِ مفاجات

گذری ہی نہیں جیسے کوئی سر پہ قیامت — یوں لب سئے بیٹھے ہیں نہ شکوے نہ شکایات

احساس ہی باقی نہ رہا رنج و طرب کا — کیا عشق نے کی کشمکشِ غم کی مکافات

کیا خوب ملی دادِ وفا اہلِ وفا کو — کہتے ہیں "محبت بھی ہے از قسمِ جنایات

بجلی جو چمکتی تھی سرِ شاخِ نشیمن — روشن ہوئے سب داغِ اسیری کے نشانات

ہر چند کہ لطف و کرم عام ہے اُن کا — وہ سن نہ سکے مجھ سے کبھی میری شکایات

نسبت تجھے یکساں سہی ہر رند سے لیکن — ہم اب بھی تہی جام ہیں اے پیرِ خرابات

ڈر ڈر کے سنائی دلِ پُر غم نے کہانی — جیسے لبِ قیدی پہ کوئی حرفِ مناجات

عالم ہمہ سرمستِ مئے ساقیِ کوثر — اٹھی تھی نظر جھوم گئے ارض و سماوات

کہنے کو نیا عہد ہے آئیں بھی نیا ہے — انسان ہے لیکن وہی پابستۂ طاعات

دہقاں کو میسر نہیں اب تک بھی فراغت — ہر چند زمیندار ہے زندانیٔ آفات

کہہ دے کوئی اَتی[1] سے یہ جا کر کے سعید اب
آتے ہیں بہت یاد وہ دلّی کے مقامات

---

[1] مولانا عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے نام کی تصغیر جس سے ان کے بچپن کے بے تکلف دوست بربنائے محبت انھیں یاد کرتے تھے۔

تبصرے

اسلام اور غیر مسلم

از جناب مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب تقطیع خورد ضخامت ۲۵۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے۔ پتہ: مسلم اکاڈمی پھلواری شریف پٹنہ۔

اسلام اور مسلمانوں پر یہ پرانا اعتراض ہے کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ مسامیانہ برتاؤ نہیں کرتا اور مسلمانوں نے اپنی حکومت میں ان کے ساتھ نفرت وحقارت کا برتاؤ کیا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب نے چند سال ہوئے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اسلامی تعلیمات۔ یہ اسلامی تاریخ اور خود غیر مسلم مصنفین ومحققین کے بیانات کی روشنی میں اس اعتراض کی لغویت ثابت کی تھی۔ یہ کتاب چونکہ بروقت اور برمحل تھی جس کی موجودہ حالات میں ضرورت تھی۔ اس لئے بہت مقبول ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں میں اس کے دو ایڈیشن ختم ہوگئے۔ اب یہ زیر تبصرہ کتاب اس کا تیسرا ایڈیشن ہے۔ جس میں گزشتہ ایڈیشنوں پر اضافہ بھی ہے۔ امید ہے کہ یہ تیسرا ایڈیشن بھی مقبول ہوگا اور ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب کا ہندی ایڈیشن بھی شائع کیا جائے۔

اسوۂ حسینی

از مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی تقطیع خورد ضخامت ۱۰۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت آٹھ آنے۔ پتہ:۔ مکتبہ دار الاشاعت۔ مقابل مولوی مسافرخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی ۱ء۔

حضرت امام حسین کا واقعۂ شہادت جس قدر درد انگیز اور ہولناک ہے اسی قدر مسلمانوں کے لئے ایک زبردست پیغام عمل اور محرک بالفعل ہے لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ عام رسومات کی طرح مسلمان یوم حسین بھی مناتے ہیں اور اس کا بڑا اہتمام کرتے ہیں لیکن ان کی زندگی میں کوئی ایسی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی وہ جس میں اسوۂ حسینی کا عکس نظر آتا ہو۔ مولانا مفتی

محمد شفیع صاحب دیوبندی نے جو ہند و پاک کے اکابر علماء میں سے ہیں یہ رسالہ مسلمانوں کو اُن کی اسی غفلت پر متنبہ کرنے کی غرض سے لکھا ہے اور اس بناء پر پہلے پورا واقعہ شہادت از اول تا آخر کامل ابن اثیر سے اخذ کر کے لکھا ہے اور اُس کے بعد اس سے جو نتائج و عبر حاصل ہوتے ہیں اُن پر کلام کیا ہے مسلمانوں کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

اسلامی روایات از مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب تقطیع خورد ضخامت ۱۲۸ صفحات، کتابت وطباعت بہتر قیمت عہر پتہ :- مسلم اکاڈمی پھلواری شریف پٹنہ۔

تاریخ اسلام ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے جن کو اخلاق و مکارم اور فضائل و شمائل کا سب سے بڑا شاہکار کہا جا سکتا ہے اور یہ ہونا بھی چاہیئے کیوں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کی غرض انھیں مکارم اخلاق کی تکمیل بیان فرمائی ہے۔ لائق مصنف نے انھیں بے شمار واقعات میں سے چند اہم واقعات یک جا کر کے شائع کر دئیے ہیں جن میں غیر مسلموں کے ساتھ حسن خلق - عفو و درگذر - عدل و انصاف - حق پسندی - مروت - فیاضی اور سخاوت - دلیری اور شجاعت وغیرہ اخلاق کا بہترین مظاہرہ کیا گیا ہے - زبان اور انداز بیان شگفتہ ہے اس کا مطالعہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے مفید ہوگا۔

ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۵۵ء میں یہ حیدر آباد دکن کا مشہور ادارہ ہے جس نے اُردو زبان کی علمی ادبی عملی ہر طرح کی بڑی شاندار خدمات انجام دی ہیں اور اب آج کل بھی نامساعد حالات میں وہ اپنا کام برابر کئے جا رہا ہے ۱۹۵۵ء کے ماہ جنوری میں اس ادارہ نے اپنی سلور جوبلی بڑی ہمت اور عالی حوصلگی کے ساتھ منائی تھی اور اس کے ساتھ ہی ادارہ کی خود اپنی عمارت کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا گیا ہے۔ یہ کتابچہ اسی تقریب اور اس سے متعلقہ کارروائیوں کی روئداد ہے محمد جمال الدین صاحب مہتمم ادارہ نے اس کو مرتب کیا ہے۔ تقطیع کلاں۔ ضخامت ۳۶ صفحات قیمت ۸ر پتہ :- ادارہ ادبیات - خیریت آباد حیدر آباد دکن - جو حضرات ادارہ کے کام اور نام سے واقف ہیں اُن کے لئے اس روئداد کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

اسلامی تہذیب اور اُس کے اصول ومبادی از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، تقطیع خورد ضخامت ۲۹۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ دو روپیہ آٹھ آنہ پتہ :- اسلامی مکتبہ نمبر ۱۳۷ بی کلاس معظم پورہ حیدر آباد دکن ۔

آج اسلامی تہذیب اور اسلامی کلچر کا نام ہر شخص کی زبان پر ہے ۔ لیکن اسلامی تہذیب کیا ہے ؟ اور اسلامی کلچر کسے کہتے ہیں ؟ کسی کے نزدیک اُردو زبان بولنا اور کرتہ پاجامہ پہننا یہ اسلامی تہذیب ہے اور کسی کی رائے میں علوم وفنون کا نام اسلامی کلچر ہے[1] حالانکہ اسلامی تہذیب خود ایک مستقل حقیقت ہے اور اس کی اصل بنیاد اور روح ایمان اور عمل صالح ہے جس کی تعلیم کے لئے انبیائے کرام تشریف لاتے رہے اور جس کی تکمیل سب سے آخر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ۔ یہی ایمان باللہ ہے جو کائنات عالم ۔ زندگی اور بنی نوع انسان کے باہمی روابط اور تعلق کے متعلق ایک انسان کا صحیح نقطۂ نظر متعین کرتا ہے اور اس کی پوری زندگی اور اُس کے تمام اعمال وافعال ۔ اُس کے سب جذبات واحساسات اسی ایک نقطۂ نظر کے مظاہر ہوتے ہیں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اس کتاب میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے اور دنیا کی دوسری تہذیبوں کا تجزیہ وتحلیل کر کے بسط وتفصیل سے بتایا ہے کہ ان میں کیا کیا خرابیاں ہیں اور ان کے بالمقابل اسلامی تہذیب کے اصل خط وخال کیا ہیں ؟ ان کا سرچشمہ کہاں ہے ؟ اور اس میں کیا کیا خوبیاں ہیں اس سلسلہ میں ایمان اور عمل صالح پر مفصل گفتگو کی گئی ہے لیکن ایمان وعمل کے باب میں جو شدید قسم کی بے اعتدالی موصوف کی دوسری تحریروں میں پائی جاتی ہے وہ اس میں بھی ہے ۔ کبائر کے ارتکاب سے خارج از ایمان ہو جانا خوارج کا مسلک ہے اہل سنت والجماعت اس کے شدید مخالف ہیں ۔ اگر خوارج کے معیار ایمان وکفر کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو آج پورے عالم کی ۹۵ فی صدی مسلم آبادی غیر مومن اور کافر ہو جاتی ہے ایسا

[1] اور ایک خیال یہ بھی ہے کہ اسلامی تہذیب بذات خود کوئی مستقل حقیقت نہیں ہے بلکہ عرب جس ملک میں گئے خود عربوں کی اور اُس ملک کی تہذیب کے پیوند سے جو چیز پیدا ہوئی وہی اسلامی تہذیب کہلائی ۔

کہنا اور لکھنا قرآن - حدیث - تاریخِ اسلام اور جمہور علماء ان سب کو پسِ پشت ڈالنا اور ان کی شان میں ناروا جرأت کرنا ہے۔ قرآن میں اور حدیث میں جگہ جگہ ضعیف ایمان کو بھی ایمان کہا گیا ہے۔ امام بخاری نے ایک مستقل باب ہی کفر دون کفر کا باندھا ہے جس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ کفر کی طرح ایمان کے بھی مدارج و مراتب ہوتے ہیں - خود عہدِ نبوت میں ضعیف الایمان اعراب موجود تھے - قرآن نے مختلف سورتوں میں ان کے ضعفِ ایمان کی پردہ دری کی ہے - لیکن کہیں بھی ان کو کافر اور منافق نہیں کہا اور نہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے ساتھ کافروں کا سا معاملہ کیا بلکہ حق یہ ہے کہ آپ نے اور اُلٹا تالیفِ قلب اور دل جوئی سے کام لیا آج کل کے بے عمل یا بد عمل مسلمانوں کو مطلقاً منافق کہنا اور عہدِ نبوت کے منافقوں کے بارے میں جو آیات اتری ہیں اُن سب کو ان پر منطبق کرنا ہرگز اسلام کی خدمت نہیں ہے کفر کی ہو تو ہو۔ کیوں کہ اس اطلاقِ عام سے کفر کا خاندان اور کنبہ بہت وسیع ہو جاتا ہے آج کل کے عام مسلمانوں کو عہدِ نبوت کے منافقوں پر قیاس کرنا یوں بھی قیاس مع الفارق ہے - اول الذکر کے ہاں ایمان ہے مگر عمل نہیں اور موخر الذکر کے ہاں عمل تھا مگر ایمان نہیں تھا آج کل کا بڑے سے بڑا فاسق و فاجر مسلمان بھی مصیبت میں گھر جاتا ہے تو بے ساختہ خدا کو یاد کرنے لگتا ہے - آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی کسی قسم کی گستاخی برداشت نہیں کر سکتا - قرآن مجید کی بے حرمتی پر تڑپ اُٹھتا ہے - کبھی تنہائی میں اس کو اپنے گناہ یاد آتے ہیں تو عذابِ آخرت کے ڈر سے اس پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے - یہ سب علامتیں کس چیز کی ہیں؟ ایمان کی اور تصدیق بالجنان کی - اس کے برخلاف عہدِ نبوت کے منافقوں کا حال یہ تھا کہ بظاہر مسلمانوں میں گھلے ملے رہتے تھے - نماز پڑھتے تھے - روزہ رکھتے تھے - ڈاڑھی اور مونچھ رکھتے تھے اور صحابۂ کرام جیسی وضع قطع میں رہتے تھے لیکن ان سب کے باوجود اپنی خلوتوں میں پیغمبر کا مذاق اڑاتے تھے - قرآن کی تکذیب کرتے تھے اور عقیدۂ یومِ آخرت کو جھٹلاتے تھے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

اس کے علاوہ فقدانِ عملِ صالح سے فقدانِ ایمان پر مطلقاً استدلال کرنا یوں بھی تجربہ و مشاہدہ اور عقل و فلسفہ اور سائنس کے بالکل خلاف ہے - ایک ناخلف اولاد کو بھی اپنے والدین سے محبت ہوتی ہے اور ان کے والدین ہونے کا اس کو یقین ہوتا ہے جو ایمان ہی ہے - ایک شخص زہر کو زہر سمجھ کر بھی کھا سکتا ہے ایک آدمی تلوار کو تلوار جانتے ہوئے بھی اپنی گردن پر مار سکتا ہے - بے شک ان سب صورتوں میں اس کو اپنے عملِ بد کی پاداش بھگتنی ہو گی - لیکن بہر حال آپ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس کو زہر اور تلوار کی اصل حقیقت کا بھی یقین نہیں تھا - اسلام کی طرف دعوت کا یہ طریقہ پیغمبرانہ دعوت کے بالکل خلاف ہے اور ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ کی ضد ہے - اس ایک خاص چیز سے قطعِ نظر کتاب اپنے موضوع پر مفید اور سبق آموز ہے اور مطالعہ کے لائق ہے -

ندوۃ المصنفین کی تاریخی کتابیں

غلامانِ اسلام

اسّی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات وفضائل اور کارناموں کا ایمان افروز بیان۔

قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔ مجلد چھ روپے آٹھ آنے۔

تاریخ اسلام پر ایک نظر

تاریخ اسلام کے تمام ادوار کے ضروری حالات و واقعات کی تفصیل تاریخ نویسی کے جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر، اسلوبِ بیان نہایت ہی دل نشین۔

قیمت چھ روپے۔

مجلد چھ روپے آٹھ آنے۔

مسلمانوں کا نظم مملکت

مسلمانوں کے نظامِ حکمرانی کی بصیرت افروز تاریخ، جس میں مسلمانوں کے آئینِ جہانبانی کے تمام شعبوں سے متعلق نہایت صاف اور روشن معلومات دی گئی ہیں۔

قیمت چار روپے۔ مجلد پانچ روپے۔

تاریخ مشائخ چشت

سلسلہ چشت کے صوفیائے کرام کی محققانہ تاریخ اور ان کے نظامِ اصلاح وتربیت کا مکمل تذکرہ لائق مطالعہ کتب۔

قیمت بارہ روپے۔ مجلد تیرہ روپے۔

تاریخ اسلام نو جلدوں میں

تھوڑے وقت میں تاریخ اسلام پڑھنے والوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ تاریخ ملت کے یہ تمام حصے مستند ومعتبر بھی ہیں اور جامع ومکمل بھی، طرزِ بیان نہایت شگفتہ ورواں، ترتیب دل نشین۔

نبی عربی صلعم قیمت بلا جلد [illegible]
خلافت راشدہ ۔ [illegible]
خلافت بنی امیہ ۔ [illegible]
خلافت ہسپانیہ ۔ [illegible]
خلافت عباسیہ اول بلا جلد [illegible]
خلافت عباسیہ دوم ۔ [illegible]
تاریخ مصر ومغرب اقصیٰ ۔ [illegible]
خلافت عثمانیہ ۔ [illegible]
تاریخ صقلیہ بلا جلد قیمت [illegible]
قیمت مکمل سیٹ غیر مجلد [illegible]
مجلد ۔ ۔ [illegible]

عرب اور اسلام

ڈاکٹر حتی کی مشہور ومعروف کتاب کا آسان اور نفیس ترجمہ۔

قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ مجلد چار روپے آٹھ آنے۔

حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے

قرونِ وسطیٰ کے حکمائے اسلام، سائنس دانوں اور فلاسفروں کے بے مثال علمی کارناموں کا بیان۔ قیمت جلد اول مجلد [illegible]

قیمت جلد دوم مجلد [illegible]

مکمل سیٹ مجلد [illegible]

مسلمانوں کا عروج اور زوال

جدید ایڈیشن (اپنے موضوع پر ایک اچھوتی کتاب) جس میں خلافت راشدہ کے دور سے لے کر ہندوستان کے عہدِ حکمرانی تک مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب کا محققانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔

قیمت چار روپے۔ مجلد پانچ روپے۔

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

شیخ محدث کے کمالات وفضائل کا صاف وشفاف نقش اور اس دور کی بصیرت افروز تاریخ۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

منیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

Registered No. D. 183

ندوۃ المصنفین کی ممبرشپ

۱- لائف ممبر کم سے کم ایک ہزار روپے یک مشت مرحمت فرمانے والے اصحاب اس حلقے میں شامل کئے جاتے ہیں، ایسے اربابِ ذوق کی خدمت میں بُرہان اور مکتبہ بُرہان اور ادارے کی تمام مطبوعات پیش کی جاتی ہیں، کتابوں کی جلد پر لائف ممبر کا نام نامی سنہری حرفوں سے ثبت کیا جاتا ہے۔

۲- معاونین خاص کم سے کم سو روپے سالانہ مرحمت فرمانے والے اصحاب حلقۂ معاونینِ خاص میں داخل کئے جاتے ہیں اور ان کی یہ اعانت عطیۂ خالص کے طور پر قبول کی جاتی ہے، ان حضرات کی خدمت میں بھی سال کی تمام مطبوعات اور بُرہان بغیر کسی معاوضے کے پیش کیا جاتا ہے۔

۳- معاونین اس حلقے کی سالانہ فیس تیس روپے ہے، معاونین کی خدمت میں سال بھر کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور بُرہان کسی مزید معاوضے کے بغیر پیش کئے جاتے ہیں۔

۴- معاونینِ عام معاونینِ عام کی سالانہ فیس بیس روپے ہے، ان کو سال کی تمام غیر مجلد مطبوعات دی جاتی ہیں اور بُرہان بلا قیمت دیا جاتا ہے۔

۵- احبّاء حلقۂ احبّاء کی سالانہ فیس دس روپے ہے، ان کی خدمت میں بُرہان بلا قیمت پیش کیا جاتا ہے اور ان کی طلب پر ایک فیس کے بدلے میں ایک سال کی غیر مجلد مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جاتی ہیں۔

قواعدِ رسالہ بُرہان

(۱) بُرہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں بُرہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ دوسرے ملکوں سے گیارہ شلنگ (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر آنے۔

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے الجمعیۃ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان دہلی سے شائع کیا۔